شرح ارمغان حجاز

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور

Shafi Yusuf Salim

شرح ارمغانِ حجاز

Sharh Armaghan-e Hejaz

حصۂ فارسی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور

باردوم ایک ہزار
قیمت چار روپیہ للعہ

انتساب

میں اِس کتاب کو دلی مسرت کے ساتھ اپنے محترم دوست
ممتاز حسن صاحب احسن ایم ۔ اے جائنٹ سیکرٹری محکمہ
فنانس حکومت مرکزی پاکستان کے نام پر معنون کرتا ہوں
جن کی اقبال فہمی کا میں مدتوں سے معترف ہوں ۔ ایسے شخص
کے لئے ارمغانِ حجاز سے بڑھ کر اور کیا ارمغان ہو سکتا ہے

دعاگو

(سلیم چشتی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

وجہ تسمیہ ایک مدت سے علامہ مرحوم کی آرزو تھی کہ اس سرزمین کی زیارت کریں جس کے ذرّہ ذرہ سے انہیں والہانہ شیفتگی تھی یہی وجہ ہے کہ اس کا تذکرہ انہوں نے اپنی ہر تصنیف میں کیا ہے۔ مثلاً اپنی وفات سے بہت عرصہ پہلے انہوں نے یہ آرزو ظاہر کی تھی :۔

ہست شان رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

اور مدینۃ النبیؐ کی جو قدر و قیمت اِن کی نگاہ میں تھی اِس کا اندازہ اِس شعر سے ہو سکتا ہے۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

جوں جوں ان کی وفات کے دن قریب آتے گئے، تیوں تیوں ان کی آتش شوق تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں وہ تعلق پیدا ہو گیا جسے عرف عام میں "عشق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذیل کے دو شعروں سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے :۔

گرد تو گردد حریم کائنات از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی کشتی و دریا و طوفانم توئی

۱۹۳۶ء میں جب وہ ضربِ کلیم کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اُنہوں نے اِس اُمید پر کہ انشاء اللہ صحتیاب ہو کر ضرور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوں گا، اپنی پوری توجہ اِس امر پر مبذول کر دی کہ جب اللہ اور اُس کے محبوب (روحی لہٗ الفداء) کے دربار میں حاضر ہوں گا، تو کیا ہدیہ (ارمغان) پیش کروں گا اور جب وہاں سے واپس آؤں گا۔ تو عامتہ المسلمین عامتہ الناس اور اپنے ہم مشربوں کیلئے کیا سوغات لاؤں گا۔ اگر ناظرین اس نکتہ کو مدِنظر رکھیں تو اِس کتاب کا ابواب کی ترتیب بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

اگرچہ اقبال کے لئے گنبدِ خضراء کی زیارت مقدر نہ تھی، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ خالقِ کائنات اور باعثِ کائنات یعنی سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس مردِ بے نوا کی یہ نذر ضرور قبول فرمالی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ بھی رؤف الرحیم ہے اور حضور بھی رؤف الرحیم ہیں یہ کتاب ۱۹۳۷ء کے آخر میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اقبال کی وفات سے چھ ماہ کے بعد نومبر ۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کتاب میں اقبال نے کیا لکھا ہے تو اُس کے لئے یہ رباعی کافی ہے:-

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکانِ اُمت تُرا باشوخئ رندانہ گفتم

میں نے اس کتاب کو بارہا پڑھا اور کوئی دشواری محسوس نہ کی، لیکن جب شرح لکھنے کیلئے قلم اُٹھایا تو یہ کتاب لوہے کے چنوں میں تبدیل ہوگئی، راقم الحروف صاف لفظوں میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہے، جو کچھ لکھا ہے محض سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس فیضان کی بدولت لکھا ہے جو گنبدِ خضراء سے نکلکر سارے عالم کو مستفید کر رہا ہے اور حضور صلعم ہی کی نگاہِ کرم کی بدولت یہ ناچیز شرح عام شائقین اور طلبہ کے حق میں مفید ثابت ہو سکے گی۔ (آمین یارب العالمین)

مُقدّمۃُ الکتاب

فصل اوّل

ارمغانِ حجاز کی خُصوصیّات

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ کتاب علامۂ مرحوم کی وفات کے بعد شائع ہوئی اس میں ان کے چالیس سالہ (۱۸۹۷ء تا ۱۹۳۷ء) افکار کا خلاصہ موجود ہے۔ جن باتوں کو انہوں نے مختلف تصانیف میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا عطر اس آخری کتاب میں کھینچ دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کتاب میں خدا، رسولؐ، خودی، موازنۂ عقل و دل، جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر، صدق و یقین، مکان و لامکان فوق البشر، ملوکیت، خلافت، دخترانِ ملّت، تعلیم، موت و حیات، فقر وغیرہ ان تمام عنوانات پر اپنے خیالات نہایت بلیغ انداز میں پیش کئے ہیں۔ اسی لئے میرا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی شخص صرف اسی ایک کتاب کو سمجھ کر پڑھ لے تو مرحوم کے تمام بنیادی افکار سے آگاہ ہو جائے گا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب دو زبانوں میں ہے، اس کا پہلا حصّہ فارسی میں ہے، دوسرا اردو میں اور فارسی حصّہ تمامتر رباعیات پر مشتمل ہے اس میں کوئی نظم یا غزل نہیں ہے۔ یہاں اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ اہل عجم کی اصطلاح میں ان رباعیات کو قطعات کہنا مناسب ہے کیونکہ ان کے نزدیک رباعی

رباعی کا وزن مخصوص ہے یعنی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ ۔لیکن میں نے عرفِ عام کا اتباع کرکے ان کو رباعیات سے موسوم کر دیا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ ان رباعیات کی زبان چنداں مشکل نہیں ہے یعنی پڑھتے وقت لُغت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جو خیالات ان میں نظم کئے گئے ہیں وہ بہت دقیق ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ معمولی لیاقت کا آدمی یا وہ شخص جو اقبال کے بنیادی تصورات سے آگاہ نہیں ہے، بہت سی رباعیات کا مطلب نہیں سمجھ سکتا ۔

دشواری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعری کی تمام اصناف میں بذاتِ خود رباعی سب سے زیادہ مشکل چیز ہے ۔اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر مجبور ہے کہ صرف چار مصرعوں میں اپنا مطلب ادا کر دے ۔لہٰذا بلاغت اور ایجاز کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے ۔اور ہر شخص جانتا ہے کہ کلام بلیغ کا سمجھنا ہر پڑھنے والے کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لئے علمِ معانی کا جاننا اشد ضروری ہے اور یہ علم کالجوں میں پڑھایا نہیں جاتا۔اگر ناظرین ان رباعیات کو غور سے پڑھیں گے تو وہ مجھ سے متفق ہو جائیں گے کہ اقبال نے ہر رباعی میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے یہ حصہ از اوّل تا آخر رمز و کنایہ کے رنگ میں لکھا ہے یعنی ظاہری الفاظ کچھ ہیں ۔باطنی مفہوم کچھ اور ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ اندازِ اقبال کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے ، لیکن ارمغان میں رمزیہ شاعری اپنے کمال کو پہنچ گئی ۔یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کو اس کتاب کی خصوصیات میں شمار کیا ہے ۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تصوف کا رنگ اس قدر نمایاں

ہے کہ بعض مقامات پر ابنِ عربیؒ، مرشد رومیؒ اور عارف جامیؒ کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ اقبال نے اس کتاب میں از اوّل تا آخر صوفیانہ خیالات، فلسفیانہ انداز میں نظم کئے ہیں۔ یعنی اِس جگہ تصوف اور فلسفہ ہم دوش نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان رباعیات میں تغزل بہت کم ہے اور صنائع و بدائع لفظی کا عنصر جو پیامِ مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبریل اور بانگِ درا میں بدرجۂ نمایاں ہے۔ اس کتاب میں کہیں نظر نہیں آتا۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ "حدیثِ عشق بے باکانہ" بیان کی ہے یعنی سابقہ تصانیف میں مسئلہ وحدت الوجود پر جس قدر پردے ڈال دیئے تھے وہ سب ہٹا دیئے ہیں اور صاف لفظوں میں "لاموجود الا اللہ" کا اقرار و اعلان کیا ہے اور یہ بات بالکل برمحل ہے، کیونکہ فکرِ انسانی کی انتہا یہی ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ وہی اقبال جو بانگِ درا میں یہ کہتے ہیں ؎

ہاں، آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

ارمغانِ حجاز میں وہ صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں:-

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش
ز "لاموجود الا اللہ" دریاب

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ عشق صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اگرچہ پیامِ مشرق میں بھی جو ۱۹۲۴ء

ہیں شائع ہوئی تھی، حضور اقدس صلعم سے اُن کی محبت کا یہ عالم ہے کہ ؎

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من

لیکن ارمغانِ حجاز میں تو یہ شراب سہ آتشہ ہوگئی ہے۔ دو شعر درج کرتا ہوں:۔

تو فرمودی، رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

جز ایں چیزے نمیدانم ز جبریلؑ
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

یہ اسی عشق رسولؐ کا نتیجہ ہے کہ ارمغانِ حجاز میں اوّل سے آخر تک کیف و مستی کا ایسا رنگ نظر آتا ہے۔ کہ ہر صاحب دل پر بیخودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ تیسری رباعی میں اقبال نے عمرو ابن کلثوم کے مشہور قصیدہ کے ایک شعر کو اپنے مطلب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اس کے علاوہ اقبال کی تصانیف میں، عربی زبان کا اور کوئی شعر منقول نہیں ہے۔

نویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اُنھوں نے اپنے دوستوں اور مداحوں کی کوتاہ نظری کا شکوہ کیا ہے۔ مثلاً ع مرا یاراں غزل خوانے شمردند

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں بعض سلاطین سے براہ راست خطاب کیا ہے۔ اور انہیں عشقِ رسولؐ کی تلقین کی ہے۔

فصل دوم

ارمغانِ حجاز (حصّہ فارسی) پر تبصرہ

اِس کتاب کے پہلے حصّہ میں پانچ ابواب ہیں۔

پہلے باب میں اقبال نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی معروضات پیش کی ہیں، کہیں دُعائیں اور التجائیں ہیں، کہیں شکوہ و شکایت ہے اور اس میں کہیں شاعرانہ شوخی ہے۔ کہیں عاجزی ہے۔ کسی رباعی میں انسانی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور کسی میں خود داری کا رنگ جھلکتا ہے۔ بعض رباعیات میں قوم کی بےحسی کا اظہار کیا ہے۔ اور بعض میں اپنے کلام کی مقبولیت کے لئے دُعا کی ہے۔ ایک رباعی میں اپنے فرزند جاوید (سلمہٗ) کے لئے دُعا کی ہے اور اس سے اُس محبت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو مرحوم کو اپنے فرزند کے ساتھ تھی کسی جگہ ابنائے زمانہ کی نااہلیت کا قصّہ بیان کیا ہے اور کسی جگہ یہ التجا کی ہے کہ مجھے حیاتِ جاودانی عطا کر دے۔ آخری حصّہ میں دو رباعیاں ہیں، پہلی میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی ہے کہ اے خدا! سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں، مجھ سے میرے اعمال کا حساب مت لیجیو۔ اقبال نے اسی مضمون کی ایک رباعی اور بھی لکھی تھی، جو اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے کیونکہ وہ انہوں نے ایک صاحب کو بخش دی تھی۔ وہ رباعی یہ ہے:-

تو غنی از دو عالم من فقیر	روزِ محشر عذرہائے من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر	از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

دوسرے باب میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس پر مفصل تبصرہ آئندہ اوراق میں پیش کیا جائیگا

تیسرے باب میں ملتِ اسلامیہ سے خطاب کیا ہے اور اس سلسلے میں اقبال نے اپنے تمام بنیادی افکار کا خلاصہ بیان کر دیا ہے اس کی تفصیل فہرست مضامین سے معلوم ہو سکتی ہے۔

چوتھے باب میں بنی آدم سے خطاب کیا ہے اور ان مباحث پر اظہارِ خیالات کیا ہے جو ساری قوموں کے لئے یکساں مفید ہو سکتے ہیں۔

پانچویں باب میں اپنے ہم مشرب اور ہمسفر لوگوں سے خطاب کیا ہے اور انہیں پردہ پردہ میں مسلکِ عشق کے رموز سے آگاہ کیا ہے۔

(۲) ان رباعیات میں اقبال نے حسبِ ذیل بزرگوں کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی ہے :-

حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروقِ اعظمؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، امام حسینؓ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ۔

(۳) ان رباعیات میں اُنہوں نے اُن اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اُنہوں نے استفادہ بھی کیا ہے۔ مثلاً حکیم سنائیؒ۔ عارف جامیؒ۔ مرشد رومیؒ شیخ عطارؒ اور امیر خسروؒ۔

(۴) رباعی جیسا کہ اربابِ علم جانتے ہیں اصنافِ شاعری میں سب سے زیادہ مشکل صنف ہے۔ اور اس میں چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ شاعر پہلے تین مصرعے اسی مصرعہ کی خاطر کہتا ہے اور عموماً اپنا مطلب اسی مصرعہ میں واضح کرتا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر ان رباعیات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر وبیشتر رباعیات کا چوتھا مصرعہ قیامت

کا ہے۔ مثلاً صرف دو رباعیاں درج کرتا ہوں :۔

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
و لیکن الاماں از عصرِ حاضر کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

تو می گوئی کہ دل از خاک و خون است گرفتارِ طلسمِ کاف و نون است
دل ما گرچہ اندر سینۂ ماست و لیکن از جہانِ ما برون است

(۵) چونکہ رباعی کا میدان نظم یا غزل یا قطعہ کے مقابلہ میں بہت تنگ ہوتا ہے اس لیئے شاعر مجبور ہے۔ کہ بلاغت اور ایجاز سے کام لے تاکہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطالب ادا کر سکے۔ نقادانِ فن کی نظر میں رباعی کا کمال اسی شانِ بلاغت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف دو رباعیاں پیش کرتا ہوں :۔

حضورِ ملّت بیضا تپیدم نوائے دلگدازے آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گوے تپیدم، آفریدم، آرمیدم

خودی روشن ز نورِ کبریائی است رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش وصالش از مقاماتِ جدائی است

(۶) چونکہ یہ کتاب مرحوم نے اس زمانہ میں لکھی تھی، جب اُنہیں اپنی وفات کا یقین ہو گیا تھا۔ جیسا کہ اس شعر سے ثابت ہے :۔

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اِس لئے اُنہوں نے اپنا مقام اور اپنا کارنامہ، دونوں باتیں واضح کردی ہیں۔

تاکہ آئندہ نسلوں کو ان امور کی تحقیق کے لئے دوسروں کا دست نگر ہونا نہ پڑے
ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ خود اقبال اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے
چند رباعیات ذیل میں درج کرتا ہوں :-

طلسم عصر حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم — بنارِ او چہ بے پروا نشستم

پر یام در فضائے دلنشینش — پرم نم گشت از ابر مطیرش
حرم تا در ضمیر من فرو رفت — سرودم آنچہ بود اندر ضمیرش

(۷) ایک رباعی میں انہوں نے اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ میں مثل رومی ہوں

چو رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصر رواں من

(۸) بعض رباعیات میں زبردست قسم کی طنز کے نمونے ملتے ہیں اور جیسا کہ ارباب نظر جانتے ہیں۔ یہ رنگ ان کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے طنز کا مقصد ہے اثر آفرینی لیکن اگر الفاظ کے انتخاب میں احتیاط ملحوظ نہ رکھی جائے تو کلام میں رکاکت اور ابتذال کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ شاعر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اقبال کو چونکہ شاعری پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اور طبیعت میں ظرافت کا مادہ بھی موجود تھا۔ اس لئے وہ اس رنگ کو کامیابی کے ساتھ نباہ سکے۔ مثلاً دو رباعیاں درج کرتا ہوں :-

مریدے فاقہ مستے گفت با شیخ — کہ یزداں را ز حال ما خبر نیست
بما نزدیک تر از شہ رگ ماست — ولیکن از شکم نزدیک تر نیست

فرنگ آئین رزاقی بداند | بایں بخشد از و وامی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند | کہ یزداں اندراں حیراں بماند

(۹) اس مجموعہ میں بعض رباعیات ندرتِ افکار اور طرفگیٔ ادا کی بناء پر اسقدر وجد آور اور کیف آفریں ہیں کہ ناطقہ سربگریباں ہو جاتا ہے۔ مثالاً صرف دو رباعیاں درج کرتا ہوں:۔

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک | کہ در خود فاش بیند رمز لولاک
خدا اندر قیاسِ ما نگنجد | شناس آں را کہ گوید ما عرفناک

محبت از نگاہش پائدار است | سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن | جہانِ شوق را پروردگار است

(۱۰) بعض رباعیات میں اقبال نے ایسے دلپذیر حقائق و معارف بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والا خواہ کسی مذہب یا ملت سے تعلق رکھتا ہو، یقیناً ان سے مستفید ہو سکتا ہے۔ مثالاً تین رباعیاں درج کرتا ہوں:۔

اگر دانا دل و صافی ضمیر است | فقیرے با تہی دستی امیر است
بہ روشن منعمِ بے دین و دانش | قبائے نیست پالانِ حریر است

نگاہے آفریں جاں در بدن ہیں | بشاخاں نادمیدہ یاسمن ہیں
وگرنہ مثلِ تیرے در کمانے | ہدف را بانگاہ تیر زن ہیں

اگر خاک تو از جاں محرمے نیست | بشاخ تو ہم از نیساں نمے نیست
زغم آزاد شو، دم را نگہ دار | کہ اندر سینۂ پردم غمے نیست

(۱۱) وطن دوستی کا جو رنگ بانگ درا کی بعض نظموں میں نظر آتا ہے۔ وہی رنگ ارمغانِ حجاز کی بعض رباعیات میں جھلکتا ہے۔ جو لوگ اقبال کو "فرقہ پرست" شاعر کہتے ہیں۔ یہ رباعی اُن کے دعویٰ کی تردید کے لئے کافی ہے:۔

جہان مہر و مہ زناری اوست   کشاد ہر گرہ از زاری اوست
بیا مے دہ زمین ہندوستاں را   غلام آزاد از بیداری اوست

(۱۲) اقبال کو فرنگی اور فرنگیت سے جس قدر نفرت تھی، اس کا اندازہ اس رباعی سے ہوسکتا ہے:۔

سجودے آوری دارا و جم را   مکن اے بے خبر رسوا حرم را
مبر پیش فرنگی حاجت خویش   ز طاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

با فرنگی بتاں خود را سپردی   چہ نامردانہ در بتخانہ مردی
خرد بیگانۂ دل سینہ بے سوز   کہ از تاک بنا گاں مے نخوردی

فصل سوم

واضح ہو کہ میں نے اس شرح میں کسی رباعی کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے کیونکہ محض ترجمہ سے کسی رباعی کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مثال کے طور پر ان رباعیات پر غور کیجئے :-

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز
دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را
قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

اس رباعی کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا :-

قرآن سے اپنے سامنے آئینہ لٹکا لے۔ تو بدل گیا ہے۔ اپنے آپ سے بھاگ جا۔ اپنے اعمال کے لئے ترازو قائم کر۔ سابقہ قیامتوں کو دوبارہ برپا کر لے۔

خودی روشن ز نورِ کبریائی است
رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش
وصالش از مقاماتِ جدائی است

اس رباعی کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا :-

خودی، کبریا کے نور سے روشن ہے۔ اس کی رسائی، اس کی نارسائی کی بدولت ہے۔ جدائی، اس کے وصال کے مقامات سے ہے (اور) اس کا وصال جدائی کے مقامات سے ہے۔

اب عام شائقین اور طلبہ خود فیصلہ کریں کہ اس ترجمہ سے انہیں کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے؟ بلکہ اس قسم کا ترجمہ تو منشی فاضل کے طلبہ تو خود بھی کر سکتے ہیں اس لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پہلے ہر رباعی کے مشکل الفاظ اور مصطلحات علمیہ کی تشریح کی ہے۔ اس کے بعد ہر رباعی کا مفہوم، اقبال کے

زاویۂ نگاہ سے واضح کیا ہے۔ آخر میں ہر رباعی کا بنیادی تصور دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

اس مجموعہ میں پچاس رباعیات بہت زیادہ مشکل ہیں۔ میں نے انہی کی تشریح میں وضاحت سے کام لیا ہے۔ اور ناظرین کی آگاہی کے لئے ان رباعیات کی شرح سے پہلے اس حقیقت کی صراحت بھی کر دی ہے۔ تاکہ وہ ان پر خاص توجہ مبذول کر سکیں، یہ بھی مدّنظر رہے کہ ان رباعیات میں اقبال نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ انہوں نے ہر باب میں جس رباعی کو پہلے رکھا ہے وہ باعتبار مضمون اسی لائق ہے۔ کہ اُسے مقدم کیا جائے اور تقدیم و تاخیر کا یہ سلسلہ ہر باب میں موجود ہے میں نے اختصار کی بنا پر صرف "حضور رسالتؐ" کی تشریح میں اس ربط کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیگر ابواب کی رباعیات کے ربط کو ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں۔

ایک بات اور بھی وضاحت طلب ہے، وہ یہ کہ اکثر و بیشتر رباعیات کا مفہوم سمجھنا "ش" کا مرجع متعین کرنے پر موقوف ہے۔ مثلاً

دل ما آتش و تن موج دودش
تپید دمبدم ساز وجودش
بذکرِ نیم شب جمعیّت او
چو سیمابے کہ بنار دیوب عودش

اس رباعی کا مطلب اس وقت سمجھ میں آ سکتا ہے جب "عودش" کے ش کا صحیح مرجع متعین ہو جائے۔

فصل چہارم

عقیدۂ وحدۃ الوجود کی تشریح

تمہید اس میں شک نہیں ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں وحدۃ الوجود کے قائل ہو گئے تھے۔ اور ایسا ہونا کوئی خلاف توقع یا حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ ہر وہ فلسفی جو کسی نہ کسی رنگ میں خدا کو مانتا ہے۔ انجام کار "وجودی" ہو جاتا ہے۔ اس اجمال کی تشریح اپنی کتاب اقبال اور تصوف میں پیش کروں گا۔

اقبال کا میلان طبع شروع ہی سے تصوف کی طرف تھا چنانچہ ارمغان میں ایک جگہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے ؎

مجو از من کلامِ عارفانہ!
کہ من دارم سرشت عاشقانہ

اور ارباب علم جانتے ہیں کہ "سرشت" کبھی نہیں بدل سکتی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ غور و فکر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ پختہ تر ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ جب اقبال نے ۱۹۰۷ء میں دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے اسی اقبال نے ۱۹۳۷ء میں صاف لفظوں میں اعلان کردیا

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش — ز لاموجود الا اللہ دریاب
بیا بر خویش پیچیدن بیاموز — بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

چونکہ اس مجموعہ میں اقبال نے سترہ رباعیات میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مسئلہ کی کیفیت آسان لفظوں میں بیان کردوں تاکہ طلبہ اور شائقین کو ان تمام رباعیات کے سمجھنے میں کچھ سہولت میسر آجائے، جن میں اقبال نے اس مسئلہ کے کسی پہلو کو نظم کیا ہے۔

واضح ہو کہ ۱۹۳۱ء میں اقبال نے مجھ سے کہا تھا کہ "وحدۃ الوجود کی حقیقت کو سمجھنا بہت مشکل ہے"۔ یہ بات بلاشبہ درست ہے۔ اس لئے میں نہ اس بات کا مدعی ہوں کہ میں اس مسئلہ کو کماحقہٗ سمجھتا ہوں اور نہ اس کا کہ دوسروں کو سمجھا سکتا ہوں۔ جو کچھ لکھتا ہے وہ ایک حقیر سی کوشش ہے ناظرین کو اس مسئلہ سے روشناس کرنے کی تمنا ہے۔ تاکہ اُن کے اندر مزید تحقیق کا جذبہ پیدا ہوجائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) جو لوگ اس عالم (کائنات) کو حادث مانتے ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ عالم اولاً معدوم محض تھا پھر جب حق تعالیٰ نے اسے پیدا کرنا چاہا تو اس کی ایجاد سے موجود ہوا یعنی کائنات کا وجود "خانہ زاد"[1] نہیں ہے۔

(۲) لیکن ان لوگوں میں اختلاف اس بات پر ہوا کہ اس عالم کی، وجود کے ساتھ متصف ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یعنی یہ عالم موجود تو ہوگیا۔ لیکن کیسے موجود ہوا؟ کیونکر موجود ہوا؟ کس طرح موجود ہوا؟

اس اختلاف کا پہلا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی سرشت کے اعتبار سے ہر شئے کی لِمّ دریافت کرنے پر مجبور ہے، دوسرا یہ کہ خدا تو قدیم ہے اور یہ کائنات حادث ہے تو ناگزیر طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ قدیم اور حادث

---

[1] یہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی مدرسہ دیوبند کی اصطلاح ہے ۱۲

میں ربط کیسے یا کس طرح پیدا ہوسکا؟

(۳) اس کیفیت کے باب میں چار مذاہب ہیں۔

(ا) پہلا مذہب علمائے ظاہر یا متکلمین اسلام کا۔

(ب) دوسرا مذہب اکثر حکمائے اسلام کا۔

(ج) تیسرا مذہب اُن صوفیہ کا جن کے سرگروہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ہیں

(د) چوتھا مذہب اُن صوفیہ کا جن کے سرتاج حضرت مجدد الف ثانی ہیں۔

(۴) ان چاروں مذاہب کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ایک مثال کی چار کیفیات لکھتا ہوں" اکہ اُن مذاہب کی تفصیل سمجھنے میں آسانی ہوجائے:۔

اگر آپ کسی شیشہ کو آفتاب کے مقابل رکھیں تو اس میں چار کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں۔

(ا) وہ شیشہ حرارتِ آفتاب سے گرم ہوجاتا ہے اور یہ حرارت اگرچہ اپنے وجود کے لئے حرارتِ آفتاب کی محتاج ہے، لیکن حرارتِ آفتاب سے جدا گانہ ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر اس شیشہ کو آفتاب کے مقابل سے ہٹا لیا جائے تو بھی وہ گرم رہتا ہے (اگرچہ یہ سچ ہے کہ وہ حرارت چند منٹ کے بعد زائل ہوجاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حرارت شیشہ کی ذاتی نہیں ہے)۔

(ب) وہ شیشہ نورِ آفتاب سے منور ہوجاتا ہے یعنی چمکنے لگتا ہے۔ لیکن یہ نور، جس سے وہ شیشہ متصف ہوا ہے۔ نورِ آفتاب سے جدا نہیں ہے چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر اس شیشہ کو آفتاب کے مقابل سے ہٹا لیا جائے تو وہ منور نہیں رہتا۔

(ج) قرصِ آفتاب اس شیشہ کے اندر منعکس نظر آتا ہے۔ اور علم المرایا

OPTICS کی مدد سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جو کچھ اس میں نظر آتا ہے وہ نہ عین آفتاب ہے اور نہ اس کی مثال ہے بلکہ محض وہم و خیال ہے یعنی بظاہر اس شیشہ میں آفتاب نظر آتا ہے لیکن دراصل وہاں کچھ نہیں ہے آپ کی نظر فی الحقیقت آفتاب کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن آپ نادانی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آفتاب اس شیشہ میں منعکس ہے چونکہ دنیا میں بہت کم لوگ علم المناظر والمرایا سے واقف ہیں، اس لیئے یہ غلط فہمی عام ہوگئی حقیقت یہی ہے کہ آئینہ یا شیشہ میں کچھ نہیں ہے۔ آپ کی نگاہ آئینہ کی سطح سے منعکس ہوکر آفتاب کو دیکھتی ہے لیکن آپ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں۔ کہ آفتاب آئینہ میں نظر آرہا ہے خلاصہ کلام یہ کہ آئینہ میں آفتاب کا وجود وہمی ہے، یعنی محض آپ کے وہم کی پیداوار ہے۔

(د) اس شیشہ کا سایہ یا ظل زمین پر پڑتا ہے اور اس ظل کا وجود نہ تو حرارت کے درجہ میں واقعی ہے اور نہ شیشہ میں قرص آفتاب کے عکس کے درجہ میں غیر واقعی (وہمی یا خیالی) ہے، بلکہ دونوں کے بین بین ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ:

(ا) اگر شیشہ کو آفتاب کے مقابل سے ہٹا لیا جائے تو بھی وہ حرارت جو شیشہ میں ہے موجود رہتی ہے لیکن اس صورت میں ظل موجود نہیں رہتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ حرارت کے درجہ میں واقعی نہیں ہے۔

(ب) لیکن اگر شیشہ کو آفتاب کے مقابل رکھیں تو اس کا ظل فریب نظر یا وہم نہیں ہے۔ بلکہ واقعی موجود ہوتا ہے جس کا کوئی ہوشمند انکار نہیں کرسکتا اس لیئے ثابت ہوا کہ وہ عکس قرص آفتاب در شیشہ کے مقابلہ میں واقعی ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ ظل کا وجود اگرچہ ذاتی نہیں ہے لیکن محسوس ضرور ہوتا ہے یعنی وہمی بھی نہیں۔ اب ان چاروں کیفیات کا خلاصہ درج کرتا ہوں:-

(ا) پہلی کیفیت میں شیشہ کی حرارت، سورج کی حرارت سے جُدا ہے یعنی شیشہ کی وہ صفت ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے اِسے منطقی اصطلاح میں صفت منضمہ کہتے ہیں۔

(ب) دوسری کیفیت میں شیشہ کی چمک (نور) آفتاب کی چمک یا اس کے نور کی عین ہے شیشہ سے اس کا کوئی رابطہ پیدا نہیں ہوا، یعنی جس طرح گرمی شیشہ کی صفت بن گئی یہ نور اس کی صفت منضمہ نہیں بنا۔

(ج) تیسری کیفیت میں اُس عکس کو جو آئینہ میں نظر آتا ہے۔ خیال یا وہم کہیں گے اور اس کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد ایک اعتبار سے اُسے معدوم اور دوسرے اعتبار سے عین الشمس بھی کہہ سکتے ہیں۔

(د) چوتھی کیفیت میں سایہ یا ظل کو آفتاب کی مثال کہہ سکتے ہیں۔

شیشہ کی اس مثال کو اور اس کی چاروں کیفیات کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کیونکہ مسئلہ کے سمجھنے میں اِس سے بہت مدد ملے گی۔ اب میں نفسِ مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

(ا) علمائے ظاہر یعنی متکلمین یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنی مرضی سے معدومات کو وجود کے ساتھ متصف کر دیا یعنی نیستی سے ہستی کر دی اور اس طرح یہ عالم وجود میں آگیا۔ اگرچہ یہ عالم اپنے وجود کے لئے اللہ کا محتاج ہے لیکن اس کا وجود حقیقی اور مستقل ہے یعنی خدا بھی موجود ہے اور عالم بھی موجود ہے۔

بہ الفاظِ دگر۔

(۱) کائنات کا وجود حقیقی (واقعی) ہے۔ عقلی یا وہمی یا ظلّی نہیں ہے۔

(۲) یہ وجود حق تعالےٰ کا محتاج ہے۔ از خود موجود نہیں ہُوا۔

(۳) کائنات کا وجود، حق تعالیٰ سے جدا ہے اور دونوں بیک وقت موجود ہیں۔

اس کو سمجھنے کے لئے شیشہ کی مثال کی پہلی کیفیت سے مدد مل سکتی ہے شیشہ میں جو حرارت پیدا ہو جاتی ہے وہ اگرچہ حرارتِ آفتاب کی محتاج ہے لیکن وہ اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور حرارتِ آفتاب سے جُدا ہے بس ممکنات کا اتصاف وجود کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا حرارت کا اتصاف شیشہ کے ساتھ۔

(ج) حکمائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے ماہیاتِ ممکنہ کو موجود کرنا چاہا تو اُن کو اپنے وجود کے ساتھ ایک خاص قسم کی نسبت عطا کردی، جس کی کُنہ (تفصیل یا نوعیت) نہ تو ہمیں معلوم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

ع راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

بالفاظِ دگر حق تعالیٰ نے ان ماہیاتِ ممکنہ کو کوئی جداگانہ وجود عطا نہیں کیا خلاصۂ کلام ایں کہ، اس نسبتِ مجہولہ کی بدولت، وہ ماہیاتِ ممکنہ وجود سے متصف ہو گئی ہیں۔ (کسی شئی کو قبلِ وجود ماہیتہ کہتے ہیں) لہٰذا وجود حقیقت (یعنی کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ عقلی ہے اور ممکناتِ عالم کا اتصاف وجود کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے شبنم کا اتصاف نورِ آفتاب کے ساتھ۔

اربابِ عقل کے بعد اب اصحابِ کشف آتے ہیں۔ اور ان کا قول یہ ہے کہ حقیقی معنی میں "وجود" صرف حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہے یعنی حقیقت کے اعتبار سے صرف حق تعالیٰ ہی موجود ہے، اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے کیونکہ اگر دوسرا بھی موجود مانا جائے تو شرک فی الوجود لازم آجائے گا۔

بیشک ہم ممکنات کو بھی موجود کہتے ہیں لیکن نہ بایں معنی کہ وجود، ان ممکنات کی صفت ہے بلکہ بایں معنی کہ ان ممکنات کو "وجود" سے ایک قسم کا رابطہ حاصل ہو گیا ہے جس کی کنہ معلوم نہیں ہے:۔

نوٹ: حکماء کہتے ہیں کہ "نسبت" کی کنہ (نوعیت یا حقیقت) معلوم نہیں ہے

صوفیا کہتے ہیں کہ "رابطہ" کی کنہ معلوم نہیں ہے۔ غور سے دیکھو تو یہ دونوں گروہ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں یعنی عقلِ انسانی حقیقتِ کائنات کا علم حاصل نہیں کر سکتی۔

ع کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

خلاصہ کلام ایں کہ نفیِ وجود کی نفی میں تمام دُنیا کے صوفیاء متفق ہیں اسی کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ اس کے بعد دو مذہب ہو گئے۔

(ج) شیخ اکبر یعنی ابن عربیؒ کا مذہب یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے موجودِ حقیقی صرف ایک ذات تھی یعنی حق تعالیٰ۔ ذاتِ حق میں دو اعتبار یا مرتبے تھے۔ پہلا اعتبار ذات مع اپنے اسماء و صفات کے دوسرا اعتبار تمام کائنات کا تفصیلی علم جسے فلسفہ تصوف کی اصطلاح میں اعیان ثابتہ کہتے ہیں۔ اور جب اس علم کا ظہور کائنات میں ہوتا ہے۔ تو اس کو اعیان علمیہ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس طرح ذاتِ حق میں دو اعتبارات ہیں اسی طرح علمِ حق میں بھی دو اعتبارات ہیں، مرتبۂ علم میں، علمِ باری تعالیٰ کو اعیان ثابتہ یا موجود عینی کہتے ہیں۔ مرتبہ معلوم میں، اسی علم کو اعیان علمیہ یا موجود علمی سے تعبیر کرتے ہیں۔

فی الجملہ جب حق تعالیٰ نے اس عالم کو عدم محض سے نکالنا چاہا تو اپنے ارادہ سے اُن اعیانِ ثابتہ کو ظاہر وجود پر متجلی یا منعکس فرما دیا۔ اس فعل سے، ظاہر وجود میں ان اعیانِ ثابتہ کے عکوس اس طرح ظاہر ہو گئے کہ نہ تو ان کو خارجی (حقیقی) وجود حاصل ہوا اور نہ اُنہوں نے ظاہر وجود میں حلول کیا بس ایک نوع کا تخیلی وجود حاصل ہو گیا جس کی حقیقت وہم و خیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے:۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(غالبؔ)

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

(میر دردؔ)

عکس افتادہ با آئینہ ہوش
گل تواں گفت ولے چیدن نیست

(بیدلؔ)

القصہ اس گروہ کے نزدیک ممکنات کا اتصاف، وجود کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے آئینہ یا شیشہ کی مثال ہیں قرص آفتاب کا وجود، آئینہ میں یعنی یہ کائنات فی الحقیقت محض وہم وخیال ہے۔ یہ کوئی مستقل خارجی وجود نہیں رکھتی جس طرح شعلۂ جوالا کی بادولت جو دائرہ آتشیں ہمیں نظر آتا ہے اس کا کوئی وجود نہیں ہے اِس طرح ذاتِ حق کے علاوہ اور کوئی شئے موجود نہیں ہے یعنی لَا مَوْجُوْدُ اِلَّا اللّٰہ ط

نوٹ :۔ شیخ اکبرؒ جیسا کہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے حلول یا اتحاد کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ عینیّت کے قائل ہیں۔

حلول کا مطلب یہ ہے کہ خدا، کائنات میں سما گیا ہے۔
اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور کائنات دونوں ایک ہوگئے۔
عینیّت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کائنات ہے اور کائنات خدا ہے۔
(د) چوتھا مذہب حضرت مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا ہے۔

اس باب میں تو وہ بھی شیخ اکبرؒ سے متفق ہیں کہ وجودِ حقیقی صرف واجب تعالیٰ کا ہے۔ عالم کا وجود حقیقی نہیں ہے لیکن انہوں نے وجودِ عالم کی کیفیت میں شیخ اکبرؒ سے اختلاف کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ عالم کی تخلیق سے پہلے موجود حقیقی صرف ایک ذات (حق تعالیٰ) تھی مع اپنے اسماء و صفات کے، ان اسماء کے مقابلہ میں، مرتبہ عدم میں کچھ حقائق اعتباریہ بھی تھے یعنی اسماء صفات کے مقابل وہ مفہومات جو ذات حق میں معدوم ہیں۔

مثلاً علم، ذاتِ حق میں ثابت ہے اس کا مقابل جہل ہے جو ذات کے مقابلہ میں معدوم ہے۔ اسی طرح قدرت ذاتِ حق میں ثابت ہے، اس کا مقابل عجز ہے جو ذاتِ حق کے مقابلہ میں معدوم ہے وقس علیٰ ہذا۔

جب حق تعالیٰ نے اس عالم کو ظاہر کرنا چاہا تو اپنے کمالات کو عدمات پر متجلی فرما دیا۔ اس تجلی سے ان عدمات میں ان کمالات کی صورت منعکس ہوگئی اور اس انعکاس سے ایسے حقائق ظاہر ہو گئے جن کا مادہ تو عدمات ہیں۔ اور صورت یہ عکوس ہیں۔ یہ عکوس (حقائق) نہ تو عین اسماء و صفات ہیں کیونکہ ان کی حقیقت، عدم ہے اور نہ معدومِ محض ہیں۔ کیونکہ عکس میں اسماء و صفات الٰہیہ کا یعنی ان کا وجود نہ تو حقیقی ہے نہ وہمی یا خیالی ہے۔ بلکہ ان دونوں حالتوں کے بین بین ہے یعنی ظلی ہے۔ خلاصہ کلام اینکہ۔

کائنات کا وجود نہ تو حقیقی ہے جیسا کہ متکلمین کہتے ہیں۔

نہ نسبتی یا عقلی ہے جیسا کہ حکماء کا خیال ہے۔

اور نہ وہمی یا خیالی ہے جیسا کہ ابن عربی سمجھتے ہیں۔

بلکہ ظلی ہے جیسا چوتھی مثال میں شیشہ کا عکس یا ظل جو شیشہ کو آفتاب کے مقابل سے ہٹا لینے پر معدوم ہو جاتا ہے۔ لیکن ناظر کے نہ دیکھنے سے معدوم

نہیں ہوتا یعنی ظل کا وجود دیکھنے والے پر موقوف نہیں ہے۔
فی الجملہ حضرت ابن عربیؒ کے نزدیک حقیقت اس عالم کی وہ اسماء وصفات ہیں۔ جو ظاہر وجود پہ متجلی ہوئے اور اس تجلی سے اس عالم کا خیالی یا وہمی وجود پیدا ہوا۔ شیخ موصوف اور ان کے متبعین اس بات کی تعبیر کبھی تو یوں کرتے ہیں کہ یہ عالم معدوم محض ہے اور کبھی یوں کہ یہ عالم عین حق ہے۔ مطلب ان دونوں باتوں کا ایک ہی ہے کہ "لا موجود الا اللہ" یعنی حق تعالےٰ کے سوا اور کسی شئے کا وجود نہیں ہے، یا کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ہستئ فتنہ انگیز است سروقامتت
ہستی ما جز دروغ مصلحت آمیز نیست (بیدل)

حضرت مجدد الف ثانی کے نزدیک حقیقت اس عالم کی وہ عدمات ہیں جن پر اسماء وصفات نے تجلی فرمائی اور اس تجلی سے یہ کائنات ظلی طور پر موجود ہوگئی، اس لئے ان کی رائے میں یہ عالم نہ تو معدوم محض ہے اور نہ عین حق ہے بلکہ ظلی وجود رکھتا ہے۔
خلاصۂ کلام اینکہ عالم کے حقیقی وجود کی دونوں نفی کرتے ہیں لیکن بہرحال یہ عالم محسوس ہوتا ہے، اور اس کے محسوس ہونے کی کیفیت ہی میں دونوں کا اختلاف ہے:-
حضرت شیخ اکبرؒ کہتے ہیں کہ عالم کا وجود ظلی ہے لیکن یہ ظل موہوم ہے۔
حضرت مجدد صاحبؒ بھی کہتے ہیں کہ عالم کا وجود ظلی ہے لیکن یہ ظل موجود ہے
نوٹ:- (۱) اقبال بھی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں لیکن اس کی تعبیر میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متبع ہیں۔
(۲) دراصل ابن عربیؒ اور مجدد الف ثانیؒ صاحبان کے نظریہ میں کوئی بنیادی

بااُصولی اختلاف یا فرق نہیں ہے ۔ میری رائے ناقص میں مجددصاحب نے متکلمین کے اعتراضات سے بچنے کے لئے ، تعبیر میں قدرے تغیر کر کے اعتبار میں دو وجود قائم کر دیئے یعنی ایک حقیقتِ عالم دوسرا حقیقتِ معلوم لیکن اربابِ علم جانتے ہیں کہ علم عالم اور معلوم میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے ہر سہ اعتبارات کا منشاء ذات باری ہے ۔یہی وجہ ہے ۔کہ اقبال نے بعض رباعیات میں اس نظریہ کی وہ تعبیر پیش کر دی ہے جو ان کو ابن عربیؒ کے متبعین میں داخل کر دیتی ہے اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ وہ بیک واسطہ شیخ اکبرؒ کے متبع ہیں یعنی وہ مرشد رومی سے متاثر ہیں اور رومیؒ شیخ موصوف سے متاثر تھے ۔اور راقم الحروف کی رائے میں ایک رومیؒ پر کیا موقوف ہے ساری دنیا کے حکماء شیخ سے متاثر ہوئے ہیں ۶۳۸ھ سے آج تک دوسرا شیخ اکبرؒ تو پیدا نہیں ہوا۔

(۳) اقبال نے ارمغان حصہ فارسی میں ستولہ رباعیات خالص وحدۃ الوجود کے رنگ میں لکھی ہیں ۔اس لئے میں نے اس جگہ اس مسئلہ کو قدرے وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ان رباعیات کا مطالعہ کرتے وقت طلبہ اور شائقین اس تفصیل کی طرف رجوع کر سکیں ۔میں نے اس بحث کو حتی الامکان آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے ۔لیکن بعض مقامات پر فلسفۂ تصوف کی مصطلحات کا استعمال ناگریز تھا ۔اگر طلبا کو دشواری محسوس ہو تو وہ اپنے اساتذہ سے اس بحث کو پڑھ لیں ۔مثال کے طور پر میں نے ایک جگہ "مظاہر وجود" کی اصطلاح استعمال کی ہے ، اس سے مراد مظاہر وجود ہیں یا وجود کی ظاہری شکل جو عالم میں ظاہر ہوئی

(۴) شیخ اکبرؒ لکھتے ہیں کہ "اعیان ثابتہ" کو وجود خارجی کی ہوا بھی نہیں لگی ہے یعنی معلوماتِ حق تعالےٰ کو کبھی خارجی وجود حاصل نہیں ہوتا ۔یہی بات بہ اندازِ دگر مشہور فلسفی بارکلے (BERKLEY) نے کہی ہے لیکن وہ سرِ ظہور میں اُلجھ کر رہ گیا

یعنی یہ تو کہہ دیا کہ نفس مدرک سے باہر کسی شئی کا وجود نہیں ہے لیکن یہ نہ بتا سکا کہ خود نفس مدرک کی حقیقت کیا ہے۔ یہی حال نیٹشے (NIETZSCHE) کا ہوا کہ سب کچھ بتا دیا لیکن یہ نہ بتا سکا کہ قوت محرکہ کیا ہے۔ اگر وہ اس مقام تک پہنچ جاتا تو "مقام کبریا" مل جاتا۔ اسی لئے اقبال نے یہ کہا تھا:۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

شرحِ ارمغانِ حجاز

حصّہ فارسی

پہلا باب

حضورِ حق

رباعی برصدا

تمہید واضح ہو کہ اقبالؔ نے ہر باب کے شروع میں خود ایک رباعی بطور تمہید لکھی ہے، جس میں اُس باب کی تعلیمات یا مقاصد کی روح کھینچ کر رکھ دی ہے چنانچہ جو شخص اس رباعی کا مفہوم سمجھ لے گا۔ وہ اس باب کی مخفی روح یا باطنی مفہوم سے بآسانی آگاہ ہو سکتا ہے۔

حلِ لغات خوش بمعنی خوش نصیب یا کامیاب۔ راہی بمعنی سالک یعنی عاشق۔ سامانے نگیرد یعنی جو اس دُنیا (زن، زر، زمین) کی دلفریبیوں میں سے کسی سے بھی علاقہ یا رابطہ نہ رکھے "سامانے" میں یائے تنکیری اور "نگیرد" اُس "ی" کی تمام صورتوں کی نفی کر رہا ہے۔ کم پذیرد۔ بمعنی نمی پذیرد

من نہ آں رندم کہ ترکِ شاہد و ساغر کنم
مُحتسب داند کہ من ایں کارہا کمتر کنم (حافظؔ)

پندِ یاراں سے دراصل پند مراد نہیں ہے بلکہ دنیاوی زاویۂ نگاہ سے دوستوں کا مشورہ مراد ہے کہ اپنے لئے نہیں تو بیوی بچوں ہی کیلئے تھوڑی سی ضمیر فروشی کرلو آہ سوزناکش۔ ش کا مرجع "راہی" ہے۔ اقبال کے یہاں آہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ آہ جو سوز سے خالی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ عاشق کی روحانی اور اخلاقی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

دوسری وُہ آہ جو سوز سے معمور ہوتی ہے۔ اور اس میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ وہ عاشق کو بھی زندگی عطا کر دیتی ہے اور جو اس عاشق کے پاس بیٹھتا ہے اس میں بھی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ "آہ" ہے جس سے سو سال کی راہ ایک آن میں طے ہو جاتی ہے:-

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

بہ الفاظ دگر، آہ سوزناک کنایہ ہے عشقِ حقیقی سے۔

سینہ بکشا یعنی اپنے اندر اخذِ حقائق کی استعداد پیدا کر۔ اقبال نے یہ ترکیب اس آیت سے اخذ کی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ؟ اے ہمارے برگزیدہ رسولؐ! کیا ہم نے (از راہ لطف و کرم) آپؐ کا سینہ (اخذ حقائق کے لئے) نہیں کھول دیا۔ شرح صدر سے مراد ہے اس استعداد اور قابلیت کا پیدا ہو جانا جو حقائق و معارف کے حصول کے لئے شرط اولین ہے تیسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! کسی عاشق کی صحبت اختیار کر۔ کیوں؟ اس کا جواب چوتھے مصرعہ میں ہے:۔ غمِ صد سالہ: کنایہ ہے اُن مصائب اور پریشانیوں سے، جن میں شاہ جہاں سے لے کر گدائے بے نوا سبھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے سے وہ پریشانیاں بھی دُور ہوجاتی ہیں جن کے ازالہ کی کوشش میں انسان برسوں سر کھپاتا رہتا ہے۔

مطلب کہتے کہ سچا عاشق وہ ہے۔ جو زن، زر اور زمین سے دل نہیں لگاتا اور وہی کامیاب بھی ہوتا ہے۔ اے مخاطب اگر تو دنیا کی پریشانیوں سے نجات کا طالب ہے یا اگر تجھ کو کامیابی کی آرزو ہے تو اللہ والوں کی صحبت اختیار کر کیونکہ وہ تجھے " ذکر الٰہی " سکھا سکتے ہیں اور ذکر الٰہی میں یہ تاثیر ہے کہ اس کی بدولت قلب کو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔ کما قال اللہُ تعالیٰ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب :۔ اے لوگو آگاہ ہوجاؤ کہ تمہارے قلوب صرف ذکر الٰہی سے اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔

تیس سال پہلے بھی اقبال نے یہ بات کہی تھی کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو :۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

لیکن آفرین ہے قوم کے استقلال پر کہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اور اور دن رات " اہل فرنگ " کی صحبت بلکہ غلامی میں مستغرق رہتی ہے۔

بنیادی تصوّر اقبال ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر تم اللہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو تو اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو۔ چراغ چراغ ہی سے جل سکتا ہے اور کوئی صورت نہیں ہے۔

نوٹ :۔ اقبال نے یہ رباعی ۱۹۳۷ء میں کہی تھی۔ اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو بلا تامل اس کو اپنی کتاب سے خارج کر دیتے۔ اُن کو کیا خبر تھی کہ ۱۹۵۲ء

میں ہر مسلمان "سینہ کھولنے کی بجائے "حساب کھولنے" کی آرزو میں گرفتار ہو جائے گا۔

رباعی بر ۳

حلّ لغات بے دلاں:۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) عاشق (۲) مایوس، ناکام و افسردہ:۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

رفتن کا فاعل اس جگہ محذوف ہے۔ جو پہلے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی خاصان" عاماں سے مراد اس دور کے مسلمان ہیں جو دنیا کے پرستار اور ہوس میں گرفتار ہیں، جن میں ایسی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی ہے جو ان کو غیر مسلموں سے متمیز کر سکے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اسی لئے دنیا میں ان کو سربلندی یا عزت حاصل نہیں ہے:۔ خاصاں:۔ عاماں کی ضد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص بندے۔ وہ لوگ جو صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا "الٰہ" یقین کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یا حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ۔

مطلب:۔ اقبال بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں کہ اے خدا تیرے خاص بندے تو وفات ہو گئی، اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں:۔

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

اے خدا اس دورِ جاہلیت کبریٰ میں تو ہم جیسے ناپاک گنہگار سگانِ دنیا ہی باقی رہ گئے ہیں (جو اسلام کا لیبل صرف اسلئے اپنے ساتھ چپکائے ہوئے ہیں کہ علانیہ انکار کرنے کے بعد "ترقی" کے دروازے بند ہو جائیں گے) اسلئے میں با دب

درخواست کرتا ہوں کہ ہم پر بھی ایک نگاہ کرم ہو جائے تو تیری شان بندہ نوازی سے بعید نہیں ہے۔

قصہ یہ ہے کہ شاعر اس وقت عالمِ تصور میں حرم کعبہ کی حدود میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے اس وقت وہ اپنے آپ کو بھی دیکھ رہا ہے اور دوسروں کو بھی جو قابلِ اعتراض ذرائع سے دولت جمع کر کے یہاں آئے ہیں اس مجمع کو دیکھ کر شاعر کے قلب کی گہرائیوں سے یہ التجا زبان پر آتی ہے کہ اے مولا کریم تیرے بندے تو مارت ہوئی دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ اب تو ہم جیسے سگانِ دُنیا ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے "بیا لحظہ با عاملاں در آمیز" اے خدا! اب طواف کرنے والوں میں نہ کوئی معین الدینؒ ہے نہ عبدالقادرؒ ہے نہ امداد اللہؒ ہے اور نہ وارث علیؒ ہے اس لئے میں بادب عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ ہم تیری نگاہ التفات کے لائق نہیں ہیں۔ لیکن تو محض اپنے فضل سے ہم پر ایک نگاہِ کرم فرما۔

بنیادی تصور:۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اس دور میں کوئی "اللہ کا بندہ" نظر نہیں آتا۔ کیا خوب لکھا ہے اکبر الہ آبادی نے :۔

جس سے دل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

پہلی رباعی پڑھئے

حل لغات :۔ سخن ہا رفت :۔ بڑی بحثیں ہوئیں : از بود و نبود م :۔ میرے موجود ہونے یا نہ ہونے سے متعلق : خجالت کا سبب یہ ہے کہ میں نے اسلامی زندگی بسر کی : نہ ناؔ مردان : اقبال کی محبوب اصطلاح ہے۔ قلندر

فقیر، حُر، مومن، نہ نارہ مرد، عاشق، صاحب دل، سب مرادف الفاظ ہیں۔
عیار گرفتن :۔ اندازہ کرنا یا تحقیق کرنا ؛

مطلب :۔ اس رباعی کا پہلا مصرعہ سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ اقبال نے ایک مصرعہ میں پاکستان جنت نشان کے باشندوں کی زندگی پہ تبصرہ کر دیا ہے۔ شرح لکھوں تو ایک رسالہ مرتب ہو جائے اس لئے اختصار کو مدِ نظر رکھ کر لکھتا ہوں کہ جب بارگاہِ ایزدی میں اس مسئلہ پہ گفتگو ہوئی۔ کہ اقبال (قوم) زندہ ہے یا مُردہ ؟ تو میں شرم کی وجہ سے بالکل خاموش رہا۔ آخر الامر جب اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دریافت کیا کہ تو کیا کہتا ہے ؟ کیا تیرے پاس اپنے وجود پہ کوئی دلیل ہے ؟ تو میں نے عرض کی کہ اے مولا کریم ! مسلمان جب زندہ تھے تو وہ تیری راہ میں جہاد کیا کرتے تھے۔ میرے وجود کا ثبوت جہاد سے تو مل نہیں سکتا کیونکہ وہ تو میں ۱۸۵۷ء سے ترک کر چکا ہوں۔ اب اگر میری (میری قوم کی) ہستی کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے تو میرے (بے ذوق) سجدہ سے مل سکتا ہے۔ یعنی تو زندہ مسلمانوں کے سجدوں کو خوب جانتا ہے۔ اچھی طرح پہچانتا ہے تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ میں زندہ ہوں یا مُردہ ؟ کیا تو میرے سجدہ سے میری حالت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ میرا سجدہ کسقدر بے ذوق اور مُردہ ہے بس میں خود بھی اسی طرح بے ذوق اور مُردہ ہوں۔ اے خدا مجھ سے یہ سوال کر کے تو مجھے (قوم کو) کیوں ذلیل کرتا ہے "صورت بیں عالم میرس"

بنیادی تصور :۔ اقبال اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ کہ وہ سجدہ روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی۔ اُسی کو آج ترستے ہیں۔ منبر و محراب۔

دوسری رباعی بر ص ۴

حل لغات :۔ دل من سے ذات شاعر مراد ہے ؛ کشادِ چون و چند سے

مسائل کائنات کا حل مراد ہے ۔ بلندی نگاہ سے مادیات سے بے تعلقی مراد ہے ۔ اس کافر سے دل مراد ہے ۔ لفظ کافر میں بڑی معنوی خوبی مضمر ہے کہ ایک خوبی تو یہ ہے کہ دوزخ کی رعایت سے دل کو کافر کہا ہے ۔ دوسری یہ کہ اس میں طنز کا رنگ پوشیدہ ہے ۔ ہم جسے بہت عزیز رکھتے ہیں یا جسے بہت محترم سمجھتے ہیں اُسے بھی طنزاً "کافر" کہہ دیتے ہیں مثلاً :-

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

یہاں کافر میں توہین یا تحقیر کے بجائے عزت و احترام کا تصور پوشیدہ ہے اسی طرح اقبالؔ نے اپنے دل کو کافر کہا ہے ۔ حالانکہ اس سے ان کی مراد کافر نہیں بلکہ موحد ہے ۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ اے خدا! میرا طریقہ عام لوگوں سے بالکل جداگانہ ہے دُنیا کے لوگ ، دنیا حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن میں زندگی کے اہم مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ۔ اگر تو مجھے بخش دے تو یہ تیری عنایت ہو گی لیکن اگر تو مجھے دوزخ میں بھیجے تو اتنی التجا ہے کہ مجھے دوسروں کے ساتھ مت رکھنا بلکہ دوزخ میں "ویرانہ" عطا کر دینا تاکہ میں اپنی شانِ خلوت برقرار رکھ سکوں میں دُنیا میں تنہا رہا ۔ اسلئے دوزخ میں بھی تنہا رہنا چاہتا ہوں ، میں اگرچہ گنہگار ہوں لیکن دوسروں کی طرح دُنیا کا طالب نہیں ہوں ۔ اسلئے اگر تو دوزخ میں بھیجے تو وہاں بھی خلوت میں رہنا چاہتا ہوں ۔

بنیادی تصور :- جو شخص مسائل کائنات کے حل کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے وہ خلوت پسند ہو جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ وہ دوزخ میں بھی خلوت چاہتا ہے ۔

پہلی رباعی بر صہ

حل لغات: شور:۔ ہنگامہ، طوفان، تلاطم، شدتِ جذبات ؛ آب و گل:۔ کنایہ ہے جسم انسانی سے ؛ عشق سے عاشق مراد ہے ؛ بمن رحمے:۔ یعنی اے خدا مجھ پر رحم کر ؛ کارم با دل افتاد:۔ یعنی بڑی مشکلات میں پھنس گیا ہوں ؛

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ "دل" مرکز عشق ہے۔ اور اس عشق یا دل کی خدمت کی بدولت عاشق کی زندگی سراسر ہنگامہ بن جاتی ہے۔ اے خدا! میں دل کے ہاتھوں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں یعنی عاشقی میں مشکلات درپیش ہوتی ہیں اور جب تک خدا مدد نہ کرے عاشق ان مشکلات میں غالب نہیں آسکتا۔ اسلئے تو مجھ پر نگاہ کرم کر

بنیادی تصور:۔ دل کی بدولت، عاشق کی زندگی، ہنگامہ ہائے گوناگون کا مرکز بن جاتی ہے ؛

دوسری رباعی بر صہ

حل لغات:۔ از خود بروں آوردہ:۔ اس رباعی کا مطلب اسی ترکیب کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ مسلک وحدۃ الوجود کی رُو سے یہ دُنیا کوئی مستقل یا خارجی وجود نہیں رکھتی بلکہ خدا ہی کی ذات کی تجلی ہے جس طرح آفتاب کی شعاع، آفتاب سے الگ ہوکر کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ موجود ہی نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ دُنیا اپنے وجود میں ہر لحظہ ذاتِ باری کی محتاج ہے ؛ "کیست" استفہام اقراری ہے۔ یعنی جہاں از خود بروں آوردۂ تست" یعنی اے خدا یہ دُنیا تیری ذات کی تجلی کا کرشمہ ہے۔ تو نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتی ؛ جمالش:۔ میں ش کا مرجع "جہان"

ہے۔ جمال سے دلکشی حسن و خوبی اور رعنائی مراد ہے، جو اس جہان میں پائی جاتی ہے ⁂ جلوۂ بے پردہ:۔ یعنی وہ جلوہ جو عیاں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں حُسن و جمال پایا جاتا ہے۔ یہ سب تیرا ہی ظہور ہے، تیرا ہی جلوہ ہے۔ یعنی تیرا ہی "جمال ذاتی" ہے جو گل و بلبل کے پردہ میں ظاہر ہو رہا ہے ⁂ حذر کردن:۔ اجتناب کردن۔ دُور رہنا ⁂ پدیدہ:۔ بمعنی مخلوق یعنی اُسے بھی تو نے خلعتِ وجود عطا کیا ہے

مطلب:۔ اس رباعی میں وحدۃ الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس مسلک کی تشریح مقدمہ میں کر چکا ہوں۔ اس کو مدِنظر رکھ کر اس کا مطالعہ کیجئے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! یہ دُنیا بذاتِ خود قائم نہیں ہے نہ مستقل وجود رکھتی ہے۔ بلکہ تیری صفات کا مظہر ہے، جب حقیقت حال یہ ہے کہ تیرے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے تو پھر اس کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ تیری ذات کے مختلف کرشمے یا مظاہر ہیں آپ فرماتے ہیں کہ شیطان سے حذر کرو۔ لیکن قصور معاف ہو اُسے آپ ہی نے تو پیدا کیا ہے، اس لئے ہم تو اُس میں بھی آپ ہی کے جلال کا جلوہ دیکھتے ہیں ⁂

بنیادی تصوّر:۔ اقبال شاعرانہ انداز میں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک فضلِ خدا شاملِ حال نہ ہو، انسان میں یہ طاقت نہیں کہ شیطان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ اُنہوں نے شاعرانہ شوخی کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اے خدا! میں کیا میری بساط کیا؟ جب میرا وجود ہی تیری صفتِ تخلیق کا محتاج ہے تو قدرتی طور پر میں ہر وقت تیرے فضل و کرم کا محتاج ہوں۔ جب میں بذاتِ خود کوئی ہستی یا وجود نہیں رکھتا تو بذاتِ خود شیطان سے کیسے بچ سکتا ہوں؟ خلاصۂ کلام یہ کہ اقبال نے اس رباعی میں انسان کی بے چارگی کا نقشہ کھینچا ہے، اسی مضمون کو فارسی کے کسی شاعر نے

یوں ادا کیا ہے :۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پہلی رباعی پر صفحہ

حل لغات:۔ دل بے قید سے وہ دل مراد ہے جو مادی علایق میں گرفتار نہ ہو :۔ پیچ و تاب سے اضطراب یا پریشانی مراد ہے :۔ **نصیب** بمعنی جزا۔ صلہ یا حصّہ :۔ **عتاب**:۔ کنایہ ہے دوزخ سے اور خطاب کنایہ ہے جنت سے

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ میں بہت پریشان ہوں کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہوگا ؟ میری حالت تو یہ ہے کہ میں کسی کو آزار نہیں پہنچاتا کیونکہ سب اللہ ہی کے بنائے ہیں ، حتیٰ کہ ابلیس کی بھی دل آزاری نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی گناہ کرلیتا ہوں ، کیونکہ اگر میں بالکل گناہ نہ کروں تو اس کو اپنے مقصد اغوا میں ناکامی ہوگی جس کا لازمی نتیجہ رنج ہے اسلئے اُسے خوش کرنے کیلئے (آخر وہ بھی تو تیری ہی مخلوق ہے) گناہ کرلیتا ہوں ۔ اب چونکہ میری نیت بخیر ہے اور اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اس لئے جو گناہ میں دوسروں کو خوش کرنے کیلئے کروں وہ گناہ نہیں ہے بلکہ ثواب ہے ۔ واضح ہو کہ یہ محض شاعرانہ انداز بیان ہے ۔

بنیادی تصور:۔ صوفی جو وحدۃ الوجود کا قائل ہے ، کسی کی دل آزاری نہیں کرسکتا ۔ اس کے مسلک میں اس سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں ہے :۔

ع دل بدست آور کہ حج اکبر است

دوسری رباعی پر صفحہ

مطلب:۔ جس طرح شاعر نے اپنی معشوقہ سے شکایت کی، اُسی طرح اقبال نے خدا سے شکایت کی ہے کہ اے خدا! جو لوگ تیرے عاشق ہیں، درِ اصل وہی تیرے فضل و کرم کے مستحق ہیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ معاملہ اسکے برعکس ہے۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اگر عاشقی کا صلہ یہی ہے کہ ہم تو محروم رہیں اور اغیار لطف اندوز ہوں تو پھر ایسی عاشقی کو ہمارا دُور ہی سے سلام ہے، واضح ہو کہ یہ محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبال نے مسلمانوں کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر شاعرانہ انداز بیان میں اللہ تعالیٰ سے شکایت کی ہے۔ ۱۲

پہلی رباعی پر صفحہ

حلِ لغات:۔ نجو پیچیدگان:۔ یہ اقبالؔ کی اصطلاح ہے اور اس کو انہوں نے اپنی اکثر تصانیف میں استعمال کیا ہے۔ اس کی مکمل تشریح تو فرہنگ اقبال میں درج کروں گا۔ اس جگہ صرف اس قدر کافی ہے کہ لفظ پیچیدن کے دو معنی ہیں (۱) چیزے را بچیزے دیگر وابستہ ساختن یا بچیزے دیگر وابستہ شدن (۲) بیقرار شدن پہلے مفہوم کی مثال:۔

فقر کارِ خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است

دوسرے مفہوم کی مثال :-

کرا جوئی ! چرا درپیچ و تابی
کہ او پیدا است تو زیر نقابی

"بجود پیچیدن" سے تصوف کی اصطلاح میں مراد ہوتی ہے، مافی الانفس کی سیر یہ بات قدرے تشریح طلب ہے :-

فلسفہ کے دو مشہور اسکول (مذہب) ہیں (۱) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات حقیقی ہے۔ اسلئے اس میں یعنی آفاق میں غور کرو (۲) دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات حقیقی نہیں ہے۔ صرف نفس مدرک (جس کی جمع انفس ہے) حقیقی ہے۔ اسلئے اپنے اندر یعنی انفس میں غور کرو۔ اقبال دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بجود پیچیدن کا مطلب ہے اپنے نفس (ذات) میں غور کرنا۔ دردِ دل اسیر اند :- صوفی لازمی طور پر اسیرِ دل ہوتا ہے۔ کیونکہ باہر (کائنات میں) تو کچھ موجود نہیں ہے :-

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زمان و چہ مکاں ؟ شوخیٔ گفتار من است

اس رباعی میں وحدۃ الوجود کا رنگ ہے، اور میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں کہ اقبال آخر عمر میں "وجودی" ہوگئے تھے۔ فلسفہ کا انجام اسکے سوا اور ہے بھی کیا ؟

نوٹ :- اس جگہ شاید کسی کو یہ شبہ لاحق ہو کہ بعض فلسفی تو انجام کار خدا کے منکر ہو جاتے ہیں وہ "وجودی" کس طرح ہوئے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میری مراد صرف یہ ہے کہ

(۱) جو فلسفی مادہ پرست ہے وہ کہتا ہے کہ مادہ کے علاوہ اور کسی شئی کا وجود نہیں ہے۔ یعنی دوسری کوئی شئی موجود نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات اسی ایک

مادہ کی جلوہ گری ہے۔ اور تمام اشیائے کائنات، اُسی مادہ کے مختلف مظاہر ہیں
(۲) جو فلسفی خدا پرست ہے وہ انجام کار یہ کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ یعنی دوسری کوئی شئے موجود نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات اُسی وجود واحد کی جلوہ گری ہے اور تمام اشیائے کائنات اُسی خدا کے مختلف مظاہر ہیں۔ جس کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ وحدتِ وجود کے تو دونوں قائل ہیں۔ ایک اُس وجود کی تعبیر مادہ سے کر رہا ہے۔ دوسرا خدا سے۔

ڈارون کہتا ہے "مادہ کے علاوہ اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے"
منصور کہتا ہے "خدا کے علاوہ اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے"
فرق جو کچھ ہے وہ اپنی اپنی پروازِ فکر یا "ہمت" کا ہے:۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
سنکے کہنے لگے مرے اک دوست فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

مطلب:۔ اس رباعی کے دو مطلب ہیں:۔
پہلا مطلب یہ ہے کہ اے مولا کریم! میں گروہِ عشاق سے تعلق رکھتا ہوں اور تو خود جانتا ہے۔ کہ یہ لوگ دل کی گرفت سے نکلتے ہی نہیں جو دنیا کی طرف متوجہ ہو کر اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اُنہیں دل ہی سے فرصت نہیں وہ دُنیا کی طرف متوجہ ہوں بھی کیسے؟ اِس رنگِ عاشقی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ تیرے چاہنے والے سراپا درد بن گئے ہیں۔ اور چونکہ "درد" ان کی زندگی بن گیا ہے۔ اِس لئے وہ اِس کا "درماں" یا علاج کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں:۔

ع۔ چارہ گر! ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اندریں حالات تو اپنے عاشقوں سے "سجدہ" کیوں طلب کرتا ہے؟ یعنی تو اُن سے یہ کیوں توقع کرتا ہے کہ وہ زکواۃ دیں گے یا حج کریں گے؟ مسجدیں تعمیر کریں گے یا مدارس قائم کریں گے؟ وہ تو تیری محبت میں "ویران" یعنی فنا ہو چکے ہیں۔ اُن کے پاس دولت ہے کہاں جو زکواۃ واجب ہو یا حج واجب ہو؟

اے خدا! کیا کوئی بادشاہ ویران گاؤں سے بھی خراج وصول کیا کرتا ہے

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

دوسرا مفہوم وہ ہے جس میں وحدۃ الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یعنی اے خدا! تو ہمارے دل میں پوشیدہ ہے بلکہ تو ہی تو ہے۔ ہم اپنے دل میں تجھی کو دیکھ رہے ہیں اور جب یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ لَا مَوجُودَ اِلَّا اَنتَ ترجمہ۔ تیرے سوا اور کوئی شے موجود نہیں ہے۔ تو ہم باقی ہی کہاں رہے جو تو ہم سے سجدہ کا طالب ہے؟

اسی مضمون کو حیدرآباد دکن کے ایک صوفی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

کریں ہم کس کو سجدہ اور لگائیں کس کے چندن ہم
صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم
ہوا اے فیض معلوم ایک بات میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جن کے نام کی دن رات سمرن ہم

دوسری رباعی پر بحث

حل لغات:۔ رُوَم رالے کہ الخ یعنی بے مقصد زندگی بسر کر رہا ہوں ؛

ازاں نجستے کہ الخ یعنی وہ کام کر رہا ہوں جس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ؛

مطلب :- کہتے ہیں کہ اے خدا! یہ سچ ہے کہ میں تیری مرضی کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا اگرچہ میں غموں کی پریشانیوں سے نہیں ڈرتا لیکن ایک درخواست ہے وہ یہ کہ مجھے ایسے غم میں مبتلا مت کیجئو جو دل کے شایانِ شان نہ ہو۔ یعنی "دل" کا اقتضاء یہ ہے کہ اس میں صرف تیرا غم (جلال) ہو بس تو مجھے دنیاوی غموں (فکر معاش) سے محفوظ رکھ۔

بنیادی تصوّر :- انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل کو دنیاوی غموں سے پاک رکھے۔ کیونکہ اِن سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے دل میں صرف ایک غم چاہیئے یعنی وہ غم جو خدا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔

پہلی رباعی پر صفحہ ۸

حلِ لغات :- مئے سے افکار و تخیّلات مراد ہیں ؛ تنک سماماں سے کم ظرف یا نااہل لوگ مراد ہیں ؛ شرابِ پختہ سے درسِ محبتِ الٰہی مراد ہے ؛ خاماں سے اہلِ دُنیا مراد ہیں جو روحانی حقائق سے بے بہرہ ہیں یا اُن کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ؛ شرر سے وہ حقائق مراد ہیں جو اقبال نے اپنے کلام میں بیان کئے ہیں ؛ نیستاں سے نااہل افراد مراد ہیں جو ان حقائق سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ اے خدا! میں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے اعلٰے روحانی حقائق بیان کئے ہیں۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو ان کو نااہلوں سے محفوظ رکھیو کیونکہ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتے اسلئے یقیناً ان کی بے قدری کریں گے۔

بنیادی تصوّر:۔ ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

دوسری رباعی بر ص ۸

حل لغات:۔ کشمکش اندر طلب سے عاشق کی کیفیاتِ قلبی مراد ہیں۔ عشق کا خاصہ ہے کہ وہ عاشق کو ہر وقت بقرار اور مضطرب رکھتا ہے ؛ درد و داغ، تاب و تب۔ یہ چاروں کیفیاتِ عشق کا لازمی نتیجہ ہیں ؛ لامکان۔ مکان کی نقیض ہے جیسے لا انسان، انسان کی۔ اصلاح میں لامکان اس عالم کو کہتے ہیں جہاں نہ زمانہ ہو نہ مکان ؛ نالہ ہائے نیم شب سے کیفیت عشق مراد ہے ؛

مطلب:۔ اس رباعی میں اقبال نے شاعرانہ شوخی سے کام لیکر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ "درد و داغ و تاب و تب" یہ بندہ (عاشق) کی صفات ہیں۔ حق تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہے، بندہ کی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سراپا سوز و گداز ہو۔ اگر یہ صفات اس سے زائل ہو جائیں تو اُس کی ذات فنا ہو جائیگی اور یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ بندہ کا کمال اس میں ہے کہ وہ اپنی ذات (ہستی) کو برقرار رکھ سکے ؛

ع بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست

کہتے ہیں کہ میں اسلئے لامکانی نہیں چاہتا کہ پھر میں باقی نہیں رہوں گا ؛

بنیادی تصوّر:۔ عبد کا کمال اس میں ہے کہ وہ اپنی شانِ عبدیت برقرار رکھے۔ شیخ اکبرؒ نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے۔ وَعَبْدٌ عَبْدٌ وَاِنْ تَرقّٰی۔ اور عبد ہمیشہ عبد ہی رہے گا۔ خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے اسی لئے اقبال کہتے ہیں

کمالِ زندگی دیدارِ ذات است طریقش رستن از بندِ جہات است

پہلی رباعی پرص ۹

حل لغات:۔ زمن:۔ میرے کلام یا پیغام کی تاثیر کی بدولت:۔ بندۂ سُود و زیاں سے طالب دنیا مراد ہے:۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اے خدا میرے کلام کی تاثیر سے ایسی جماعت پیدا کر دے جو اس دُنیا میں تیرا نام بلند کر سکے اور تیرے راستہ میں جہاد کر سکے موجودہ مسلمان تو دُنیا حاصل کرنے میں منہمک ہیں۔ اس لئے تو نئی قوم پیدا کر جو میرے کلام کو سمجھ کر اُس پر عمل پیرا ہو سکے:۔

بنیادی تصوّر:۔ موجودہ مسلمانوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے:۔

دوسری رباعی پرص ۹

حل لغات:۔ جہانے یعنی یہ دُنیا ایسی ہے کہ:۔ با آفتابے یعنی قرآن مجید کی روشنی کے باوجود اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے:۔ صواب او۔ یعنی جس بات کو دنیا والے صحیح (درست) سمجھتے ہیں وہ دراصل بالکل غلط ہے:۔ ویرانہ سے یہ دُنیا مراد ہے جو بظاہر آباد ہے۔ بلکہ اس کی آبادی روز افزوں ہے۔ لیکن درحقیقت بنی آدم کے ظالمانہ طرز عمل کی بدولت ویرانہ میں تبدیل ہو رہی ہے:۔

مطلب:۔ اے خدا تیرا پاک کلام اس دُنیا میں موجود ہے جو انسانوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی (نور) میں لا سکتا ہے اور اس دُنیا کو منور کر سکتا ہے، لیکن وائے بر ساکنانِ دُنیا کہ وہ اس نور سے استفادہ نہیں کرتے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے زعم باطل میں راہِ راست پر ہیں دراصل گمراہ ہیں۔ اے خدا!

توکب تک اس صورتِ حال کو پسند کرتا رہے گا؟ توکب تک بنی آدم کے وجود سے اس ویرانہ کے حسن و جمال میں کوشاں رہیگا؟ میں باادب عرض کرتا ہوں کہ اس ویرانہ کے بجائے دوسری دُنیا پیدا کر جس میں ایسے لوگ آباد ہوں جو تیری مرضی پر چلیں اور تیرے پاک کلام کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں
بنیادی تصوّر:۔ اہلِ دُنیا کی غیر مومنانہ روش پر ماتم کیا ہے۔ اور نئے دَور کی تمنا کی ہے ؎

پہلی رباعی برصفحہ ۱۰

مطلب :۔ اے خدا! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تیرا فرمانبردار بندہ ہوں اور تو جس حال میں رکھے اُسی میں راضی ہوں۔ لیکن بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ تیری دُنیا میں ظلم وستم کی اس درجہ گرم بازاری ہے کہ جب تک کوئی شخص "گدھے" کو "گھوڑا" نہ کہے ۔۔۔۔ جب تک کوئی شخص ضمیر فروشی نہ کرے دروغ گوئی کو شعار زندگی نہ بنائے دولتمندوں اور اربابِ اقتدار کی خوشامد نہ کرے، ترقی نہیں کرسکتا۔ چونکہ میں تیرے سوا، کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا اس لئے اگر تیری دنیا میں ترقی کی یہی شرط ہے۔ کہ رات کو دن کہوں تو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔
بنیادی تصوّر:۔ دنیا کی عام روش پر تبصرہ ہے کہ جھوٹ کی کثرت نے سچ کو مغلوب کر رکھا ہے۔ آج کوئی شخص سچ بول کر دُنیا میں ترقی نہیں کرسکتا ؎

دوسری رباعی برصفحہ ۱۰

حل لغات:۔ دلے یعنی ایسا دل ؛ بے سُرودے جس میں زندگی نہیں ہے؛

کفِ خاکم سے ذاتِ شاعر مراد ہے :: بارِ دوش سے نا پسندیدہ شئے مراد ہے ::
مطلب :۔ شاعر نے اپنی ذات کے پردہ میں اپنی قوم کی حالت بیان کی ہے کہ مسلمان اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو "بے حضور" یعنی اُن کے قلوب تیری محبت سے خالی ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن نمازوں سے وہ فوائد مرتب نہیں ہوتے جو مقصود ہیں ::
بنیادی تصور :۔ نماز بے حضور سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا ::

پہلی رباعی پر ص ۱۱

حل لغات :۔ قصۂ دین وطن سے وہ آویزش مراد ہے جو آج کل تمام اسلامی ممالک میں رونما ہے ۔ دین سے دین اسلام مراد ہے ۔ جو مکمل دستور العمل ہے ۔ وطن سے وہ نظریہ مراد ہے جسے سولھویں صدی میں میکیاولی نے پیش کیا تھا جس کی رو سے ۔

(ا) مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ اور نہ مذہب سیاسی معاملات میں کوئی دخل دے سکتا ہے ۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں

(ب) خیر و شر کا معیار مذہب نہیں ہے ۔ بلکہ مملکت (STATE) ہے ہر وہ بات جس سے مملکت کو تقویت حاصل ہوسکے اچھی ہے اور ہر وہ بات جس سے مملکت کو ضعف پہنچے بُری ہے ۔

(ج) قوم مذہب سے نہیں بلکہ وطن سے بنتی ہے ۔ ایک ملک میں جس قدر لوگ رہتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا نصرانی یا یہودی ہوں یا مجوسی سب ایک قوم ہیں ۔

(د) انسان کی آخری (اعلیٰ) وفاداری کا مرکز مذہب نہیں ہے بلکہ وطن ہے

(ہ) انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ وطن کیلئے جیئے اور وطن کیلئے مرے۔
(و) اگر کسی مسئلہ میں مذہب اور وطن میں اختلاف پیدا ہو جائے - تو انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ مذہب کے بجائے وطن کے فیصلہ کو تسلیم کرے
(ز) مذہب کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کی نجات اُخروی کا انتظام کردے۔ وہ سیاست یا دوسرے معاملات میں رہنمائی کا حق نہیں رکھتا۔

ان تعلیمات کو پیشِ نظر رکھ کر بآسانی ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ وطنیت کا نظریہ، دینِ اسلام کی ضد ہے۔ کیونکہ دینِ اسلام انسان کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اور زندگی کا کوئی شعبہ اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

اس نظریہ کو سب سے پہلے یورپ نے قبول کیا اور بیسویں صدی کے آغاز سے یہ نظریہ اسلامی ممالک میں بھی مروج اور مقبول ہوتا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو قبول کر لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بقول اقبال قومیت اسلام کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ مختلف ملتوں یا قوموں میں تقسیم ہو جاتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو ایک قوم بنایا ہے۔

چونکہ یہ نظریہ، اسلام کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اس لئے اقبال نے ساری عمر اس کے خلاف، اپنی پوری قوت کے ساتھ جہاد کیا۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ اے خدا دین و وطن میں جو کشمکش اس وقت جاری ہے۔ میں تجھ سے اس کی روداد کیا بیان کروں "مرنج از من کہ از بے مہری تو" اس مصرعہ میں بظاہر "بے مہری تو" میں طنز کا رنگ نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل مسلمانوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے۔ کہ اے خدا! میری قوم نے اپنی جہالت اور نادانی کی بدولت، اُس بُت خانہ کو پھر آباد کر دیا۔

جس کو اسلام نے منہدم کیا تھا۔

اقبال نے نظریہ وطنیت کو دیر یا بتخانہ سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ آج کل وطن انسانوں کا معبود بن گیا ہے اور وطن پرست، خدا کی بجائے اس کی پرستش کر رہے ہیں۔

بنیادی تصور:۔ مسلمانوں کی غفلت اور دین اسلام کے اصول سے ناواقفیت پر ماتم کیا ہے۔

دوسری رباعی بر صدا۱

حل لغات۔ بند فرنگ۔ یورپ کی غلامی خواہ سیاسی ہو یا اقتصادی ذہنی ہو یا تمدنی ؛ آساں بنیاید۔ یعنی وہ بآسانی اپنے دل پہ قابو نہیں پا سکتا مطلب یہ ہے کہ وہ غلام، اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کر سکتا ؛ سیما بمعنی پیشانی ؛ سودن بمعنی گھسنا ؛ غیر بمعنی غیر اللہ ؛ بوذرؓ سے حضرت ابوذر غفاری مراد ہیں اور سلمان سے حضرت سلمان فارسی مراد ہیں۔ چونکہ یہ دونوں بزرگ اسلام کی حقیقی روح (شان فقر) کے حامل ہیں۔ اسلئے اقبال نے ہر تصنیف میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے بنیادی تصور یہ ہے کہ جو شخص غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرتا ہے وہ منت تک سچا مسلمان نہیں بن سکتا ؛

پہلی رباعی بر صہ۱۲

حل لغات:۔ ایں جہان و آنجہاں یعنی دنیا و عقبیٰ ؛ رمز جاں: یعنی زندگی کی حقیقت ؛

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اے خدا میں نہ دنیا کا طالب ہوں نہ عقبیٰ کا میں نو عرفان

ذات خویش کا آرزو مند ہوں ۔ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میری اصلیت کیا ہے اسلئے تو مجھے دولتِ عشق (اپنی محبت) عطا کر دے ، کیونکہ عشق ہی سے مجھے اپنا سراغ مل سکتا ہے

بچشمِ عشق نگر تا سراغ خود یابی
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

بنیادی تصور: ۔ مومن صرف اللہ کی محبت کو مقصودِ حیات بناتا ہے ؛

دوسری رباعی برص ۱۲

حل لغات: ۔ مردِ تن آسا سے ذات شاعر مراد ہے وہ شخص جو دشواریوں سے بھاگتا ہو یا جہاد اور عمل صالح سے جان چراتا ہو ؛ **باد** سے حوادثِ روزگار مراد ہیں ؛ **رفتم از جا** یعنی اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہوگیا ؛ **جاوید** سے اپنے دوسرے فرزند کی طرف اشارہ ہے ۔ جسے مرحوم بہت عزیز رکھتے تھے ۔ راقم الحروف کی دعا ہے کہ وہ اپنے نامور باپ کے نقشِ قدم پر چل کر ملت کی خدمت کرے آمین ؛ **بہ بخش** ۔ یعنی اس کی کامیاب زندگی سے ؛ **چہرۂ شامم** سے شاعر نے اپنی زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے زاویہ نگاہ سے ناکام رہی ۔ اس لفظ سے پریشانیاں بھی مراد ہوسکتی ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جاوید ایسی شاندار اور کامیاب زندگی بسر کرے کہ میری سب کلفتیں دور ہو جائیں ۔ آمین ؛

پہلی رباعی برص ۱۳

حل لغات: ۔ **کشاد** بمعنی کامیابی ، ترقی ، سربلندی ؛ **فقیہش** سے مسلمانوں کے فقہا مراد ہیں ۔ جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ علی العموم یقین اور علم دونوں سے محروم ہیں اس فقدانِ یقین و علم کا نتیجہ تیسرے مصرعہ میں بیان کیا ہے نادیدنی سے وہ خواریاں

اور رسوائیاں مراد ہیں جو اس دور میں مسلمانوں کے لئے مختص (RESERVED) کر دی گئی ہیں۔ کوئی قوم ان میں شریک نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک لاکھ دختران ملت اغیار کے قبضہ میں ہیں۔ لیکن ہم بدستور عیش و عشرت میں منہمک ہیں ؛

مطلب :۔ اے خدا! میری سادگی پر نگاہِ کرم کر! میں اس قوم کی سربلندی کیلئے تجھ سے دعا کرتا ہوں جس کے رہنما اور پیشوا دولتِ ایمان اور دولتِ علم دونوں سے محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ساری عمر اپنی آنکھوں سے اپنی قوم کو ذلیل و خوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ کیا اچھا ہوتا اگر میں پیدا ہی نہ ہوتا ؛

نوٹ :۔ چونکہ "نادہندی" کی تشریح کے لئے بجائے خود ایک کتاب درکار ہے یعنی ہندی مسلمانوں کی صد سالہ (۱۸۵۰ء تا ۱۹۵۰ء) تاریخ۔ اس لئے شائقین بطور خود اس دور کی تاریخ کا مطالعہ کر لیں۔

افسوس یہ ہے کہ فقہا ابھی تک سو رہے ہیں غالباً اُس وقت بیدار ہونگے جب ساری قوم اشتراکیت قبول کرے گی۔ اور خداوندانِ ماسکو ان کے سامنے دو شرطیں پیش کریں گے کہ یا تو لینن پر ایمان لاؤ یا اس مُلک سے نکل جاؤ ۱۲ ۔

بنیادی تصوّر :۔ فقہائے ملت کی افتراق پسندی، غفلت شعاری اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بے خبری پر ماتم کیا ہے ؛

دوسری رباعی بر ص ۱۳

حل لغات :۔ بتانِ حاضر و موجود سے وہ حکومتیں مراد ہیں جو اس وقت مسلمانوں پر یا دنیائے اسلام پر کسی نہ کسی رنگ میں مسلط ہیں۔ یعنی امریکہ، فرانس، روس، برطانیہ اور ہالینڈ ؛ بتخانہ سے یہ دنیا مراد ہے ؛ اولادِ ابراہیم سے مسلمان مراد ہیں ؛ نمک پروردہ یعنی غلام ؛ نمرود :۔ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں ایک بادشاہ

تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ کنایہ ہے۔ اُن اقوام یا حکومتوں سے جنہوں نے اُس وقت انسانوں کو اپنا بندہ بنا رکھا ہے ؛

مطلب :۔ اس رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے ، بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبالؔ دنیائے اسلام کی بربادی پر اللہ تعالیٰ کی جناب میں استغاثہ کر رہے ہیں ؛

پہلی اور دوسری رباعی برصفحہ ۱۴

حل لغات :۔ سرورِ رفتہ سے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ مراد ہے ۔ کیونکہ حکومت سے سرور پیدا ہو جاتا ہے ۔ اگر سُرور کی جگہ سُرود ، لفظ رکھ دیا جائے تو اس سے اقبالؔ کی شاعری یا پیغام مراد ہو سکتی ہے اور میری رائے میں یہ لفظ انسب ہے ۔ کیونکہ دوسرے شعر میں اُنہوں نے اپنا ذکر کیا ہے اور اقبالؔ جیسا کہ سب جانتے ہیں ، سرود گو تھے ۔ اُنہوں نے اپنی قوم کو حجازی لَے میں نغمہ سنایا تھا ؛ نسیمے از حجاز سے اس شاعر کی طرف اشارہ ہے جو قوم کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرے ؛ سر آمد یعنی ختم شد ؛ دانائے راز سے وہ شخص مراد ہے جو قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے آگاہ ہو ؛

مطلب :۔ یہ رباعی مرحوم نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر موزون کی تھی ۔ جبکہ اُنہیں اپنی وفات کا یقین ہو گیا تھا ۔ اس رباعی میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرتے ہیں کہ میں عنقریب دنیا سے رُخصت ہونے والا ہوں ۔ تو ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ ایسا شخص کب پیدا ہو گا جو مسلمانوں کو عشقِ رسُول کا پیغام دے گا اور ان کو اسلام کے حقائق و معارف سے آگاہ کرے گا ۔ دوسری رباعی میں یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا اگر میرے بعد کوئی مصلح پیدا ہو تو اُس کے کلام میں ایسی تاثیر رکھ دیجیو کہ قوم کا دِل پگھل جائے اور اس کو ایسی روحانی طاقت عطا کر دیجیو کہ وہ

اصلاح نفوس کر سکے ۔ اُس میں کلیمؑ کا رنگ ہو یا وہ حکیم و دانا سے دانا ہو تاکہ دنیا کو نیری طرف بلا سکے ؛

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۵

حل لغات:۔ متاع بمعنی پونجی یا سرمایہ ؛ دلِ دردآشنا یعنی ایسا دل جس میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت موجزن ہو ؛ فغانِ نارسا سے ایسا جذبہ عشق مراد ہے جو ہمیشہ مضطرب رکھے ۔ اقبال کے فلسفہ میں وصل پسندیدہ چیز نہیں ہے کیونکہ وصل کے بعد جدوجہد ختم ہو جاتی ہے ؛

توشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام ؟ سوختنِ ناتمام

یعنی فغانِ نارسا اور سوختنِ ناتمام کا ایک ہی مطلب ہے ۔ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :۔

خودی چوں پختہ گردد لازوال است
فراقِ عاشقاں عینِ وصال است

لالہ :۔ اقبال کی شاعری میں ایک علامت (SYMBOL) ہے ۔ وہ اُس کو جذبۂ عشق کا خارجی مظہر قرار دیتے ہیں ۔ لالہ خاموش ہوتا ہے اس کے باوجود زبانِ حال سے عشق کا اظہار کرتا ہے ۔ رباعی کا مطلب واضح ہے ؛

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۵

حل لغات:۔ دل از دست کسے بُردن :۔ کنایہ ہے شانِ محبوبی سے غم اندر سینہ پروردن :۔ کنایہ ہے شانِ عاشقی سے ؛ مطلب واضح ہے ۔ اور

بنیادی تصوّر یہ ہے۔ کہ اے خدا میری قوم کے افراد میں نہ شانِ معشوقی پائی جاتی ہے نہ رنگ عاشقی۔ مسلمانوں نے زندگی کا مقصد صرف یہ سمجھا ہے کہ حیوانات کی طرح کھائیں پئیں اور مر جائیں ؛

پہلی رباعی بر ص۱۶

حل لغات :۔ دل ما از کنار ما میدہ ۔ یعنی ہم نے دل جیسی بے بہا دولت کو دنیا طلبی میں منہمک ہو کر ضائع کر دیا۔ خدا کی محبّت کے بجائے اس میں دنیا کی محبّت بھر دی ؛ بصورت ماندہ :۔ یعنی دیکھنے میں تو "دل" موجود ہے لیکن اس کا عدم اور وجود دونوں یکساں ہیں ، معنی ندیدہ ۔ کیونکہ ہم نے اس کو حقیقت سے آگاہ نہیں کیا ، یعنی ہمارا دل ، مقصدِ حیات سے آگاہ نہ ہوسکا ۔ اس کی وجہ پہلے مصرعہ میں بیان کر دی ہے ؛ آں راندۂ درگاہ سے ابلیس مراد ہے ؛ چوتھے مصرعہ کی ترکیب نحوی میں ابہام ہے ۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "حق" لفظ دیدہ کا فاعل نہیں ہے ۔ بلکہ مبتدا ہے ۔ یعنی ابلیس نے حق کو دیکھا لیکن ہم نے اس کو دیکھا نہیں بلکہ صرف دوسروں سے سُنا کہ وہ موجود ہے ۔ اسی لئے ہم سے ابلیس بہتر ہے ۔ ہم دیدار کی نعمت سے اسلئے محروم رہے کہ ہم نے اپنے دل کو جو دیدار کا واحد ذریعہ تھا ، دُنیا طلبی کی بدولت مُردہ کر دیا ۔ بنیادی تصوّر یہ ہے کہ مقصدِ مومن "دیدارِ ذات" ہے یعنی کامل یقین ۔ میں نے دیدار کا مطلب یقین اِسلئے بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں دیدار نہیں ہوسکتا ؛

نوٹ :۔ یہ بنیادی تصوّر ہی اقبالؔ کے فلسفہ کا خلاصہ ہے ، یعنی مقصدِ حیات دیدار ہے اقبالؔ نے اس کو متعدد مقامات میں واضح کیا ہے ؛

دو شعر لکھتا ہوں :۔

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش رُستن از بندِ جہات است

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

دوسری رباعی بر ص۱۶

اس رباعی کا مطلب واضح ہے، بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان، فرشتوں سے افضل ہے کیونکہ ان میں جستجو و عشق، کا مادہ نہیں ہے، خدا سے ملنے کی آرزو صرف انسان ہیں پائی جاتی ہے :

پہلی رباعی بر ص۱۷

حل لغات: رشب این انجمن الخ یعنی دنیا کی رونق میرے ہی دم سے ہے پیومہ از گردشِ خود الخ یعنی میں نے اپنے آپ کو تیرے عشق میں فنا کر دیا: یہاں "من" سے ذات شاعر مراد نہیں ہے. بلکہ نوعِ انسانی مراد ہے . تغافل ہائے تو سے اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں اس کے عشاق اکثر مصائب دنیوی کا شکار نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ خدا کے بندوں نے ہمیشہ مصیبتوں میں زندگی بسر کی ہے مثلاً امام احمد ابن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ اور شیخ شہاب الدین مقتولؒ ؛

مطلب: — اس رباعی کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :-

پہلا مطلب یہ ہے کہ اے خدا! بنی آدم نے اپنی جدو جہد سے تیری دنیا کو

رہنے کے قابل بنایا اور تیرے نام کو بلند کرنے کیلئے اپنی جانیں تجھ پر قربان کیں لیکن جب نا اہلوں اور کوتاہ بینوں نے تیری ذات پاک پر تغافل کا الزام عائد کیا کہ تو نے اپنے عشاق کی قدر نہیں کی، تو میں اُن کی محفل سے اُٹھ کر چلا آیا۔ کیونکہ میری دانست میں ان کا یہ قول کفران نعمت پر دال ہے۔ ہم تیرے بندے ہیں اور بندوں کو آقا کے طرزِ عمل پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میں نے (بنی آدم نے) اس دُنیا کو دلکش بنانے کیلئے حتی المقدور جدوجہد کی، لیکن میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صلہ (انعام) کے طالب ہیں اور توقعات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حرف شکایت زبان پر لاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا مستقل وجود ہی کہاں ہے۔ جو میں دعویٰ کروں کہ "میں" نے کوئی کارِ نمایاں انجام دیا؟ جو کچھ ہے تو ہی ہے اگر میں نے کچھ کام کیا تو وہ تیرے ہی فضل و کرم کی بدولت انجام دیا۔ حالی مرحوم نے بھی اس حقیقت کو واضح کیا ہے :-

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ بھی ہُوا ہُوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

بنیادی تصور یہ ہے کہ حضرت انسان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی اچھا کام کرتا ہے تو محض فضل رب ہے، کیونکہ فاعل حقیقی تو وہی ہے بذاتِ خود کسی انسان میں کوئی طاقت نہیں ہے بلکہ اس کا وجود ہی نہیں ہے طاقت کیسی؟

دوسری رباعی بر صـ۱۷

مطلب :۔ اس رباعی کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دور اس قدر ملحدانہ کافرانہ اور مشرکانہ ہے کہ انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، فرشتوں کا بھی دل دُکھ رہا ہے۔ بنی آدم نے اپنی حماقت کی بدولت اس دُنیا کو ایسا بُتخانہ بنا دیا ہے کہ جہلاء، اللہ کے بجائے اس کے بندوں کی پرستش کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کافر ہو جاتے ہیں

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انچہ کافرِ فرنگ امی تراشد، مومن آں رامی پرستد۔ یعنی اس زمانہ کے مسلمان اسلام سے اسقدر بیگانہ ہو چکے ہیں کہ کفار جو خیالات اور نظریات اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ بلا تامل انہیں قبول کر لیتے ہیں ؛

بنیادی تصور :۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی بے پرواہی اور جہالت پر ماتم کیا ہے

پہلی رباعی بر صـ۱۸

حل لغات :۔ رومیؒ سے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ مراد ہیں جو ۶۰۴ھ

میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۶۷۲ھ میں فوت ہوئے۔ مثنوی ان کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جس کی شان یہ ہے :۔

مثنوئ مولوئ معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

اس شرح میں نہ مثنوی پر تبصرہ کی گنجائش ہے نہ صاحب مثنوی پر۔ صرف ایک بات لکھ سکتا ہوں کہ اقبال تو مولانا رومی کے شاگرد ہیں اور مولانائے موصوف شیخ اکبرؒ کے ممنونِ کرم ہیں۔ "شورِ رومیؒ" سے عشق کی وہ کیفیت مراد ہے جو عاشق کو ہنگامہ برپا کرنے پر مائل بلکہ مجبور کردیتی ہے۔ چونکہ رومی کے اندر عشق کی یہ شان نمایاں تھی اس لئے اقبال نے رومیؒ کے لئے شور کا لفظ استعمال کیا۔ "خسرو" حضرت سیدی ومولائی سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے عاشق، جو انجام کار معشوقی کے مرتبہ عالیہ پر فائز ہو گئے تھے۔ اس کے ثبوت میں بہت سے شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بخوفِ طوالت صرف ایک شاہد پیش کرتا ہوں، اہل دل اس کو بغور پڑھیں اور اپنا ایمان تازہ کریں :۔

ایک دن میرے آقا حضرت محبوب الٰہیؒ نے عالم سرخوشی ومستی میں اپنی زبانِ گوہربار سے یوں ارشاد فرمایا کہ "اگر قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ سے یہ دریافت فرمائے گا کہ نظام الدین! تو ہماری بارگاہ میں کیا تحفہ لایا ہے؟ تو میں دست بستہ عرض کروں گا کہ مولا کریم! میں کیا اور میری بساط کیا! لیکن میں ایک چیز تیری بارگاہ میں بطور نذرانہ پیش کرنے کے کیلئے لایا ہوں جو میری تمام عمر کا سرمایہ ہے اور وہ خسروؔ کے دل کا سوز ہے۔"

اب ناظرین سمجھ گئے ہو گئے ہوں گے کہ اقبال نے "سوزِ خسرو" کی ترکیب کیوں استعمال کی ہے۔ یہ وہ سوز ہے جو اس عاشق صادق کو محبوب الٰہیؒ کی بارگاہ

سے عطا ہوئی تھی، کون محبوب الٰہیؒ؟ وہی جس کی بارگاہ میں خود اقبال نے ۱۹۰۵ء میں حاضر ہو کر کچھ التجائیں کی تھیں اور دنیا گواہی دے سکتی ہے کہ وہ سب قبول ہو گئیں۔ سوز، وہ صفت ہے جو حضرت خسروؒ کے دل میں، حضرت محبوب الٰہیؒ کی نگاہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ میں اس شرح میں جو منشی فاضل کے طلبہ کے لئے لکھ رہا ہوں نہ "سوز" کی تشریح کر سکتا ہوں نہ مصدرِ سوز کی صفت بیان کر سکتا ہوں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ سوزِ عشق کی وہ کیفیت ہے جو دل کو اس طرح پگھلا دیتی ہے جس طرح آگ سونے کو۔

اب ناظرین لازمی طور پر مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ دل کے پگھلنے سے فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دل حقیقۃً پگھلتا ہے "عکسِ رُخِ یار" اُسی قدر اُجاگر ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب دل بالکل پگھل جاتا ہے تو بالکل عکسِ رُخِ یار بن جاتا ہے۔ یعنی دل کی جگہ "یار" جلوہ گر ہو جاتا ہے ؛

سنائی ابو المجد مجدود سنائی غزنوی۔ پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے ابتداء میں سلطان بہرام شاہ غزنوی کے درباری شاعر تھے اور غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن جب ایک مومن (حضرت ابو یوسف ہمدانیؒ) کی صحبت نصیب ہوئی تو سلطان موصوف ان کا ادنیٰ غلام بن گیا۔ مولانا رومؒ نے انہی کی شان میں کہا ہے

مصرع
ما از پئے سنائیؒ و عطارؒ آمدیم

بندگی سے اللہ تعالیٰ کی غلامی مراد ہے اور اقبال کی رائے میں انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے۔ چنانچہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے "عبدہٗ" کا خطاب دیا ہے جو مرتبہ کے لحاظ سے رسولہٗ سے بھی بڑا ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص مقام عبدیت پر فائز نہ ہو خلعتِ نبوت و رسالت سے سرفراز نہیں ہو سکتا۔ عبدہٗ کی صفت میں اقبال کا ایک شعر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں :-

عبدہ دیگر عبدہ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر

درساختن :۔ موافقت کرنا یا مطابقت پیدا کرنا یا خوگر ہو جانا ؛

مطالب :۔ اس رباعی میں اقبال نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ مجھے رومیؒ کی سی مستی، خسروؒ کا سوز و گداز اور سنائیؒ کا سا صدق و اخلاص عطا کر دے اس کے بعد کہتے ہیں کہ اے خدا! میں بندگی (مقام عبدیت) کو اس قدر وقیع سمجھتا ہوں کہ خدائی لینے کو بھی تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ خدائی میں سوز و گداز کا رنگ نہیں پایا جاتا ؛

بنیادی تصور :۔ یہ ہے کہ سوز و گداز عاشقی انسان کے حق میں "متاع بے بہا" ہے :۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۸

حل لغات :۔ شمارہ بمعنی گھڑی ؛ زکارش الخ کار سے بداعمالیاں مراد ہیں جن کو دیکھ کر فرشتے بھی مسلمانوں کے حال پہ ماتم کر رہے ہیں ؛ بارِ دوش :۔ بیکار ؛

رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اس وقت مسلمان قوم دنیا میں بالکل بے مقصد دیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہی ہے۔

نوٹ :۔ اس رباعی کا ماخذ قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر تم میری نافرمانی کرو گے تو میں تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرنے پر قادر ہوں جو تمہاری طرح نافرمان نہیں ہوگی ؛
يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ؀

پہلی اور دوسری رباعی پر ص۱۹

تمہید:۔ یہ دونوں رباعیاں سابقہ رباعی کی تفصیل ہیں۔ اس لئے ان تینوں رباعیوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیئے۔

حل لغات:۔ کارے پیش گیرد: یعنی ایسی قوم پیدا کر جو جہاد کر سکے۔ نوش از نیش گیرد:۔ یعنی دشواریوں پر غالب آ سکے اور غیر موافق ماحول میں انقلاب پیدا کر سکے اُسے اپنے مطابق حال بنا سکے۔ برآرد از دل شب الخ یعنی دنیا سے کفر و طغیان کی تاریکی دور کر سکے اور دُنیا کو اسلام کے نور سے منور کر سکے۔ شناسا منزلش را آفتابے: یعنی عناصر کائنات اس کی مرضی کے تابع ہوں۔ ریگ کہکشاں روید الخ یعنی قوائے فطرت اس کے تابع فرمان ہوں۔ اور مشکلات کو اس کی راہ سے دُور کر سکیں۔

مطلب:۔ اے خدا! ایسی قوم پیدا کر جو تیری راہ میں جہاد کر سکے اور برائیوں کو بھلائیوں میں تبدیل کر سکے اور صرف اس دُنیا میں کامیابی پر قناعت نہ کرے بلکہ دُنیا اور عقبیٰ دونوں کی خوبیاں حاصل کر سکے۔

اے خدا ایسی قوم پیدا کر جو توحید پر عامل ہو اور اس عقیدہ کی طاقت سے دُنیا کو کفر کی ظلمت سے پاک کر کے اسلام کے نور سے منور کر دے قوائے فطرت کو مسخر کرے۔ اور کائنات پر حکمران ہو سکے تاکہ تیرا نام سر بلند ہو سکے۔

بنیادی تصور:۔ اقبال اس دُنیا میں اسلام کا بول بالا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی اس دلی آرزو کو ان رباعیوں میں خدا کے سامنے پیش کیا ہے۔

پہلی رباعی پر نوٹ

حل لغات:۔ در دست خسے چند :۔ یعنی اے خدا! تیری دُنیا اِس وقت نا اہلوں (کافروں) کے قبضہ میں ہے ؛ کسانِ او سے اللہ کے بندے مراد ہیں جو ظالموں کے ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں ؛ ہُنر ور سے مزدور طبقہ مراد ہے ؛ کارگاہاں سے کارخانے اور فیکٹریاں مراد ہیں ؛ کرکسے چند سے سرمایہ دار طبقہ مراد ہے ؛ رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ کہ اقبال نے سرمایہ داری کے خلاف بارگاہ ایزدی میں فریاد کی ہے ؛

دوسری رباعی پر نوٹ

حل لغات:۔ نزدیک تر از شہ رگ : یہ مصرعہ اس آیت کا ترجمہ ہے "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد"! ہم انسان سے، اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

مطلب:۔ اقبال نے شاعرانہ شوخی سے کام لیکر، مزدور طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی ہے کہ یہ طبقہ، سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ اے خدا! تو تو یہ کہتا ہے کہ ہم انسان سے اُس کی رگِ جان سے زیادہ قریب ہیں پھر کیا بات ہے کیا بات کہ ہم تیرے عاجز بندے، دن رات محنت کرتے ہیں، اس کے باوجود نہ کھانے کو روٹی ملتی ہے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا ہے؟

بنیادی تصوّر:۔ وہی ہے جو پہلی رباعی میں پایا جاتا ہے ؛

پہلی رباعی برص ۲۱

رباعی کا مطلب واضح ہے۔ بظاہر اللہ تعالیٰ سے معذرت کر رہے ہیں۔ لیکن بباطن طنز ہے مسلمانوں کی غفلت شعاری اور اسلام بیزاری پر۔ اس رباعی میں بنیادی تصور یہ ہے کہ غلام، صف آرائی کی صفت سے محروم ہو جاتا ہے۔
صف آرائی کے دو معنی ہیں۔ ایک تو نماز میں صف آرائی ہوتی ہے۔ دوسرے جہاد یا میدان جنگ میں بھی صف بندی لازمی ہے۔ حکمران (سلطان) محکوموں میں ایسا انتشار پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حصولِ مقصد کے لئے ایک مرکز پر مجتمع نہیں ہو سکتے اور صف آرائی اسی اجتماعیت کا خارجی مظہر ہے۔

دوسری رباعی برص ۲۱

حل لغات:۔ محکومی یعنی غلامی۔ خود فروش یعنی ضمیر فروش۔ گرفتارِ طلسم چشم و گوش:۔ بڑی بلیغ ترکیب ہے۔ رقص و سرود۔ ریڈیو، سینما، نمائش، ہوٹل اور ساحل بحر یعنی تمام ان چیزوں پر حاوی ہے جن میں مسلمان گرفتار ہیں۔
رگاں در تن چناں سست:۔ یعنی غلامی نے اس قدر عیش پسند اور تن آسان بنا دیا ہے۔ کہ شرعی قانون کی پابندی گوارا نہیں ہے۔ اس رباعی کا مضمون سابقہ رباعی سے مربوط ہے۔ اور مطلب واضح ہے۔

پہلی اور دوسری رباعی برص ۲۲

یہ دونوں رباعیاں آسان ہیں پہلی میں اقبال نے اللہ سے یہ درخواست کی ہے کہ اے خدا اس دنیا کو جاودانی کر دے اور دوسری میں یہ کہا ہے۔ کہ

اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم مجھے اِس دولت (ہمیشگی) سے مالا مال کر دے۔

بنیادی تصور:۔ ان رباعیوں میں اقبالؔ نے فطرتِ انسانی کی ترجمانی کی ہے ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ مجھے ہمیشگی کی صفت حاصل ہو جائے ؛

پہلی رباعی بر صـ۲۳ـ

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! جب یہ دُنیا ختم ہوگی اور قیامت قائم ہوگی تو تمام انسانوں کے اعمال (ظاہر یا پوشیدہ) ظاہر ہو جائیں گے۔ اے مولا کریم! میں بہت گنہگار ہوں اور میں نے ساری عمر اپنے آقا اور مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ہے اِس لئے میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں میرا حساب مت لیجیو۔

اِس رباعی کے چوتھے مصرعہ میں جو بات ہے وہ شرح سے بالاتر ہے۔

بنیادی تصور:۔ عاشق اپنے معشوق کے سامنے ذلیل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ بات عاشقی کی فطرت کے خلاف ہے، اس رباعی سے اقبالؔ کی اُس محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو اُن کو سرکار دو عالم صلعم کے ساتھ تھی ؛

دوسری رباعی بر صـ۲۳ـ

حل لغات:۔ بدن واماند: جسم تھک چکا ہے بمعنی لیکن :: جانم در تگ و پوست: یعنی روح بیقرار ہے، مشتاق ہے :: سوئے شہرے الخ:۔ اشارہ ہے یثرب (مدینۃ النبیؐ) کی طرف جب کوئی شخص جدہ سے مدینہ منورہ جاتا ہے تو وادیٔ (بطحیٰ) یعنی مکہ مکرمہ راستہ میں پڑتا ہے :: ہوائے منزل دوست: محبوب کے گھر کے دیدار کی آرزو :: رباعی کا مطلب واضح ہے۔ مکہ مکرمہ میں طوافِ کعبہ کے بعد، عاشق مدینۃ النبیؐ

کی طرف روانہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ حضور! آپ اپنے اولیاء سے ملاقات فرمائیں، میں تو اپنے محبوب سے ملنے جا رہا ہوں۔

مطلب: کہتے ہیں کہ میرا جسم چونکہ نحیف و نزار ہے اسلئے میں تھک گیا لیکن میری روح مدینہ پہنچنے کیلئے بیقرار ہے۔ اسلئے اے خدا! تو اب اس شہر میں اپنے اولیاء و خاص بندوں کو شرف صحبت عطا فرمائیں تو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے مدینہ جا رہا ہوں۔

بنیادی تصور: اقبال کی نظر میں، ذات رسول، ذات خداوندی سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ اسی بات کا اس رباعی میں اظہار کیا ہے۔ اُنھوں نے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی۔ بیس سال پہلے بھی وہی بات کہہ چکے ہیں:-

معنی حرفم کنی تحقیق اگر	بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوت قلب و جگر گردد نبیؐ	از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

(رموز بیخودی)

ایک دفعہ میں نے مرحوم سے ان اشعار کا مطلب دریافت کیا تو کہا کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے محبوب تر سمجھتا ہوں کہ ہم نے حضورؐ ہی کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کو جانا۔ کوئی انسان اپنی عقل کی مدد سے اللہ کو نہیں جان سکتا۔ عقل زیادہ سے زیادہ ایک واجب الذات یا علۃ العلل کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ جس سے بنی آدم سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

دوسرا باب

حضورِ رسالتؐ

تمہید:- علامہ مرحوم نے اس باب کے آغاز میں عزت بخاری کے ایک شعر کو زیبِ عنوان بنایا ہے۔ اور اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اس پورے باب کی روح سمٹ کر آگئی ہے۔ یعنی سرکارِ دوعالم صلعم کا روضۂ مطہرہ ایسی "ادب گاہ" ہے جہاں عوام کا تو مذکور ہی کیا ہے خواص بھی مثلاً حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ جب حاضر بارگاہ ہوتے ہیں تو حواس باختہ ہوجاتے ہیں۔ مبادا کوئی گستاخی سرزد ہوجائے۔

عزت بخاری کا اصلی نام عبدالولی تھا، باپ کا نام سعد اللہ تھا جو ترکوں کے ایک مشہور قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ شخص حضرت عالمگیرؒ کا معتمد علیہ تھا۔ عزت اپنے باپ کی وفات کے بعد مرشد آباد چلا گیا چونکہ سپہ گری کے بجائے شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اسلئے قصائد و غزلیات کی بدولت علی وردی خاں ناظم بنگال کے دربار میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ جب ۱۷۵۶ء میں ناظم مذکور کی وفات ہوگئی تو عزت حیدرآباد دکن چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

شعر کا مطلب:- ادب گاہ کنایہ ہے ذاتِ رسولؐ سے۔ عرش کنایہ ہے ذات باری سے اور لفظ نازک تر اس شعر کی جان ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ایک

حضرت بایزید بسطامی نے ۲۶۱ھ میں اور حضرت جنید بغدادیؒ نے ۲۹۸ھ میں وفات پائی

شخص اگر ذات باری کی توہین یا تحقیر کرکے کافر یا مرتد یا ملحد ہو جائے تو اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے لیکن اگر کوئی بدبخت سرکار دو عالم صلعم کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوسکتی اور وہ تمام فقہاء کے نزدیک واجب القتل ہے (تفصیل کے لئے دیکھو شفائے قاضی عیاض)

یہاں بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ تفریق کس بنا پر قائم کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کی جناب میں گستاخی، گستاخی نہیں ہے، جیسے کوئی پاگل کسی شریف آدمی کو گالی دیدے تو وہ اس مخبوط الحواس انسان کو لائق سرزنش قرار نہیں دیگا بلکہ اس پر رحم کریگا جسطرح ایک پاگل کسی شریف آدمی یا بادشاہ کے مرتبہ کو نہیں پہچان سکتا اسی طرح ایک انسان اللہ تعالیٰ کے مرتبہ کو کماحقہٗ نہیں جان سکتا۔ پس وہ اپنی جہالت کی بنا پر قابل معافی ہے۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ جامۂ بشریت میں ملبوس ہیں اور اس کے لحاظ سے ہمارے مثل ہیں۔ اسلئے آپ کی جناب میں گستاخی، قابل معافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آپ نے اعلان فرمایا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور اس دعویٰ میں سچا ہوں، اور میرے سچے ہونے کی آسان ترین دلیل یہ ہے کہ میں نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا۔ تو چالیس سال کے بعد یکایک جھوٹ پر کس طرح مائل ہوسکتا ہوں؟

اب اگر ایک شخص حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے "ایلچی" کی توہین کرتا ہے۔ اگر اس کو معاف کر دیا جائے تو پھر امان اٹھ جائے گا اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ایلچی دینی یا رسول، کی کوئی وقعت باقی نہیں رہیگی۔ اور جب اس کی وقعت باقی نہیں رہے گی تو کوئی شخص اس کی طرف متوجہ کیسے ہوگا۔ فافہم۔

نوٹ:۔ اسی لئے کسی دانشمند نے یہ مصرعہ کہا ہے:۔

ع باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

بالجملہ روضۂ رسولؐ عرشِ الٰہی سے بلند تر یا ارفع تر تو نہیں ہے لیکن "نازک تر" ضرور ہے، یہاں نزاکت سے ساخت یا تعمیر یا وجود کی نزاکت مراد نہیں ہے، بلکہ حفظِ مراتب کی نزاکت مراد ہے۔ یعنی سرکارِ دو عالم کی شان ایسی نازک ہے کہ گستاخی کا ادنیٰ شائبہ بھی انسان کو فیضانِ رسالت سے محروم کر دینے کیلئے کافی ہے۔

نکتہ:۔ حضورؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی شان میں گستاخی کو تو معاف کر دیگا۔ لیکن اپنے محبوبؐ کی شان میں گستاخی کو روا نہیں رکھ سکتا لیکن یہ نکتہ صرف اُسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جو عاشقِ رسولؐ ہو۔ ۱۲

بابِ زیرِ بحث کا تجزیہ:۔ طلبہ اور شائقین کی سہولت کیلئے اس باب کا تجزیہ سطورِ ذیل میں پیش کرتا ہوں:۔

تجزیہ کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے۔ کہ اقبالؔ مرحوم نے ان رباعیات میں اپنے متوقع سفرِ حجاز کا نقشہ کھینچا ہے یہ صحیح ہے کہ وہ بالفعل سفر نہ کر سکے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تصور میں، اُنہوں نے ساری منزلیں طے کر لیں۔ جس کی تفصیل ان رباعیات میں مل سکتی ہے۔

حسبِ معمول اس باب کو بھی اُنہوں نے اجزاء پر منقسم کر دیا ہے۔

جزو ۱:۔ میں اُنہوں نے سرکارِ دو عالم صلعم تک پہنچنے کا حقیقی طریق بتایا ہے۔ یعنی طریقِ عشق۔ اس کے بعد دو رباعیوں میں دل کی کیفیت بیان کی ہے۔ اور چوتھی میں عاشقوں کی حالت اور پانچویں میں اپنے سفر کا نقشہ کھینچا ہے۔

۲:۔ میں منازلِ سفر کا حال بیان کیا ہے کہ عاشق، عشقِ رسول صلعم میں سرشار ہو کر عراقیؔ اور جامیؔ کی غزلیں گاتا ہؤا دیارِ محبوب کی طرف جا رہا ہے۔

جزو ۳:۔ میں ناقہ سے عاشقانہ رنگ میں خطاب کیا ہے۔

جزو ۴:۔ میں حجاز کے صحرا سے خطاب کیا ہے۔

جزو ۵:- میں در پردہ اپنی حالت مستی کا تذکرہ کیا ہے۔
جزو ۶:- میں فراق کی لذت کا بیان کیا ہے۔
جزو ۷:- میں ذوق وشوق اور جذب ومستی کا اظہار ہے۔
جزو ۸:- میں پہلی رباعی میں، دوستوں کو عشق رسولؐ کی دعوت دی ہے۔
دوسری رباعی میں اپنی خوش نصیبی پر فخر کیا ہے۔
تیسری رباعی میں حرم نبیؐ کے قرب کی کیفیت بیان کی ہے۔
چوتھی رباعی میں مدینہ منورہ کی عظمت واضح کی ہے
جزو ۹:- میں جو ص۳۵ سے شروع ہو کر ص۸۱ پر ختم ہوتا ہے، عاشق نے بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہو کر اپنے تمام جذبات واحساسات واشگاف بیان کر دیئے ہیں۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق اپنے معشوق سے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔ یہ حصہ اس باب ہی کا نہیں بلکہ ساری کتاب کی جان ہے۔ اور اِن میں سوز ومستی کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص لفظوں کے ذریعہ سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔
جزو ۱۰:- میں جاوید (سلمہٗ ربہٗ) کے لئے دعا کی ہے۔
جزو ۱۱:- میں قوم کے نوجوانوں کے لئے دعا کی ہے۔
جزو ۱۲:- میں جملہ افرادِ قوم کے لئے دعا کی ہے۔
جزو ۱۳:- میں سلطان ابن سعود والیٔ نجد وحجاز سے خطاب کیا ہے اور اُسے مسلک عشق کی دعوت دی ہے۔
اب میں اللہ کا نام لے کر اِن رباعیات کی شرح لکھتا ہوں

رباعی بر صفحہ ۲۷

حل لغات:۔ اَلا ۔ کلمہ تنبیہ ہے یعنی اے فلاں! آگاہ ہو یا میری بات سن ۔ خیمگی: ۔ وہ شخص جو خیمہ میں بیٹھا ہُوا ہو ۔ جیسا کہ حاشیہ میں درج ہے ۔ فرو دہل: خیمہ سے باہر نکل اور آمادۂ سفر ہو جا ۔ پیش آہنگ: ۔ یعنی قافلہ کا رہنما بیروں شد ۔ یعنی منزل سے آگے بڑھ چکا ہے ۔ خرد بمعنی عقل ۔ محمل سے یہاں شخصیت مراد ہے ۔ زمام، لغوی معنی باگ ڈور مراد ہے اختیار و اقتدار ۔ دل بمعنی عشق ۔

مطلب:۔ اقبال نے اس رباعی میں منوچہری[1] کے شعر کو اپنے مخصوص رنگ میں استعمال کیا ہے ۔ یعنی اے مسلمان! کب تک دُنیا حاصل کرنے کی فکر میں منہمک رہیگا ۔ اُٹھ اور دربارِ حبیب کی زیارت کیلئے کمربستہ ہو جا ۔ تو دیکھتا نہیں کہ حاجیوں کا قافلہ روانگی کے لئے تیار ہے ۔ عقل تو ہمیشہ تجھے طلبِ دُنیا میں مشغول رکھیگی ۔ اور تجھے یہی مشورہ دیگی کہ زیارتِ حرمین میں جو رقم صرف ہوگی کیوں نہ اُسے لوہے کا پرمٹ حاصل کرنے میں صرف کیا جائے جو ایک ہی سال میں وارے نیارے ہو جائیں ۔ چونکہ عقل انسان کو، کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکتی ۔ اس لئے میں نے اس کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بنا لیا ہے ۔

بنیادی تصور:۔ عیش و آرام چھوڑ کر، وہی شخص حج کو جا سکتا ہے اور راستہ کی صعوبات اُٹھا سکتا ہے ۔ جس کے دل میں عشقِ رسُول کا جذبہ موجزن ہو ۔

---

[1] منوچہری کا نام نجم الدین احمد بن یعقوب بن منوچہر تھا ۔ سلطان محمود غزنوی کا درباری شاعر تھا ۔ سنہ ۱۰۸۰ء میں وفات پائی ۔

نوٹ :۔ خرد مرکز و منبع تشکیک ہے اور دل مرکز و منبع یقین ہے ۔

پہلی رباعی بر ص ۲۸

حل لغات :۔ نگاہے داشتم یعنی میں اپنے "دل" کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا ۔ اسلئے اُسے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کا آرزومند تھا ۔ تپیدم :۔ یعنی میں نے شیوۂ عشق اختیار کیا ۔ آرمیدم :۔ یعنی میں نے عاشقانہ زندگی بسر کرنی شروع کردی ۔ رمیدم یعنی کنارہ کش ہوگیا ۔

مطلب :۔ پہلی رباعی میں شاعر نے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تھا ۔ اب سفر شروع ہوگیا ۔ کہتے ہیں کہ شہروں کی زندگی سے دل مُردہ ہوتا ہے چونکہ میں دل کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ ہوں، اس لئے میں نے مسلک عشق کو اختیار کرلیا اور شہری زندگی کو ترک کر کے، صحرا کی زندگی اختیار کرلی ہے کیونکہ :۔

یہی ہے سر کلیمیٔ ہر اک زمانہ میں
ہوائے دشت و شعیبؑ و شبانی ہمہ روز

بباد دشت و اکردم در دل یعنی میں نے "بادیت" اختیار کرلی ۔

بنیادی تصور :۔ دل کی تربیت اور ترقیٔ باطن کیلئے "باد دشت" یعنی خلوت بہت ضروری ہے ۔

دوسری رباعی ص ۲۸

مطلب :۔ اس رباعی میں شاعر، عاشق کی نفسیاتی کیفیات کا بیان کرتا ہے کہ جب دل پر عشق الٰہی، کا غلبہ ہوجاتا ہے تو اُسے کسی وقت سکون نصیب نہیں ہوتا، وہ ہر لحظہ محبوب سے ملنے کے لئے بیقرار رہتا ہے نہ اُسے بیابان

پسند آتا ہے نہ باغ :-

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لیجا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو

بنیادی تصور :- شیدائے جلوۂ یار کو کسی وقت قرار نہیں آتا۔

پہلی رباعی بر ص ۲۹

حل لغات : مپرس :- یعنی عاشقوں کا حال مت پوچھ کیونکہ عشق کی کیفیت لفظوں کے ذریعے سے بیان نہیں ہو سکتی ☆ جلوہ مستاں :- یعنی عشاق ☆ رکندہ دستاں :- یعنی وہ لوگ جو دنیاوی علائق سے کنارہ کش ہو چکے ہوں اور صرف محبوب کو مقصدِ حیات بنا چکے ہوں ☆ نیستاں :- یعنی بانس کا جنگل ☆

مطلب :- کہتے ہیں عاشق کی کیفیت قلبی کا اظہار لفظوں کے ذریعے نہیں ہو سکتا جب قافلہ کی روانگی سے پہلے گھنٹہ بجتا ہے تو اُن کے قلوب میں شاید قسم کا ہیجان برپا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ عنقریب دربارِ حبیبؐ کی زیارت حاصل ہو گی

بنیادی تصور :- عاشق کی توجہ تمام تر اپنے محبوب سے ملاقات پر مبذول رہتی ہے ☆

دوسری رباعی بر ص ۲۹

مطلب :- یہ رباعی آسان ہے، مطلب یہ ہے کہ یثرب (مدینۃ النبیؐ) میرا ملجا اور ماوی ہے۔ مجھے اس شہر سے وہی نسبت ہے جو پرند کو اپنے آشیانے سے ہوتی ہے ☆

پہلی رباعی برصفحہ ۳

حل لغات: گناہ سے یہاں مسلک یا طریق مراد ہے۔ اقبالؔ نے عشق کے لئے گناہ کا لفظ اسلئے استعمال کیا ہے کہ ظاہر بین حضرات یعنی فلاسفہ مسلک عشق کو گناہ ہی سمجھتے ہیں۔ درحقیقت یہ اُن پر طنز ہے۔ دلیل پختگاں سے فلاسفہ کا طریق استدلال مراد ہے۔ خام کردنا۔ یعنی بیکار کر دیا۔ آہنگ حجازی موسیقی کی ایک مخصوص طرز ہے۔ لفظ حجازی میں یہ خوبی ہے کہ حجاز ایک راگنی کا بھی نام ہے اور اُس ملک کا بھی جس میں مکہ اور مدینہ واقع ہے۔

مطلب: کہتے ہیں کہ عاشقوں کے مسلک نے علماء کے مسلک کو باطل کر دیا۔ اسلئے میں بھی حجازی لہجہ یا انداز میں عراقی کی یہ غزل گا تا ہُوا دیار حبیب کی طرف جا رہا ہوں جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:-

نخستیں بادہ کاندر جام کردند۔

واضح ہو کہ یہ عراقی کی مشہور غزل کے مطلع کا پہلا مصرعہ ہے ناظرین کی آگاہی کیلئے اس غزل کا مطلع اور مقطع ذیل میں درج کرتا ہوں:-

نخستیں بادہ کاندر جام کردند۔ زچشم مست ساقی وام کردند۔

چو خود کردند راز خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند۔

عراقی کا نام فخر الدین ابراہیم تھا، ہمدان میں ولادت ہوئی شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے اور شاگرد تھے جوانی میں قلندروں کی ایک جماعت کے ساتھ وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور ملتان پہنچ کر حضرت خواجہ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے مرید ہو گئے شیخ کی خانقاہ میں رہ کر سلوک کی منازل طے کیں۔ اس کے بعد مصر وشام کا سفر کیا اور دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۶۸۸ھ میں وفات

پائی چونکہ اِن کی زندگی میں عشق و مستی کا رنگ بہت نمایاں تھا، اسلئے اقبالؔ نے ان کی غزل کا مشہور مطلع اپنے مقصد کے اظہار کیلئے استعمال کیا اور اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے بہترین شعر منتخب کیا ہے، کیونکہ مسلک صوفیہ کے مطابق سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک نقطۂ پرکارِ عشق و محبت ہے۔

دوسری رباعی بر ص۳۱

مطلب:۔ اس رباعی کا مضمون مسلسل ہے کہتے ہیں کہ جو لوگ کوچۂ عشق سے نابلد ہیں وہ میری کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے کم شناس بمعنی کم شناسا۔ میں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ترکِ وطن کیا اور اب وادیٔ حجاز میں آپؐ کی محبت کے گیت تنہائی میں گا رہا ہوں۔

پہلی رباعی بر ص۳۱

مطلب:۔ اس رباعی میں ناقہ سے خطاب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ناقہ سے درخواست کی آہستہ چل کیونکہ میں عشق رسولؐ میں بہت رنجور ہو چکا ہوں لیکن ناقہ خود دیارِ حبیبؐ کی متوالی ہے، اس لئے اُس نے میری درخواست پر عمل نہیں کیا اور مستی کی حالت میں زیادہ تیز چلنے لگی اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے ریگ نہیں بلکہ ریشم بچھا ہوا ہے:

دوسری رباعی بر ص۳۱

مطلب:۔ اس رباعی میں ساربان سے خطاب کرتے ہیں کہ ناقہ بھی ہماری طرح سمجھ بوجھ رکھتی ہے، اس لئے مہار کی ضرورت نہیں ہے وہ خود مدینہ کی طرف

جائیگی۔ میں اس کی مستانہ رفتار دیکھ کر یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بھی ہماری طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں گرفتار ہے۔

پہلی رباعی بر صہ ۳۱

مطلب:۔ اس رباعی میں بھی ناقہ ہی کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی میری طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ طیبہ سے محبت کرتی ہے۔

جس شراب محبت نے میری روح کو منور کر دیا ہے۔ اُسی شراب کا رنگ اس کی آنکھوں سے بھی نمایاں ہے۔

دوسری رباعی بر صہ ۳۲

مطلب:۔ اس رباعی اور آئندہ رباعی میں حجاز کے صحرا کا تذکرہ کیا ہے کہتے ہیں کہ قافلے دربار حبیب کی طرف درود و سلام پڑھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں تمازت آفتاب کی وجہ سے ریت گرم ہو گیا ہے اس کے بعد حاجیوں سے خطاب کرتے ہیں کہ یہ موقع شاید پھر نہ ملے اس گرم ریت پر بصد شوق سجدے کرو تاکہ پیشانی کو داغ لگ جائے۔

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ اس صحرا کے گرم ریت پہ سجدہ کرنے میں عاشق کو ایک خاص لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ سجدے عاشق کیلئے باعث صد عز و افتخار ہے۔

پہلی رباعی بر صہ ۳۳

مطلب:۔ اس رباعی میں بھی صحرائے حجاز کا ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ صحرائے

حجاز اس قدر دلکش ہے کہ اس کی شام، دوسرے ملکوں کی صبح سے بھی زیادہ دلپذیر ہے۔ اس کی راتیں چھوٹی اور دن طویل ہوتے ہیں۔ اے لوگو! آہستہ چلو کیونکہ اس صحرا کا ہر ذرہ، کیفیتِ عشق سے سرشار نظر آتا ہے۔

بنیادی تصور: یہ ہے کہ عاشق کی نگاہ میں دیارِ حبیبؐ کی سرزمین بھی بہت محترم ہے۔

دوسری رباعی بر ۳۳

مطلب: اس رباعی میں در پردہ اپنا تذکرہ کیا ہے، کہتے ہیں کہ اے امیرِ کارواں! یہ عجمی شخص کون ہے جس کا لب و لہجہ عربوں سے جدا ہے اور اس کا انداز موسیقی بھی اُن سے نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود اس کے نغمہ میں ایسی دلکشی اور مستی ہے کہ اگر کوئی شخص ساری عمر اُسے سنتا رہے تو اس بیابان میں اُسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ ساری عمر نہایت خوشی کیساتھ اسی جگہ گذار دے گا۔

بنیادی تصور: یہ ہے کہ اقبال اپنے دل کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ مجھے یہ صحرا بھی اس قدر دلکش معلوم ہوتا ہے کہ میں اس میں اپنی ساری عمر بسر کرنے کیلئے تیار ہوں۔ بایں صورت کہ سرکار دو عالمؐ کے عشق میں نغمہ سرائی کرتا رہوں۔

پہلی رباعی بر ۳۴

اس رباعی میں بھی در پردہ اپنا ہی تذکرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق و مستی کی زندگی ہی میرا مقصودِ حیات ہے کیونکہ میری شخصیت میں عشق کارفرما ہے یعنی حضورؐ کی محبت میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ میری آواز اور میری نغمہ سرائی ہر شخص کو اس لئے پسند ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں وہی کیفیت کارفرما ہے جو میرے دل میں ہے۔

دوسری رباعی برص ۳۴

مطلب:۔ اس رباعی اور آئندہ رباعی میں فراق کی کیفیت بیان کی ہے کہتے ہیں کہ مجھے کسی سے اپنا درد دل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے "صورت بہ بیں حالم مپرس"۔ والا مضمون ہے مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ راستہ پرپیچ اور دشوار گزار ہے۔ اور میں بہت ضعیف و ناتواں ہوں اور اشتیاقِ آستاں بوسی حد سے فزوں ہے۔ چراغش مردہ دشب با در میاں، کنایہ ہے عاشق کی بیچارگی اور جذبۂ عشق کی شدت اور طولِ شبِ فراق سے۔

بنیادی تصور:۔ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اپنی کیفیت فراق کا بیان مقصود ہے۔

پہلی رباعی برص ۳۵

مطلب:۔ اس رباعی میں بھی فراق کی کیفیت بیان کی ہے کہتے ہیں کہ موسم بہار میں جنگلوں میں گل لالہ اُگے ہوئے ہیں اور احباب سیر و تفریح کے لئے آئے ہوئے ہیں لیکن میں کسی کی یاد میں اس قدر مضطرب ہوں کہ مجھے صحبت احباب میں کوئی لطف نہیں آتا۔ بلکہ میں تو کسی پہاڑی ندی کے کنارے کسی کی یاد میں محو رہنا چاہتا ہوں۔

دوسری رباعی برص ۳۵

مطلب: میری حالت یہ ہے کہ کسی کی یاد میں بےچین ہوں۔ دل ہے کہ ہر لحظہ بیقرار رہتا ہے۔ اس اضطراب کو کم کرنے کیلئے کبھی عراقیؒ کی غزلیں پڑھتا ہوں کبھی جامی کے کلام سے دل کو تسکین دیتا ہوں، اگرچہ میں حجازی لہجہ سے آشنا نہیں ہوں لیکن

وفورِ اشتیاق سے ساربان کی آوازہ ملا رہا ہوں۔
نوٹ :۔ مولانا عراقیؒ کا مختصر تذکرہ قبل ازیں لکھ چکا ہوں۔ عارف جامیؒ کا نام شیخ عبدالرحمٰن تھا۔ جام مولد و منشا ہے۔ ولادت ۱۴۱۲ء میں ہوئی۔ یہ بلاشبہ دُنیائے اسلام کی نامور ہستیوں میں سے ہیں۔ ملاعنہ فرنگ کے تسلط سے قبل ہندوستان کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا نہ تھا جو ان کے نام سے واقف نہ ہو۔ جس طرح آج کوئی تعلیم یافتہ مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو شیکسپیئر اور ملٹن کے نام سے آگاہ نہ ہو۔ جس طرح عراقیؒ کی وہ غزل بہت مشہور ہے جس کا مصرعہ قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے اسی طرح مولانا جامی کی یہ غزل بہت مقبول ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

وصلی اللہ علی نورٍ کزو شد نورہا پیدا　　زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

چونکہ آخر عمر میں اقبال کا میلان طبع غالب اور عرفی کے بجائے عراقی اور جامیؒ کی طرف ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کا تذکرہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے۔

پہلی رباعی پر ص۳۶

مطلب :۔ اس رباعی میں عاشق ساربان سے خطاب کرتا ہے۔ کہ اے ساربان! میری کیفیت عاشقی میں سوز و گداز کا رنگ پیدا کر دے میری آتش عشق کو اور بھڑکا دے۔ میرے جذبہ دروں میں اور شدت پیدا کر دے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ سیدھے راستہ کے بجائے تو مجھے کسی دُور دراز راستہ سے لے چل!
بنیادی تصور :۔ یہ ہے کہ عاشق کو سوز جدائی میں بہت لطف آتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے۔

دوسری رباعی پر صد ۳۶

مطلب:۔ اس رباعی اور آئندہ تین رباعیوں میں شاعر نے یہ بیان کیا کہ سفر طے کر کے عاشق حوالیٔ مدینہ طیبہ میں پہنچ چکا ہے :۔ اور اب اپنے دوستوں کے ساتھ، روضۂ اقدس پر حاضر ہونے کی تیاری کر رہا ہے چنانچہ اس رباعی میں وہ اپنے دوست سے کہتا ہے کہ اے دوست! چونکہ میں اور تم دونوں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں گرفتار ہیں۔ کشتۂ شانِ جمال ہیں۔ آؤ دونوں چلیں اور روضہ اقدس پہ حاضر ہو کر مدعائے دلی بیان کریں اور حضورؐ کے قدموں سے اپنی آنکھیں ملیں تاکہ ان میں روشنی پیدا ہو جائے۔

بنیادی تصور:۔ جذبات عاشقی کا اظہار مدِ نظر ہے۔

پہلی رباعی پر صد ۳۷

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اس دربار میں عقلاء (فلاسفہ) کے مقابلہ میں نادانوں کو زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ حکیم تو ابوجہل کی طرح اعتراض کرتا ہے اور شکوک پیدا کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سیدھا سادھا آدمی، صدیق اکبرؓ کی طرح یا علی المرتضیٰ کی طرح روئے مبارک ہی دیکھ کر ایمان لے آتا ہے یہی حال میرا ہے میں بھی کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھ جیسے کم سواد، بے مایہ اور گمنام شخص کی رسائی سلطان دو عالمؐ کے دربار میں ہو گئی۔

بنیادی تصور:۔ سرکار دو عالمؐ کی بارگاہ سے صرف وہی شخص فیض حاصل کر سکتا ہے جو اپنے علم و فضل کو بالائے طاق رکھ کر ایک طفل نادان کی حیثیت سے حضورؐ کے قدموں میں سر رکھ دے فلسفی ناکام رہتا ہے عاشق کامیاب ہو جاتا ہے

دوسری رباعی برص ۳

مطلب:۔ اس رباعی میں شاعر نے عاشق کی اس باطنی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے جو اس پر اُس وقت طاری ہوئی جب وہ حرمِ نبویؐ کے قریب پہنچا۔ کہتا ہے کہ جب میں حضور انورؐ کے روضہ مقدسہ کے سامنے پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ ساری کائنات مجھ میں سما گئی ہے اور میں زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو گیا ہوں جب میں اس مقام سے آگے بڑھا تو پرواز ختم ہو گئی۔

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ جس مقام سے حضورؐ کی رفعت کا آغاز ہوتا ہے اس مقام پر پہنچ کر سالک کی روحانی ترقی کا اختتام ہو جاتا ہے۔

پہلی رباعی برص ۳۸

مطلب:۔ اس رباعی میں شاعر مدینۃ النبیؐ کی عظمت واضح کرتا ہے کہ اس شہر میں یہ تاثیر ہے کہ یہاں فانی انسانوں کو عشقِ رسول کی بدولت حیاتِ جاودانی حاصل ہو جاتی ہے اور یہاں کی خاک میں یہ تاثیر ہے کہ اگر کوئی شخص حضورِ انورؐ کے روضہ مقدسہ کے سامنے باادب بیٹھ جائے اور حضورؐ سے لو لگائے تو اس کے دل پر فیضانِ رسالتؐ کا نزول ہونے لگتا ہے یہ مطلب ہے اس مصرعہ کا کہ "زخاکش بے صور روید معانی" یعنی معانی کیلئے صورت (الفاظ) کا ہونا ضروری ہے لیکن اس سرزمین کی یہ شان ہے کہ یہاں الفاظ کے واسطہ کے بغیر ہی دل پر معانی منکشف ہوتے ہیں۔

نیز حضور انورؐ کا روضہ مقدسہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں حکیم اور کلیم، فلسفی اور صوفی، اہل استدلال اور اہل وجدان دونوں کی تسلی کا سامان موجود ہے

وجہ یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام عاشقوں کی دلداری فرماتے ہیں۔ حضورِ اقدسؐ کے دروازے سے کوئی شخص محروم نہیں جاتا۔ سرکارِ دو عالم کسی سے "لن ترانی" نہیں فرماتے۔

نوٹ:۔ اقبال نے یہ چوتھا مصرع ایسا بہم پہنچایا ہے کہ میری توصیف سے بالاتر ہے۔ اربابِ بینش غور کریں کہ مرحوم نے کیسی خوبصورتی سے حضورِ انورؐ کی شانِ رحمۃ اللعالمینی کا اثبات کیا ہے۔ بیشک اللہ نے تو حضرت موسیٰؑ سے کہدیا تھا کہ لن ترانی یعنی اے موسیٰؑ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا لیکن سرکارِ دو عالم صلعم کسی کو اپنے دیدار فیضِ آثار سے محروم نہیں فرماتے۔

دوسری رباعی نمبر ۳

مطلب:۔ یہاں سے ص۸۱ تک ایک عاشقِ رسولؐ نے تاجدارِ کون و مکان بادشاہِ انس و جاں سرکارِ دو جہاں صلعم کے حضور میں حاضر ہو کر اپنا دردِ دل بیان کیا ہے۔ بالفاظِ دگر، اب اقبال ہاتھ باندھے ہوئے، نگاہیں نیچی کئے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے، زبان سے درود پڑھتے ہوئے دل میں جذبات کا طوفان دبائے ہوئے سب سے بے تعلق ہو کر ایک محویت کے عالم میں سرکارِ دو جہاںؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور مواجہہ شریف میں بیٹھ کر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ حضورؐ! آپ کا نام لیوا مسلمان جو کسی زمانہ میں ربع مسکوں پر حکمران تھا۔ جس کے اندر بادشاہی میں فقیری کا رنگ پایا جاتا تھا۔ وہی مسلمان آج مردہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ اس کا سینہ آپ کی محبت سے خالی ہے

چونکہ مسلمان نے اپنے دل کو حیات کے سرچشمہ سے منقطع کر دیا ہے اس لئے

اس کا دل قدرتی طور پر مصروف نالہ و فریاد رہتا ہے لیکن وائے برحالِ او کہ وہ یعنی وہ مسلمان یہ نہیں جانتا کہ اس کا دل کیوں خون کے آنسو رو رہا ہے۔

اے میرے آقا! میری التجا کرتا ہوں کہ آپؐ اُس نادان بلکہ ظالم اور جاہل مسلمان کے حال پر ایک نگاہ کرم فرمائیں تاکہ وہ زندہ ہو سکے۔

نوٹ:۔ میں طلبہ کی سہولت کے لئے مطلب تو بیان کر دوں گا لیکن ان رباعیات میں مستی اور سوز کی جو کیفیت پوشیدہ ہے اسے لفظوں کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور اگر طلبہ اس کیفیت سے آگاہ نہ ہو سکے تو وہ منشی تو (؟) ہو سکتے ہیں لیکن روح اقبال سے آشنا نہ ہو سکیں گے:

پہلی رباعی بر ۳۹

مطلب:۔ عرض کرتے ہیں کہ آپؐ کی محبت کی آگ سے میرا سینہ روشن ہے اور آپؐ کے فیضان روحانی ہی کی بدولت میری شاعری کا بازار گرم ہے۔ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ آج سارے ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو آپؐ کی شان اور آپؐ کے مقام سے حقیقی معنی میں آگاہ ہو۔

دوسری رباعی بر ۳۹

مطلب:۔ عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہندوستان کے مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کی مصیبتوں کے ازالہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یا رسول اللہ! ہم غلاموں پر اک نگاہ کرم فرمایئے۔ کیونکہ ایشیائی ممالک میں کسی ملک کے مسلمان ہم سے زیادہ مبتلائے مصائب نہیں ہیں:

پہلی رباعی بر صفحہ

مطلب: - یا رسول اللہ! مسلمان اگرچہ اپنی ذات کے اعتبار سے بہت بلند مرتبہ ہے لیکن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ذلیل اور گرفتار آفات ہے۔ اب خدا ہی اس کی مدد کرے تو اصلاح حال ہو سکتی ہے کیونکہ صدیوں تک حکمرانی کرنے کے بعد اب غلامی میں مبتلا ہو گیا ہے:

دوسری رباعی بر صفحہ

حل لغات: - نہاں یعنی قلبی کیفیت۔ کنایہ ہے ایمان و یقین کے فقدان سے: آشکار: بمعنی ظاہری حالت:۔ کنایہ ہے غلامانہ زندگی اور ذلت و خواری سے جو غلامی کا منطقی نتیجہ ہے: روداد دو صد سال، یعنی ہندی مسلمانوں کی گذشتہ دوسو سال کی تاریخ، تاریخدان اصحاب سے مخفی نہیں ہے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ ایرانی نے دلی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت مغلیہ لاشہ بے جان ہو کر رہ گئی اور اس کے بعد ہندی مسلمانوں پر آفات ارضی و سماوی کے نزول کا جو سلسلہ قائم ہوا تو ابھی تک منقطع نہیں ہوا ہے: کندہ قصاب لکڑی کا بُندہ جس پر قصاب گوشت کوٹتا ہے۔ جو شخص ہندی مسلمانوں کی گذشتہ دوسو سال کی تاریخ کا مطالعہ کریگا یقیناً اس کا دل کندۂ قصاب بن جائیگا ان تصریحات کو مدِنظر رکھ کر رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ

حل لغات: - گنج خیام یعنی اتفاق کہ مسلمانوں پر مصائب کا نزول مسلسل

ہو رہا ہے : دُور از مقام یعنی مسلمان ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں : کارِ بے نظام یعنی مسلمانوں کی حیات اجتماعیہ بالکل غیر منظم ہے اور اس کی وجہ چوتھے مصرعہ میں بیان کردی ہے کہ ملت بے امام ہے یعنی کوئی ایسا رہنما موجود نہیں ہے جس پر سارے مسلمان متفق ہو سکیں۔ قوم کا عروج وحدتِ کردار پر موقوف ہے اور وحدتِ کردار اس وقت پیدا ہو سکتی ہے، جب وحدۃ خیال موجود ہو۔ اور وحدۃ خیال اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب سارے مسلمان کسی ایک شخص کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں :

دوسری رباعی بر ص۱۴۳

مطلب :۔ یارسول اللہ! چونکہ مسلمان کا دل آپ کی محبت سے خالی ہو چکا ہے اسلئے نہ اس کے اندر جوش اور ولولہ ہے نہ شوقِ جہاد ہے! اور نہ اس کی کوشش بار آور ہوتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ نہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے نہ جیب میں زر و مال ہے۔ اس کا گھر ویران ہو چکا ہے۔ قرآن مجید اس کے ویران گھر کے طاق میں بے شک رکھا ہوا ہے لیکن وہ اس کا مطالعہ نہیں کرتا، محض حصولِ برکت کیلئے رکھ چھوڑا ہے۔

پہلی رباعی بر ص۱۴۴

حل لغات :۔ اسیرِ رنگ و بو یعنی مسلمان دنیاوی لذتوں کے حصول میں منہمک ہے : تہی از ذوق یعنی اس کا دل آپ کی محبت سے خالی ہے : صفیرِ شہباز سے مسلمانوں کی تلقینِ حق مراد ہے : کم شناسد یعنی وہ اسلام کے پیغام کو قبول نہیں کرتا : طنینِ پشہ۔ مچھر کی نہل آواز یا بھنبھناہٹ مراد ہے

دُنیا پرستوں کا مشورہ :

دوسری رباعی نمبر ۴۲

حل لغات:۔ دردل ناکشادہ یعنی مسلمان روحانیت اور عشق الٰہی کے جذبہ سے بیگانہ ہے: خودی سے مراد ہے یہ احساس کہ میں دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوں۔ یہ تصوّر مسلمان کے دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوتا: بانگِ تکبیر سے مراد ہے اللہ تعالےٰ کی عظمت اور حاکمیت کا یقین: حریم ذکر سے مراد ہے خدا تعالیٰ کی محبت: از پا فتادہ یعنی محبت کا جذبہ فنا ہوچکا ہے:

پہلی رباعی نمبر ۴۳

حل لغات: گریباں چاک یعنی آفات و بلیّات میں محصور ہے یا ذلیل و خوار ہے: بے فکر رفو: یعنی اصلاح حال کے لئے کوشاں نہیں ہے یا اپنی بہبود سے غافل ہے: بے آرزو: یعنی مسلمان اللہ کی محبت کے جذبہ سے بیگانہ ہے۔ واضح ہو کہ آرزو اقبال کے تمام فلسفیانہ افکار کا محور ہے۔ آرزو سے اُن کی مراد ہے محبوبِ حقیقی کے حصول کی آرزو۔ اور اسی آرزو کی خاطر وہ استحکام خودی کا درس دیتے ہیں کیونکہ حصول آرزو کے لئے خودی کی پختگی شرط اولین ہے۔ اقبال کی رائے میں مسلمانوں کے زوال کا باعث اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کے دل آرزو یعنی سرکار دو عالم صلعم کی محبت سے خالی ہو گئے ہیں۔ اس نکتہ کی آئندہ اوراق میں مزید وضاحت پیش کروں گا: نصیب بمعنی حصہ یا وہ شئے جو کسی کے لئے معین کردی جائے: مرگِ ناتمام:۔ یہ بھی اقبال کی مصطلحات میں سے ہے بلفظی معنی ہیں ناقص موت یا وہ موت جو مرتبۂ تکمیل کو نہ پہنچے لیکن اس سے ان کی مراد ہے مسلمان کی وہ حالت جبکہ وہ نہ زندہ ہو نہ مردہ چنانچہ اقبال کی رائے میں ایک عرصہ سے مسلمان اسی حالت کا مصداق ہے وہ اس طرح کہ:۔

(الف) سائنس نے رہا ہے، چلتا پھرتا ہے، انگریزوں کی غلامی کر رہا ہے اور یہ سب باتیں زندگی پر دلالت کرتی ہیں۔ مُردہ غلامی نہیں کر سکتا۔

(ب) جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرتا، تلقین حق وصبر نہیں کرتا، قرآن کا پیغام غیر مسلموں کو نہیں سُناتا، اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی دولت خرچ نہیں کرتا۔ یہ سب باتیں موت پر دلالت کرتی ہیں۔ بے اللہ ہو زیست :- یعنی جو مسلمان اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا، وہ اقبالؔ کی رائے میں زندہ نہیں ہے بلکہ موت کے پنجہ میں گرفتار ہے۔

نوٹ :- میں نے اس کتاب میں (اور دوسری کتابوں میں بھی) کسی جگہ اللہ کی محبت کو مقصدِ حیات قرار دیا ہے اور کسی جگہ رسول اللہ کی محبت کو۔ دراصل یہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ ذیل میں اسکی وضاحت کئے دیتا ہوں۔

(الف) واضح ہو کہ مقصودِ مومن تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہے۔ لَا شَکَّ فِیْہِ۔ لیکن کوئی انسان، اتباعِ رسولؐ کے بغیر اُس ذاتِ پاک تک پہنچ نہیں سکتا۔ اس لئے

(ب) حصولِ مقصد کے لئے اتباعِ رسول شرط ہے، لیکن اتباع بغیر محبت ناممکن ہے۔ اس لئے محبتِ رسولؐ، شرطِ حصولِ مقصد ہو گئی۔

(ج) لیکن محبتِ رسولؐ، صحبتِ عاشقانِ رسولؐ کے بغیر محالِ عقلی تو نہیں ہے۔ مگر محالِ عادی ضرور ہے۔ اسی لئے تو قرآن مجید نے صاف لفظوں میں حکم دیا ہے۔ "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" اے مسلمانو! راستباز انسانوں کی صحبت اختیار کرو۔

اسی لئے اقبالؔ نے یہ کہا ہے :-

دل ز دیں سرمایۂ سر قوت است ۔۔۔ دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است

دوسری رباعی ابر صـــ۳۲

حل لغات :- حق آں دہ۔ یعنی اے میرے آقاؐ! آپ اس شخص کا حق اس کو

عنایت فرمائیں کہ مسکین و اسیر است۔ جو مسکین بھی ہے اور اسیر بھی ہے یعنی اس وقت ہندی مسلمان مسکین بھی ہے اور اسیر بھی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ :۔

(ل) مسکین بمعنی مفلس و بے نوا یا محروم از نعمائے زندگی۔

(ب) مسکین بمعنی محروم از دولتِ عشقِ رسولؐ۔

(ل) اسیر بمعنی اسیر ہوا و ہوس۔

(ب) اسیر بمعنی اسیرِ فرنگ۔

واضح ہو کہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید کی ایک آیت سے ماخوذ ہیں۔ غیرت اور دیر میر است۔ یعنی اگرچہ مسلمان میں بے غیرتی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، لیکن ابھی یہ رنگ پختہ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ اسلام سے نسبت اسمی کی بناء پر غیرت کا یہ رنگ بآسانی زائل نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ "دیر میر" بھی اقبال کی اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں "سخت جان" چنانچہ کہتے ہیں :۔

چارۂ مرگ اندر پئے ایں دیر میر
سُود خوار و والی و مُلّا و پیر

مراد یہ ہے کہ اسلام نے مسلمان کے اندر غیرت کا مادہ اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے کہ انگریزوں کی غیرت کُش تعلیم کے باوجود ابھی تک فنا نہیں ہوا ہے۔ در میخانہ بستند۔ یعنی جب مسلمان نے غیر اسلامی زندگی (انگریز کی غلامی) گوارا کر لی۔ تو کارکنانِ قضاء و قدر نے سُنّۃ اللہ کے مطابق میخانہ کا دروازہ اُن پر بند کر دیا یعنی وہ فیضانِ سماوی اور آپؐ کی نگاہِ التفات دونوں سے محروم ہو گیا۔ دریں کشورے سے اقبال کی مراد تو ہندوستان تھی لیکن اب ناظرین اس ملک کے ساتھ "دولتِ خداداد" پاکستان کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ سکتا تھا۔ لیکن "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز"۔ تشنہ میر است لفظی معنی تو یہ

ہیں کہ اے میرے آقا! ہندوستان اور پاکستان کا مسلمان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے پیاس کے مارے مر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محض اسلئے ذلیل و خوار ہے کہ آپ کی نگاہ کرم سے محروم ہے۔ اس لئے آپ اس مسکین، اسیر، فقیر، دلگیر اور تشنہ کام پر نگاہِ کرم فرمائیں۔"

نوٹ:۔ان رباعیات سے شائقین کلام اقبال کو اس حقیقت کا بخوبی علم حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ "برہمن زادہ" "رمز آشنائے روم و تبریز" ہی نہ تھا بلکہ اس کے دل میں قوم کی ایسی محبت بھی کارفرما تھی جس کی نظیر راقم الحروف نے اگر اپنی جمہل زندگی میں دیکھی تو صرف جنت آشیانی مولانا محمد علی کی زندگی میں۔

نیز راقم الحروف کی ملاقات ایک ایسے شخص سے بھی ہوئی تھی جس نے یہ بیان کیا کہ میں نے بچشم خود اقبال مرحوم کو قوم کے غم میں نصف شب سے لے کر فجر کی نماز تک مسلسل رونے دیکھا ہے۔ چونکہ مرحوم کی تصانیف ان کے عشقِ قومی پر شاہد ہیں اس لئے میں نے اس روایت کے اندراج کی جرأت بھی کی ورنہ اس دورِ مادیت میں جبکہ عورت قوم کے اعصاب پر سوار ہے، عشقِ قومی کا تذکرہ سرودِ بے ہنگام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

راقم الحروف نے ان باتوں کی صراحت اس لئے کی ہے کہ اسکی رائے میں اقبال مرحوم کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ ان کو سرکارِ دو عالم کی اُمت سے بے پناہ محبت تھی۔ اس سیہ کار راقم الحروف نے بچشم خود انہیں ملت کے غم میں اشکبار دیکھا ہے، کاش! یہ غم کسی طرح عام ہو جاتا۔ کاش! ہر فرد اقبال اور محمد علی ہو جاتا۔ اگر علماء اور صوفیاء کے اندر ملت کا غم پیدا ہو جائے تو بلاشبہ قوم کا ہر فرد اقبال اور محمد علی ہو سکتا ہے لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

پہلی رباعی نمبر ۲۴

حل لغات:- دگر بمعنی از سرِ نو: آب و گل او کنایہ ہے مسلمان کی زندگی سے جہانے آفریں۔ اس کے دل میں جہانِ آرزو یعنی تبلیغ و اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا کر دیجئے: ہوا تیز واست، یعنی مسلمان چاروں طرف سے مشکلات میں محصور ہے یا اس وقت اس کی دینی زندگی خطرہ میں ہے: بیندیش۔ یہ بہت بلیغ کلام ہے یعنی اقبالؔ، سرکارِ دو عالمؐ سے عرض کرتے ہیں۔ کہ حضورؐ! اگر اس وقت آپ نے قوم کی دستگیری نہ فرمائی تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی ملّی ہستی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ یہ مختصر جملہ، جو بظاہر ایک لفظ ہے، اقبالؔ کے اضطراب درونی کا آئینہ دار ہے، جس طرح سرکارِ دو عالمؐ نے جنگِ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کی تھی کہ "اے خدا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مغلوب ہو گئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ تو قیامت تک نہ پوجا جا سکیگا۔" اسی طرح اقبالؔ عالمِ اضطراب میں سرکارِ دو عالمؐ سے عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقاؐ! اگر اس وقت آپؐ نے دستگیری نہ فرمائی تو مجھے اندیشہ ہے کہ موجودہ مسلمان قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگی: چراغ بسمل:- یہ بھی بہت بلیغ ترکیب ہے۔ چراغ کنایہ ہے مسلمان قوم سے اور بسمل کنایہ ہے چراغ کے ٹمٹمانے سے۔ یعنی مسلمان قوم کی ہستی معرضِ خطر میں ہے: بدامانش دو صد چاک: کنایہ ہے قوم کے اندرونی اختلافات سے یعنی صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت اشتراکیت ملوکیت، مادیت اور وطنیت چار زبردست دشمن اسلام کے خلاف صف آراء ہیں لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان میں اتحاد قطعاً نہیں ہے۔ سیاسی اتحاد کے فقدان کے علاوہ خود ہر ملک کے مسلمان مختلف فرقوں میں منقسم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس وقت آپؐ نے حفاظت کا بندوبست نہ فرمایا تو یہ چراغ جو دل نہیں

سے تمہارا رہا سہے گُل ہو جائے گا۔

دوسری رباعی بر ۴۴

حل لغات: عروسِ زندگی۔ زندگی کی دلہن یعنی زندگی۔ در خلوتش: ش کا مرجع، مسلمان ہے، عروس کی رعایت سے خلوت کا لفظ استعمال کیا ہے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی زندگی اور مسلمان، دونوں میں مغایرت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی مسلمان اسلامی زندگی سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اس کا سبب بیان کیا ہے۔ **مقامِ نیستی**۔ تصوف کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے وہ حالت جب سالک کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی شئی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ بلکہ خود سالک اپنی تمام خواہشات نفس کو فنا کر دیتا ہے اور اپنی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔ یہ نیستی از روئے شرع محمود ہے لیکن اقبال نے اس مصرعہ میں اس لفظ کو، اس معنی میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس سے یہ مراد لی ہے کہ مسلمان کا وجود اور عدم دونوں برابر ہو گئے ہیں یا اس کی ہستی کالعدم ہو گئی ہے۔ سیر بھی تصوف کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے سالک کا روحانی سفر جس میں وہ مختلف منازل طے کرتا ہے۔ **پیش از مرگ در قبر** یعنی مسلمان کی حالت اس وقت یہ ہے کہ وہ موت سے پہلے قبر میں داخل ہو چکا ہے۔ نکیرین واضح ہو کہ جب مردہ قبر میں رکھا جاتا ہے تو منکر اور نکیر دو فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے ہی دو فرشتے مسلمان پر مسلط ہو گئے ہیں ایک کلیسا یعنی انگریز ہے، دوسرا دیر یعنی ہندو ہے۔

بنیادی تصور: یہ ہے کہ چونکہ مسلمان نے اپنی خودی کو فنا کر دیا ہے اسلئے زندگی سے محروم ہو گیا ہے اور اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز اور ہندو کے پنجہ میں گرفتار ہے۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۵۴

حل لغات :- بچشم او نہ نور و نے سرور۔ نور سے فراستِ مومنانہ مراد ہے اور سرور سے وہ قلبی کیفیت مراد ہے جو عشق سے پیدا ہوتی ہے :: ناصبور یعنی بے قرار یعنی اس کے دل میں اسلام کی محبت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بے قرار نہیں ہے :: مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ اس کے دل میں تبلیغ و اشاعت اسلام کی تڑپ پائی جاتی ہے :: خدا آں اُمتے الخ :- یہ محاورہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم کا اللہ ہی مالک ہے :: جانِ بے حضور سے غیر اسلامی زندگی یا ایمان باللہ کا فقدان مراد ہے یعنی مسلمان ایمان و یقین سے محروم ہے اور اسی لئے بحیثیت قوم فنا ہو چکا ہے ::

دوسری رباعی بر صفحہ ۵۴

حل لغات : مسلمان زادہ و نامحرم مرگ : یعنی کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اگرچہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں لیکن موت سے ڈرتے ہیں! بات یہ ہے کہ مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا ہے

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی جان، جنت کے عوض، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرچکا ہے۔ لیکن آج کل یہ کیفیت ہے کہ وہ ہر وقت (نامِ مرگ) موت کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے اور اگر جھوٹوں کو یہ سُن لیتا ہے کہ لڑائی کا اندیشہ ہے تو لاہور سے بھاگنا شروع کر دیتا ہے :: دلے در سینۂ الخ: یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے سینہ میں دل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے یہ دو چیزیں پائی جاتی ہیں ::

(۱) دمِ گسستہ یعنی بزدلی اور گھبراہٹ (۲) غمِ مرگ یعنی موت کا ڈر۔

پہلی رباعی بر ص۴۶

حلِ لغات:۔ ملوکیت سے امپیریلزم مراد ہے یعنی وہ نظامِ حکومت جس میں اقتدارِ اعلیٰ یا تو کسی فرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے جیسے افغانستان یا سعودی عرب وغیرہ یا بادشاہ تو برائے نام ہوتا ہے اور اقتدارِ اعلیٰ چند افراد کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ افراد، انسانوں کو غلام بنا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بجائے خود مطاع بن جاتے ہیں اور اس کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی اور اس کے قانون کے بجائے اپنا قانون نافذ کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانوں کی حالت حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے ملوکیت کو مذموم و مردود بلکہ حرام قرار دیا ہے اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ عرب کے مسلمان لحمِ خنزیر سے تو اجتناب کرتے ہیں لیکن ملوکیت کو گوارا کرتے ہیں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ کیا یہ عرب، انہی عربوں کی اولاد ہیں۔ جنہوں نے قیصر اور کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے تھے اور بھری محفل میں فاروقِ اعظمؓ سے دریافت کیا تھا کہ "تمہارے حصہ میں جو کپڑا آیا تھا وہ تو چھوٹا سا تھا، پھر تمہاری قمیص کیسے بن گئی؟"۔ شیشہ بازی: بمعنی شعبدہ بازی یا مکاری، دھوکہ، فریب اور عیاری۔ میری رائے میں ملوکیت سے بڑھ کر کوئی لعنت اس دُنیا میں نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو اُسے ملوکیت کے پنجۂ خونیں میں گرفتار کر دیتا ہے۔ مثلاً جب مسلمانوں نے حضرت عثمانِ غنیؓ کو شہید کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے بنو اُمیّہ کو اُن پر مسلّط کر دیا۔ رومی سے ترکی قوم مراد ہے، جس نے اگرچہ یورپ کو خوش کرنے کے لئے لادینی طرزِ حکومت اور لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے تاہم مغربی اقوام کی نگاہ میں اس کی کوئی عزت نہیں ہے اگرچہ بظاہر آزاد ہے لیکن بباطن امریکہ کے زیرِ اثر ہے

حجازی سے عربی قوم مراد ہے اور یہ بھی خیر سے امریکہ کے زیر اثر ہے۔ غم یاراں بگویم :۔ بڑی بلیغ ترکیب ہے، یعنی اے میرے آقا اور مولیٰ! میں آپ کی بارگاہِ عالیہ میں اپنی قوم کی روداد غم و الم بیان کرتا ہوں۔ وہ روداد تو بڑی طویل ہے لیکن اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ اِس وقت تمام دُنیائے اسلام از مراکش تا پاکستان، اینگلو امریکن بلاک کے زیرنگیں ہے۔ بامیدیکہ وقتِ دل نوازی است یعنی مسلمانوں پر بہت مشکل وقت آپڑا ہے اس لئے میں آپ سے نگاہِ کرم کا ملتجی ہوں۔

نوٹ :۔ راقم الحروف کے عقیدہ کے مطابق سرکار دو عالم صلعم تو ہر وقت ہماری دستگیری کے لئے آمادہ ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ مریض اپنے علاج کے لئے یثرب کے بجائے لندن جا رہا ہے:

دوسری رباعی بر ۱۷۰

مطلب :۔ اے میرے آقا! موجودہ زمانہ کے مسلمان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کا جسم تو مضبوط ہے، وہ جسمانی اعتبار سے بالکل درست ہے لیکن اس کی خودی ضعیف اور ناکارہ (رعشہ دار) ہوچکی ہے۔ اس لئے ہر قسم کی ذلت میں مبتلا ہے۔

بنیادی تصوّر :۔ مسلمان کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے:

پہلی رباعی بر ۱۷۱

حل لغات :۔ بے کلاہی بمعنی غلامی یا محکومی: فقر ش خانقاہی است :۔ اقبال کے یہاں فقر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فقر اسد اللٰہی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان سربکف ہوکر باطل کا مقابلہ کرتا ہے یا خالد جانبازؓ کی طرح باطل کو مٹا دیتا ہے یا امام حسینؓ کی طرح شہادت حاصل کرلیتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی رُو سے غازی

اور شہید دونوں کامیاب ہیں۔ دوسرا فقر خانقاہی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ مسلمان حجرہ میں بیٹھ کر یا تو قوالی سنتا ہے "یا اللہ ہو" کے نعرے لگاتا ہے لیکن جہاد فی سبیل اللہ سے جان چُراتا ہے:

فقرِ کافر خلوتِ دشت و دراست
فقرِ مومن، لرزہ در بحر و براست

مطلب:۔ اے میرے آقا! آج مسلمان محکومی اور غلامی کی وجہ سے بڑی ذلیل زندگی بسر کر رہا ہے، دینی اعتبار سے مردہ ہو چکا ہے اور اُس نے وہ تصوف اختیار کر لیا ہے جو سراسر غیر اسلامی ہے جس نے اُسے ذوقِ جہاد سے بالکل بیگانہ کر دیا ہے وہی مسلمان جو بادشاہوں کی اولاد میں سے ہے آج گدایانہ رنگ میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے:

دوسری رباعی بر ۱۴۷

مطلب:۔ حضور! مسلمان کی حالت زار کا کیا حال بیان کروں۔ اس پر ہر طرف سے نحوست کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ وہ مسلمان جو کل تمام دنیاوی راحتوں کا مالک تھا۔ آج اُسے دو وقت روٹی بھی میسر نہیں ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۴۸

حل لغات:۔ وانمودم زندگی را یعنی میں نے اُسے زندگی کے حقائق سے آگاہ کر دیا ہے: نکتہ فردا و دی سے گذشتہ اور آئندہ حالات کی تفصیل مراد ہے یعنی جیسا ماضی ہوگا ویسا ہی مستقبل بھی ہوگا: اسرارِ جان یعنی زندگی کی حقیقت یا کامیابی کے اصول: نطق عرب:۔ چونکہ عرب کے لوگ فصاحت میں ممتاز ہیں اسلئے نطقِ عرب سے

فصاحت مراد ہے۔

دوسری رباعی بر ص ۴۸

حل لغات:۔ بے خیل وسپاہ یعنی اگرچہ اس وقت مسلمان ذلیل وخوار ہے۔ ضمیر بادشاہ یعنی اس کے اندر حکومت کی صلاحیت موجود ہے۔ سفا منش باز بخشند یعنی اگر وہ اپنی حقیقت یا اصلیت سے آگاہ ہوجائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تو دنیا میں حکومت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جمال او جلال بے پناہ است یعنی اس کی زندگی میں سروری رنگ پیدا ہوسکتا ہے۔ جمال سے اسلامی زندگی مراد ہے اور جلال سے حکمرانی مراد ہے یعنی اگر وہ حقیقی معنی میں مسلمان ہوجائے تو حکومت کر سکتا ہے۔

پہلی رباعی بر ص ۴۹

حل لغات:۔ متاعِ شیخ۔ لفظی معنی شیخ کی پونجی، لیکن اس سے مراد ہے مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کا مبلغ علم وفن۔ اساطیر کہن۔ پرانی غیر معتبر داستانیں۔ اساطیر جمع ہے اسطورہ کی۔ اسی سے انگریزی لفظ "اسٹوری" بنا ہے۔ اساطیر کہن سے وہ علوم وفنون مراد ہیں جو اس زمانہ میں پایۂ اعتبار سے ساقط ہو چکے ہیں۔ حدیثِ او یعنی اس کی گفتگو یا تعلیم۔ تخمین بمعنی اٹکل یا قیاس۔ ظن بمعنی گمان یا غیر یقینی بات۔ ظن کے بہت سے معانی ہیں۔ یہاں اقبال نے اس لفظ کو یقین کی ضد کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ زنار دار۔ سے مراد یہ ہے کہ اس کے عقائد میں مشرکانہ خیالات کی آمیزش ہوگئی ہے۔

مطلب:۔ اے میرے اللہ! مسلمانوں کے دینی پیشواؤں (ملا اور صوفی) نے

اپنی غفلت اور نادانی کی بناء پر اسلام میں اس قدر غیر اسلامی عقائد داخل کر دیئے ہیں کہ اب اسلام اور کفر میں امتیاز کرنا مشکل ہے چنانچہ حرم تو دیر (بتخانہ) سے مشابہ ہے اور خود شیخ پر برہمن کا دھوکا ہوتا ہے :۔

بنیادی تصور:۔ دینی پیشواؤں کی غفلت پر ماتم کیا ہے۔

دوسری رباعی پر ص۹۴

حل لغات:۔ دگرگوں کرد:۔ انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ لادینی:۔ یہ اقبال کی ایک جامع اصطلاح ہے جو کفر و شرک الحاد، مادہ پرستی، وطنیت، قومیت، ملوکیت سرمایہ داری، اشتراکیت، جمہوریت اور تمام ان تصورات پر حاوی ہے جو قرآن حکیم کی تعلیمات کے خلاف ہیں :۔ زنانا بیدان الخ بڑا بلیغ مصرعہ ہے یعنی لادینی کی تمام صورتوں میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اس دور کے لادین حضرات (خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں) روح کو مادہ سے بالاتر غیر مادی حقیقت تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ روح بھی مادہ ہی کی ایک شکل ہے۔ اگرچہ اعلیٰ قسم ہے۔ واضح ہو کہ روسی اشتراکیت اس نظریہ کی اس زمانہ میں سب سے بڑی علم بردار ہے۔ کارل مارکس کا فلسفہ اسی "عقیدہ" پر مبنی ہے :۔

مطلب :۔ اے میرے آقا! اس زمانہ میں مادہ پرستی برسر عروج ہے اور تمام مادہ پرست خواہ وہ ہابز کے پیرو ہوں یا مارکس کے، سب یہ کہتے ہیں کہ انسان صرف سالمات مادی کے امتزاج کا نام ہے۔ روح بھی مادہ ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے جو جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے اس لئے نہ کوئی خدا ہے نہ معاد نہ جزاء و سزا نہ حیات بعد الموت۔

چونکہ یہ عقیدہ، ملت اسلامیہ کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتا ہے اسلئے

میں آپؐ سے ملتجی ہوں کہ آپؐ اس "آسودہ جان" عیش پسند اور غفلت شعار مسلمان کے دل میں سوزِ عشق (فقر) پیدا کر دیں جو آپؐ نے افضل البشر بعد الانبیا حضرت صدیق اکبرؓ کے دل میں پیدا کر دیا تھا: تاکہ وہ اس فتنۂ عظیمہ کا مقابلہ کر سکے:

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ اگر مسلمان، اشتراکیت اور وطنیت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرنی چاہیے اور یہ شان صرف عشقِ رسولؐ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

نوٹ:۔ راقم الحروف کو بعض اوقات اپنی قوم کے افراد پر تعجب ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سا عشق تو اپنے اندر پیدا نہیں کرتے اس کے باوجود دنیا میں اسلامی حکومت یا خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں:

پہلی رباعی نمبر ۵

حل لغات:۔ حرم سے اسلام اور دیر سے کفر مراد ہے: گیرد رنگ دیر یعنی مسلمانوں کے عقائد میں مشرکانہ خیالات کی آمیزش ہو گئی ہے: شیخ ما یعنی ہمارا پیشوا: پیر کلیسا کا فت۔ تحقیر کے لئے ہے یعنی اگرچہ بوڑھا ہو گیا ہے لیکن عقلِ سلیم سے محروم ہے: ژولیدہ مو لغوی معنی وہ شخص جس کے بال پریشان یا الجھے ہوئے ہوں، مراد ہے بے ربطی افکار یا خیالات کی الجھن (جس میں آجکل کے لیڈر مبتلا ہیں خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی)۔ دربرما۔ لغوی معنی ہماری آغوش میں، مراد ہے مسلمانوں کی جماعت سے یعنی ہماری قوم میں: ہر دش زنوہ آرزو یعنی کسی مسلمان کے ۔۔۔۔ دل میں آپؐ کی محبت نہیں ہے: مطلب بالکل واضح ہے۔

بنیادی تصور:۔ ان رباعیات میں اقبال نے مسلمانوں کی مشرکانہ زندگی اور

کا فرانہ خیالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے ۱۹۰۷ء سے اپنی قوم کی دینی زندگی کا مطالعہ شروع کیا اور کامل تیس ۳۰ سال کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ:-

مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد
جہاں گردیدم و او را ندیدم

دوسری رباعی نمبر ۵

حل لغات:- فقیراں: وہ مسلمان جن میں شان فقر باقی باقی تھی۔ یہاں فقیراں سے وہ فقیر مراد نہیں ہیں جو مسجدوں میں جوتے چرانے اور درگاہوں میں بھیک مانگتے جاتے ہیں بلکہ یہاں شہنشاہاں الخ یعنی ان مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ آں آتش: کنایہ ہے رنگ فقر سے جو عشق رسول سے پیدا ہوتا ہے۔ درگاہ: درگاہ، دین کے مزارات۔ لیکن یہ لفظ اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے بزرگان دین کے مزارات پر حاضری مراد نہیں ہے۔ کیونکہ وہ معیوب نہیں ہے۔ اقبال خود ساری عمر یہ کام کرتے رہے۔ آخری مرتبہ ۱۹۳۴ء میں سرہند شریف گئے تھے) بلکہ وہ ذہنیت مراد ہے۔ جو مسلمان کو بے عملی کا درس دیتی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے باز رکھتی ہے۔ خزیدن: کثیر المعانی لفظ ہے۔ رینگنا، چھپ جانا، سر کے بل کھسکنا وغیرہ۔ مطلب بالکل واضح ہے کہ جب تک مسلمانوں میں شان فقر باقی رہی وہ جہاد کرتے رہے لیکن جب عشق رسول کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تو درگاہوں میں پوشیدہ ہو گئے تاکہ دن کو "قوالی" سن سکیں اور رات کو رقص و سرود کا لطف اٹھا سکیں۔

چونکہ یہ تلخ حقیقت سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔ اس لیے تفصیل بیکار ہے۔

بنیادی تصور:- مسلمانوں کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے۔

پہلی رباعی بر حاشیہ

حل لغات:۔ بخویشاں در ستیز ند۔ یعنی آپس ہی میں لڑ رہے ہیں: نفاق یعنی دوئی سے اختلاف مراد ہے: بنالند۔ ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں: خشتے بگیرد۔ لغوی معنی ہیں اگر کوئی شخص ایک اینٹ نکال لے کنایہ ہے انہدام سے: خود از مسجد گریزند یعنی جس مسجد سے وہ خود بیزار ہیں جس میں وہ خود کبھی نہیں جاتے:

مطلب تو بالکل واضح ہے لیکن اتنی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس رباعی میں اقبال نے مسجد شہید گنج (جسے عبداللہ بیگ نے ۱۷۲۲ء میں تعمیر کرایا تھا) کے انہدام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس مسجد کو لاہور بلکہ پنجاب کے سکھوں نے حکومت برطانیہ کے نمائندے یعنی گورنر پنجاب کی تائید اور حمایت سے برطانوی سنگینوں کے زیر سایہ ۸ جولائی ۱۹۳۵ء کو شہید کیا تھا۔ لیکن مسلمان اس حادثہ فاجعہ کے موقع پر بھی متحد نہ ہو سکے بلکہ ایک جماعت جو اُس وقت مسلم لیگ اور قائد اعظم مرحوم کو گالیاں دینا مذہبی فریضہ سمجھتی تھی۔ اپنے طرز عمل سے دشمنانِ ملت کو تقویت پہنچا رہی تھی۔ میں اس شرح میں چونکہ مسلمانان پنجاب کی سیاسی اور مذہبی تاریخ نہیں لکھ سکتا۔ اسلئے یہیں قلم روکتا ہوں۔ طلباء اور شائقین ان دلخراش واقعات کی روشنی میں اس رباعی کو پڑھیں تو چاروں مصرعے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں:

دوسری رباعی بر حاشیہ

حل لغات:۔ بغیر اللہ سجودیم۔ یعنی ہم نے انسانوں کو سجدہ کرنا و اطاعت کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے: سجودن۔ لغوی معنی گھسنا۔ مراد ہے سجدہ کرنا: گبر لغوی معنی مجوسی یا آتش پرست: لیکن کافر مشرک یا بت پرست کو بھی کہہ سکتے ہیں: تا الم اذ

کسے یعنی ہمیں غیروں سے کوئی شکایت نہیں ہے: شایانِ شان تو ہے یعنی جب ہم مسلمانوں نے کافروں کا شیوہ اختیار کر لیا تو پھر ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم آپؐ کی امت میں ہیں؛ مطلب بالکل واضح ہے اور بنیادی تصور یہی ہے کہ مسلمان مسلمان نہیں رہے اپنے عقائد اور اعمال کی رو سے مشرک اور بت پرست ہو چکے ہیں

نوٹ: چونکہ انگریزوں نے ملازمتوں میں ہر قوم کا "کوٹا" مقرر کر دیا تھا۔ اس لئے ہم مجبور تھے کہ مردم شماری کے رجسٹروں میں اپنے آپ کو مسلمان لکھائیں۔ تاکہ ملازمت میں حصہ مل سکے:

پہلی رباعی بر ص ۵۲

حل لغات: میکشاں کنایہ ہے مسلمانوں سے: **ایاغ:** کہتے ہیں شراب کے بڑے پیالہ کو جس میں ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات میں بعض خوش قسمت لوگوں کو "عکس رخ یار" نظر آتا ہے: **خالی ایاغ است** کنایہ ہے اس بات سے کہ مسلمانوں کے سینے عشقِ رسولؐ سے خالی ہو چکے ہیں: **فراغ است ساقی بیکار** بیٹھا ہے۔ کنایہ ہے اس بات سے کہ مسجدیں اور مدرسے ویران ہیں یعنی جب مسلمانوں کو اللہ اور رسولؐ سے محبت نہیں ہے تو وہ مسجدوں کی طرف کیوں رخ کریں: **نگاہ دارم:** میں حفاظت کر رہا ہوں: **آہ** کنایہ ہے عشقِ رسولؐ سے: **اصل** اور اس کا منبع: **دود:** لغوی معنی دھواں، کنایہ ہے فیض سے: **آں چراغ:** کنایہ ہے ذات محمدیؐ سے جو حقیقۃ الحقائق اور منبع کرامات ہے۔ یعنی باعث تخلیق کائنات

بنیادی تصور: اقبال کی نگاہ میں سرکار دو عالم ﷺ سراج منیر (چراغ) ہیں اور مرکز عشق و محبت ہیں جیسا کہ آئندہ رباعی میں خود کہتے ہیں:-

ع جہاں از عشق و عشق از سینہ تست

دوسری رباعی نمبر ۵۲

حل لغات:۔ سبوئے خانقاہاں:۔ کنایہ ہے خانقاہوں کے شیوخ اور سجادہ نشینوں سے؛ خالی از مئے:۔ کنایہ ہے روحانیت اور معرفت کے فقدان سے؛ مکتب:۔ کنایہ ہے علماء سے؛ رہ طے کردہ را طے می کند۔ کنایہ ہے تحصیل حاصل سے، یعنی علماء خود کوئی تحقیق (ریسرچ) نہیں کرتے بلکہ قدماء کی تصانیف کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ بیسوی صدی میں بھی فیثا غورث، بیقراطیس افلاطون، ارسطو اور فلاطینس کی تقلید کر رہے ہیں، اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ کانٹ، اور ہیگل جیسے جلیل القدر متاخرین کے افکار بھی اوراق پارینہ بن چکے ہیں؛

مطلب:۔ اقبال نے اس رباعی میں صوفیاء، علماء اور شعراء پر تنقید کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قوم کا عروج زیادہ تر انہی لوگوں کی جدوجہد اور رہنمائی پر موقوف ہے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں حالت یہ ہے کہ خانقاہوں کے شیوخ (الا ماشاءاللہ) روحانیت سے معرا ہیں۔ علما تقلید کو دین گردانتے ہیں۔ وہ خود تو کوئی علمی تحقیقات کیا کرتے، تین سو سال پہلے کے نصاب تعلیم کو موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لئے کافی سمجھے بیٹھے ہیں۔ تقلید کا یہ عالم ہے کہ اس نصاب تعلیم میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اب رہے شعراء تو ان کا کلام مفید ہونے کے بجائے قوم کے حق میں افیون سے کم نہیں ہے؛

بنیادی تصور:۔ قوم کے رہنماؤں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے؛

پہلی رباعی نمبر ۵۳

حل لغات:۔ غریب بمعنی اجنبی؛ خاکدان بمعنی دنیا؛ دیگر۔ بار دیگر؛

غیراللہ سے غیر اسلامی نظام مراد ہے ؛ دُچارم :۔ برسرِ پیکار ہوں ؛

مطلب :۔ دُنیا کے لوگ دُنیا طلبی میں منہمک ہیں، ہر شخص مادیات میں گرفتار ہے ہیں چونکہ مسلمان ہوں اور دُنیا کو مقصودِ حیات نہیں بنا سکتا اس لئے ہر سوسائٹی اور ہر طبقہ میں غیر مقبول ہوں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ میں تنِ تنہا اس وقت غیر اسلامی نظام سے برسرِ پیکار ہوں۔ بے طاقت اسلئے ہوں کہ میری قوم میرے ساتھ نہیں ہے ؛

بنیادی تصور :۔ اس زمانہ میں اسلامی زندگی بسر کرنی بہت دشوار ہے ؛

دوسری رباعی بر ۱۵۳

حل لغات :۔ بال :۔ پر یا بازو ہ کنایہ ہے فراستِ مومنانہ سے جو حضورؐ سے محبت کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے ؛ پر بدم کنایہ ہے تلاش و جستجو سے ؛ نغمہ ہائے خود :۔ کنایہ ہے رنگِ عاشقی سے ؛ نپیدم :۔ کنایہ ہے عاشقانہ زندگی سے ؛ کہ مرگ از وے بلرزد :۔ جو موت سے نہ ڈرتا ہو بلکہ اس قدر بہادر ہو کہ خود موت اس سے ڈرے کہ اگر میں سامنے آجاؤں گی تو شاید میرا ہی خاتمہ ہو جائے گا ؛

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان اپنے صفات سے محروم ہو چکے ہیں کسی زمانہ میں مسلمان کی سب سے بڑی شناخت یہ تھی کہ وہ موت سے مطلق نہیں ڈرتا تھا لیکن آج ایسے مسلمان بالکل نایاب ہیں ؛

پہلی رباعی بر ۱۵۴

اس رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذلت و خواری کا باعث یہ ہے کہ وہ عشقِ رسولؐ کے جذبہ سے بیگانہ ہو گئے ہیں ؛

دوسری رباعی پر صفحہ ۵۴

حل لغات:۔ فرو تابان یعنی شان و شوکت ÷ چراغے و اشتم ÷ چراغ کنایہ ہے عشق رسول سے ÷ فسرد یعنی بجھ گیا یا گل ہو گیا یعنی عشق رسول کا جذبہ فنا ہو گیا دو صد سال میں اشارہ ہے ہندی مسلمانوں کی گذشتہ دو سو سال کی غلامی کی طرف مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان قوم عشق رسول یعنی سرچشمۂ حیات سے محروم ہو گئی اور اس محرومی کا نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔

نوٹ:۔ یہ سچ ہے کہ انگریزوں نے ہمیں عشق رسول سے بیگانہ کر دیا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے اُن کا کہنا کیوں مانا؟ مجھے اُن سے اس قدر گلہ نہیں ہے جس قدر اپنی قوم سے ہے۔ خود اقبال کا بھی یہی خیال ہے:۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہم اپنے دلوں کو تو بدلتے نہیں، سڑکوں اور باغوں کے نام بدل رہے ہیں۔ کاش! ہم سڑکوں کی بجائے اپنے آپ کو مسلمان بنا سکیں۔

پہلی رباعی پر صفحہ ۵۵

حل لغات:۔ نگہبان حرم کنایہ ہے یعنی مسلمانوں ÷ معمار دیر است یعنی کفر کی تائید کر رہا ہے ÷ یقین یعنی ایمان ÷ چشمش بغیر است یعنی اللہ پر بھروسہ کرنے کے بجائے، انسانوں پر بھروسہ کر رہا ہے ÷ انداز نگاہ یعنی طرز عمل ÷ نومید یعنی اللہ کی رحمت سے نا اُمید ہو چکا ہے ÷ مطلب واضح ہے۔ بنیادی نقطہ یہ ہے کہ جب مسلمان ایمان سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے نا اُمید

ہو جاتا ہے اور اس کو چھوڑ کر انسانوں کو اپنا حاجت روا سمجھنے لگتا ہے۔

دوسری رباعی بر ۵۵

حل لغات:۔ سوز کنایہ ہے عشق رسولؐ سے۔ فقیرہ نشین:۔ وہ مسلمان جو دُنیا سے بے تعلق ہو۔ ضمیر آتشیں سے عشق رسولؐ مراد ہے۔

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ جب تک دل میں ایمان نہ ہو مسلمان رحمتِ الٰہی کا اُمیدوار نہیں ہو سکتا۔

پہلی رباعی بر ۵۶

حل لغات:۔ گہے اُفتم الخ کنایہ ہے جدوجہد سے۔ چہ خوں بے تیغ الخ یعنی میں عقائد باطلہ کا رد کر رہا ہوں۔ عصر خویش سے وہ غیر اسلامی افکار مراد ہیں جو اس زمانہ میں عام ہو رہے ہیں۔ مثلاً اشتراکیت، مادیت، ملوکیت، سرمایہ داری وغیرہ۔ مطلب واضح ہے۔

دوسری رباعی بر ۵۶

حل لغات:۔ تنہائی سے مراد ہے غیر اسلامی ماحول اور افکار سے اجتناب۔ آہ و فغاں کنایہ ہے عشق رسولؐ سے۔ مکتب کنایہ ہے درسی علوم و فنون سے جو انسان کو جہاد سے بیگانہ کر دیتے ہیں۔ میخانہ شوق سے عاشقانہ زندگی مراد ہے۔

مطلب بالکل واضح ہے کہ مسلمان کو مکتب (دُنیا طلبی) کے بجائے میخانہ (دین طلبی) کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ کتابی علم مسلمان کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

تک نہیں پہنچا سکتا۔ صوفیا اور علماء مراقبہ اور مناظرہ تو کر سکتے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ نہیں کر سکتے ؛

پہلی رباعی بر ۵

حل لغات:۔ پر بدم: یعنی حرم سے روحانی فیض حاصل کیا : **دلپذیرش:** شین کا مرجع "حرم" ہے جس کی تصریح تیسرے مصرعہ میں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی، دعاؤں اور التجاؤں میں بسر کی ہے ؛ **پرم نم گشت:** یعنی میرے دل پر فیضان سماوی کا نزول ہوا ؛ **ابر مطیرش:** مطیر یعنی برسنے والا۔ مطر یعنی بارش ؛ **حرم در ضمیرمن فرو رفت:** جب میری ذہنیت بالکل اسلام کے سانچہ میں ڈھل گئی ؛ **سرودم:** یعنی میں نے اپنے کلام میں اسلام کی روح کھینچکر قوم کے سامنے پیش کی ہے۔ رباعی کا مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال سرکار دو عالم کی بارگاہ میں یہ رپورٹ پیش کر رہے ہیں کہ حضور! میں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے قوم کو اسلام کا پیغام سنایا ہے ؛

دوسری رباعی بر ۵

حل لغات:۔ بآں رازے کہ گفتم الخ: یعنی میں نے مسلمانوں کو قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے آگاہ کیا لیکن وہ اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوئے : **زشاخ نخل من الخ:** یعنی میرے کلام سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا ؛ **میر اُمم:** یہ سرکار دو عالم کا لقب ہے یعنی دُنیا کی تمام قوموں کے سردار ؛ **داد از تو خواہم:** یعنی قوم نے جو مجھ پر ظلم و ستم کئے ہیں، ان کی دادرسی کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ؛ **مرا بالی غزلخوانے الخ:** وہ ظلم یہ ہے کہ میری قوم نے مجھے محض ایک "وڈا" شاعر سمجھا ؛

نوٹ: یہاں میں حضرت اقبال مرحوم سے بادب اختلاف رائے کی جرأت کرتا ہوں بات یہ ہے کہ قوم، اگر اُن کے درخت سے کھجوریں کھاتی رہتی تو متنجن اور مزعفر کی رکابیاں جو لندن کے باورچیوں نے مسلمانوں کے لئے تیار کی تھیں، ہندو اور سکھ کھا جاتے اور حضرت اقبال یہ حقیقت فراموش کر گئے کہ جو مزہ متنجن میں ہے۔ وہ خالی کھجوروں میں کہاں؟ کہاں جگمگاتے ہوٹلوں میں زہرہ وشوں کی "سروس" کہاں کھجوریں توڑنے کی زحمت؟ ع کجا عاشق کجا کالج کی بکواس!

اور جناب من! یہ تو ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے جب پاکستان عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ اگر مرحوم آج کراچی میں ہوتے تو دیکھتے کہ قوم نے اُس درخت ہی کو اکھاڑ کر پھینک دیا جس پر کھجوریں لگنے کا امکان تھا۔ خدا جنّت نصیب کرے اکبر الٰہ آبادی کو جس نے آج سے ۵۰ سال پہلے کہدیا تھا:-

چرخ نے پیش کیمیشن کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں
شوہرا افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بیویاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

پہلی رباعی برصفحہ ۵۸

حلِ لغات: - نہ شعر است این الخ یعنی جو کچھ میں نے دنیا کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے، یہ محض شاعری نہیں ہے: گرہ از رشتہ معنی الخ یعنی میں نے اسلام کی روشنی میں زندگی کے مشکل مسائل کا حل پیش کیا ہے: اکسیرے زند عشق یعنی جذبۂ عشق، اکسیر کی طرح قلبِ ماہیت کر دیتا ہے یا بالفاظ دگر عشق سے زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے: مس کے لغوی معنی ہیں تانبا۔ مراد ہے شخصیت یا ذہنیت: این مفلساں: مراد ہے مسلمان قوم۔ یہاں افلاس سے مال و دولت کا فقدان مراد نہیں ہے بلکہ روحانیت (عشق) کا فقدان مراد ہے: تاب دادن: چمکا دینا مراد ہے

دل میں تحریک یا رغبت پیدا کر دینا:۔
مطلب:۔ اقبالؒ، بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! میں نے شاعری کے لئے شاعری نہیں کی بلکہ اپنی قوم کو شاعری کے پردہ میں اسلام کے حقائق و معارف سے آگاہ کیا ہے۔ نیز میں نے ان کو اس امید پر عشقِ رسولؐ کا درس دیا ہے کہ اگر وہ یہ راستہ اختیار کر لیں گے تو ان کا تانبا، سونا بن جائے گا۔ یعنی ان کی زندگی میں وہی انقلاب پیدا ہو جائیگا جو عربوں کی زندگی میں رونما ہو گیا تھا۔
بنیادی تصور:۔ اگرچہ اقبالؒ نے ساری عمر شعر گوئی میں بسر کر دی لیکن شاعری کو مقصود بالذات نہیں سمجھا (یہ مطلب ہے "نہ شعر است اینکہ بروے دل نہادم" کا)، بلکہ اپنے کلام کے ذریعہ سے قوم کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دیا کیونکہ عشق، انسان کے حق میں بمنزلۂ اکسیر ہے:۔

دوسری رباعی نمبر ۵۹

حل لغات:۔ **تو گفتی**:۔ یعنی اے میرے آقا اور مولیٰ! آپؐ نے مجھے یہ حکم دیا تھا: **از حیاتِ جاوداں گو** یعنی مسلمانوں کو ہمیشگی کی زندگی (حقائق و معارفِ قرآنی) سے آگاہ کر۔ **مُردہ** سے روحانی طور پر مردہ انسان مراد ہے: **پیغامِ جاں** سے پیغامِ قرآن مراد ہے: **ناحق شناساں**۔ باطل پرست یا حقیقت سے غافل مسلمان:
مطلب:۔ حضورؐ! آپؐ نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے آگاہ کر۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا (جس پر میری تصانیف شاہد ہیں) لیکن افسوس کہ دنیا پرست (دنیا: باطل) مسلمانوں نے میرے پیغام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ مجھے بھی ایک شاعر سمجھا اور جب کوئی "پڑھا" آدمی مجھ سے ملنے آیا تو اس نے قرآن و حدیث کے حقائق و معارف دریافت کرنے کے بجائے مجھ سے

یہ فرمائش کی کہ میری رفیقہ حیات کی تاریخ وفات لکھ دو۔

بنیادی تصور:۔ اگرچہ اقبال نے اپنے دل پر جبر کر کے بعض لوگوں کی فرمائش کی تعمیل کی تھی لیکن وہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے کہ میری قوم مجھے محض ایک شاعر سمجھتی ہے، اس لئے آخر عمر میں اُنہوں نے سرکار کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا دردِ دل بیان کیا ہے۔

پہلی رباعی بر ص۵۹

حل لغات: ۔ زعفران کنایہ ہے زردی سے جو "دردِ پنہاں" کا لازمی نتیجہ ہے۔ دردِ پنہاں کے دو معنی ہیں۔ (۱) ایسا درد جسے زبان سے بیان نہ کیا جا سکے (۲) کنایہ ہے عشق سے۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ اقبال کے دل میں قوم کا بھی درد تھا، اور سرکارِ دو عالم سے بھی محبت تھی۔ تراود: ٹپکتا ہے۔ چشمِ ارغوانی:۔ وہ آنکھ جو رونے کی شدت سے سُرخ ہو جائے۔ گرہ بستن: یعنی میں شدتِ رنج و الم کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ ناگفتہ دانی: یعنی آپ میرے دل کی حالت سے بخوبی واقف ہیں اس لئے اظہار کی حاجت (ضرورت) نہیں ہے۔

اس رباعی کا مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشق یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری حالتِ زار، میری قلبی کیفیات کا آئینہ ہے، آپکی نگاہِ کرم کا محتاج ہوں۔

دوسری رباعی بر ص۵۹

حل لغات: ۔ از نگاہیست: یعنی عاشق کی نگاہ اس کے جذباتِ قلبی کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا کیونکہ اس کی نگاہ، اس کے خیالات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ حدیث بمعنی گفتگو۔ طریقِ بانیاں: عاشقوں کی زندگی۔

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ سچا عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا کیونکہ اس کی ہیئت کذائی سراپا تصویر جذبات بن جاتی ہے۔ وہ محبوب کے سامنے اظہار جذبات کو خلافِ شانِ عاشقی سمجھتا ہے :

پہلی رباعی برصفحہ

حل لغات :- خودی دادم :- یعنی درس خودی دیا، یا خودی کے مفہوم سے آگاہ کیا : نامحرم سے وہ شخص مراد ہے جو خودی کے مقام سے ناآشنا ہے : گِل او سے مسلمان کی شخصیت یا اس کا دل مراد ہے : زمزم سے چاہِ زمزم مراد نہیں ہے بلکہ زندگی کا چشمہ یا حقائق و معارفِ قرآن : نالۂ گرم کنایہ ہے عشقِ رسولؐ سے : اثر دے یعنی اس کی بدولت : بسوزم سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی خدمت یا دین کے غم کے علاوہ دنیا کے تمام غموم سے بیگانہ ہو جاؤں :

مطلب واضح ہے، بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبالؔ سرکارِ دو عالمؐ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ حضورؐ! میں نے اپنی قوم کو خودی کا سبق پڑھایا ہے یا بالفاظِ دگر اس کو زندگی کے رموز و نکات سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب آپؐ مجھے اپنی محبت میں اس طرح فنا کر دیجیے کہ میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام بکھیڑوں سے بے نیاز ہو جاؤں۔ دین کے غم سے مراد ہے تبلیغ و اشاعت اسلام کی وہ تڑپ جو مسلمان کو ساری دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے بیگانہ بنا دے :

دوسری رباعی برصفحہ

حل لغات :- درون ما :- ہماری باطنی زندگی : دود نفس کنایہ ہے رنج و غم سے : دستِ تو کنایہ ہے حضورؐ کی نگاہِ کرم سے : یارا دستِ کس نیست یعنی آپؐ کے علاوہ

اور کوئی ہمارا دستگیر یا مشکلکشا نہیں ہے ؛ دگر یعنی اندریں حالات ؛ اندر سینہ یا غیر از تو کس نیست :- اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) مسلمانوں کے دلوں میں آپؐ کے علاوہ اور کسی کی جگہ نہیں ہو سکتی (۲) آپؐ کے علاوہ اور کوئی ہمارا دستگیر نہیں ہے ؛
مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ ہر مسلمان کا مقصود ہیں ؛

پہلی رباعی پر

حل لغات :- غریبم یعنی اے میرے آقاؐ! میں بہت مسکین اور عاجز ہوں ؛ درد مندم یعنی عاشق صادق ؛ نے نوازم :- یہ اقبال کی اصطلاح ہے، یعنی وہ شخص جو قوم کو عشق کا پیغام دے ؛ در گدازم یعنی میں جو پیغام دے رہا ہوں اس کی تاثیر سے خود بھی شمع کی طرح پگھل رہا ہوں ؛

مطلب :- اے میرے محبوبؐ! میں خود بھی آپؐ کی محبت میں فنا ہو رہا ہوں اور دوسروں کو بھی یہی پیغام دے رہا ہوں۔ آپؐ بخوبی جانتے ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں بس آپؐ میرے دل کو دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بے نیاز کر دیجئے تاکہ میں کامیاب ہو جاؤں ؛

بنیادی تصور :- عاشق صادق کا مقصود حیات یہ ہے کہ وہ "ہر دو عالم" سے بے نیاز ہو جائے اور اس کے دل میں اللہ کے سوا اور کسی کی آرزو باقی نہ رہے ؛

نوٹ :- اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب مقصودِ مومن، اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اقبال نے عشق رسولؐ کا درس کیوں دیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی مقصود ہے لیکن یہ مقصود عشق رسولؐ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیا خوب لکھا ہے شیخ سعدیؒ نے :-

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفےٰؐ

دوسری رباعی بر ص۶۱

حل لغات:- نم و رنگ: یعنوی معنی ہیں تازگی اور دلکشی جو نباتات میں نسیم صبح سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں شاعر کی مراد ہے وہ مادی ترقی یا نشو و نما جو دولت یا اسباب دنیوی سے حاصل ہوتی ہے: آفتاب تو:- اقبال کی نظر میں سرکارِ دو عالم صلعم کی ذات، تمام انسانوں کی روحانی ترقی کا باعث ہے جس طرح آفتاب تمام کائنات کی مادی ترقی کا سبب ہے: برد یم:- یعنی بالیدگی یا ترقی حاصل کرتا ہوں: نگاہم یعنی میری دیدہ نگاہ یا مطمح نظر: از مہ و پروین بلند است یعنی میرا تخیل مادیات سے بالاتر ہے: بر مزاج کس نگویم یعنی میں انسانوں کے مزاق کے مطابق شعر نہیں کہتا یا میرا مقصد لوگوں سے داد حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ میں وہ بات کہتا ہوں جو میرے نزدیک حق ہے:

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں وہ باتیں پیش کی ہیں جن کو وہ حق سمجھتے ہیں اور حق وہ ہے جو سرکار دو عالم صلعم نے قرآن کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے:

پہلی رباعی بر ص۶۲

حل لغات:- دریا سے عالم عشق و مستی مراد ہے: ساحلے نیست یعنی عاشق کی روحانی ترقی کی کوئی حد یا انتہا نہیں ہے: دلیل بمعنی منطقی حجت دوسرے معنی ہیں رہنما اور یہاں دوسرے معنی انسب ہیں: خبر از دلے ندہد یعنی وہ مقتضائے عشق پر عمل کرتے ہیں:

مطلب:- اے میرے آقا! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ عاشقی کی دنیا میں منطق پر

عمل نہیں کیا جاتا بلکہ عاشق اپنے دل کے تقاضوں پر عمل کرتا ہے یعنی محبوب کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے فرمان کے مطابق پہلے مکہ مکرمہ آیا ہوں ورنہ میری منزلِ مقصود تو مدینہ یعنی آپ کی ذات پاک ہے۔

بنیادی تصور:۔ اس رباعی میں اقبال نے ہمیں عاشق کی نفسیاتی زندگی سے آگاہ کیا ہے کہ عاشق اپنی عقل سے کام نہیں لیتا بلکہ معشوق کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ دراصل اس رباعی کا مضمون قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے:۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ ط یعنی اے رسول! آپ تمام انسانوں کو آگاہ کر دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ میری دکامل) اتباع کرو یعنی سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ حضورؐ! میری منزل مقصود تو آپ ہیں اور میں براہِ راست آپ کے پاس آنا چاہتا تھا لیکن آپ نے چونکہ طوافِ کعبہ کا حکم دیا ہے اس لئے میں پہلے وہاں گیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ میری نگاہ میں کعبہ سے بڑھ کر ہیں:

نوٹ:۔ یہی رنگ یعنی حضورؐ کی اتباع کا رنگ حضرت فاروق اعظمؓ کے اس قول سے مترشح ہے کہ بوقتِ طواف کعبہ جب انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا تو کہا کہ اے حجر اسود! میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے لیکن میں نے سرکار دو عالمؐ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا ہے اس لئے میں بھی تجھے بوسہ دیتا ہوں۔

میں نے اس رباعی کا مطلب طلبہ کے لئے بیان تو کر دیا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اُس کیف و مستی اور سوز و گداز کی تصویر بذریعہ الفاظ نہیں کھینچ سکتا جو اس مصرعہ میں پوشیدہ ہے:۔

مصرعہ: وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

یہ اُن دو یا تین مصرعوں میں سے ہے جو میری رائے میں ساری کتاب کا حاصل ہیں:

دوسری رباعی بر ص۶۲

حل لغات:- مراں یعنی اے میرے آقا مجھے اپنے قدموں سے دور نہ کیجئے: ناصبور:- یعنی میں آپ کا عاشق ہوں اور عاشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دنیا کے سارے مصایب برداشت کر سکتا ہے لیکن محبوب سے جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا خوب کہا ہے سعدیؒ نے :-

قرار در کف آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

فرسنگ:- تین میل کے فاصلہ کے لئے آتا ہے:

مطلب یہ ہے کہ حضورؐ! میں عاشق ہوں اور عاشق سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن صبر نہیں کر سکتا یعنی محبوب سے جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ ۱۲

بنیادی تصور یہ ہے کہ عشق اور صبر دونوں جمع نہیں ہو سکتے: ۱۲۔

پہلی رباعی بر ص۶۳

حل لغات:- افرنگی بتاں:- دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) وہ فرنگی عورتیں جن کو اکثر مسلمان اپنا مقصود حیات بنا لیتے ہیں (۲) انگریز قوم جن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اکثر مسلمان اپنا دین و ایمان برباد کر دیتے ہیں۔ اسی لئے اقبالؒ نے افرنگی کے لئے "بت" کا لفظ استعمال کیا ہے: **دل باختن:-** دل ہار دینا یعنی اپنا دین و ایمان کسی کے قدموں پر نثار کر دینا: **تاب و پیچاں:-** ہندوؤں کی دولت مراد ہے: **بگداختم** یعنی اُن کے ہاتھ اپنا ایمان فروخت کر دیا: **خویشتن** یعنی اسلام کی حقیقت یا مسلمان کی قدر و منزلت: **چو دیدم خویش را** یعنی جب میں اپنے اور

اپنی قوم کے اعمال واقوال وافکار پر نظر کرتا ہوں تو اُن میں مسلمانوں کی سی کوئی بات نظر نہیں آتی ۔ مطلب واضح ہے ۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان اسلامی اصول سے اس قدر بیگانہ ہو چکے ہیں کہ اُن کے اعمال کو دیکھ کر کوئی شخص یہ یقین نہیں کر سکتا کہ وہ مُسلمان ہیں ۔

دوسری رباعی بر صلہ ۶۳

حل لغات: ۔ مئے سے تہذیب مغرب مراد ہے ۔ بجان من : یعنی میں قسم کھا کر کہتا ہوں ۔ درد سر خریدم یعنی میری زندگی تباہ ہوگئی ۔ نکویان فرنگی : یعنی یورپ کے حکماء اور مدبرین ۔ بے سوز نور و زے یعنی ان کی صحبت میں رہ کر مطلق کسی قسم کا روحانی کیف وسرور حاصل نہیں ہوا ۔ مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ تہذیب مغرب انسان کو روحانیت (سوز و گداز) سے محروم کر دیتی ہے ۔

حاشیہ صد ۱۱۳ کا لہ مثالیں تو بہت ہیں یہاں صرف ایک مثال درج کئے دیتا ہوں تقسیم سے پہلے کراچی کے ہندوؤں نے مسٹر گاندھی کا بت مسلم اکثریت کے صوبہ کے دارالحکومت میں نصب کرنیکا فیصلہ کیا، میونسپل کارپوریشن کے مسلمان ارکان نے مخالفت کی لیکن اس دانشمند قوم نے ۲۵ ہزار روپیہ فی ووٹ کے حساب سے بعض مسلمانوں کا ایمان خرید لیا اور "لنگوٹ بند مہاتما" سنگ مرمر کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے، حقیقت یہ ہے کہ سندھ، سرحد، پنجاب اور بنگال چاروں مُسلم اکثریت کے صوبوں میں داخل حکومت ہندوؤں کی تھی اور اسکی وجہ یہ ہے کہ انہیں اس بات کا تجربہ تھا کہ گرفتار مسلمانوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے ۔ ان میں جو "آزاد" ہے وہ بھی روپیہ کے نقد سے خریدا جا سکتا ہے ۔ کیا خوب لکھا ہے اکبر نے :۔

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

پہلی رباعی بر صفحہ ۶۴

حل لغات:- فقیرم یعنی میں دنیا والوں سے بے نیاز ہوں۔ یہاں فقیر سے مراد ہے وہ شخص جس میں شانِ فقر پائی جائے۔ از تو خواہم یعنی چونکہ مجھ میں شانِ فقر پائی جاتی ہے۔ اس لئے میں آپؐ کے علاوہ اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ دل کوہے سے عظیم الشان دنیاوی طاقت کی طرف اشارہ ہے۔ خراش:- امر کا صیغہ ہے یعنی اے میرے آقاؐ! مجھے ایسی طاقت عطا کیجئے کہ اگرچہ میں بظاہر "برگِ کاہ" بہت ضعیف ہوں، لیکن پہاڑ (دنیاوی حکومت) سے ٹکرا سکوں۔ درسِ حکیماں سے فلسفہ کی تعلیم مراد ہے جس کا نتیجہ حیرانی اور پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دردسر داد:- یعنی مجھے پریشان کردیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فلسفہ دنیا کے کسی مسئلہ کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتا۔

لطیفہ:- فلسفہ بظاہر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میرے پاس اس کائنات کا صحیح علم ہے، لیکن جب ہم فلسفہ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ "علم" کسے کہتے ہیں؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ تو اس ایک مسئلہ میں چودہ[۱۴] مذاہب ہیں عمر تمام ہوجاتی ہے لیکن یہ طے نہیں ہوسکتا کہ علم کی تعریف کیا ہے اور انسان کو علم حاصل ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو کس حد تک؟ کیا خوب کہا ہے اکبر الہ آبادی نے:-

ع تجربہ ہو نہیں چکتا ہے کہ مر جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ میں اقبال نے یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ اگر کسی شخص کو صحیح علم کی آرزو ہو تو سرکارِ دوعالمؐ یا حضورؐ کے سچے جانشینوں سے روحانی فیض حاصل کرے جسے "نگاہ" کہتے ہیں، چنانچہ خود اقبال نے کہا ہے:-

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر   علم و حکمت از کتب دیں از نظر

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصوّر چوتھے مصرعہ کی شرح میں بیان کر دیا ہے، کہ حقیقی اطمینانِ قلب، صرف مرشد کامل کی نظر سے حاصل ہو سکتا ہے:

دوسری رباعی پر ۶۴

حل لغات:۔ مُلّا سے وہ شخص مراد ہے جو مدرسہ میں بیٹھ کر درسی کتابیں پڑھاتا ہے اور صوفی سے مراد ہے وہ شخص جو خانقاہ میں بیٹھ کر ذکر خفی و جلی کرتا ہے:
من آنم نہ اینم یعنی اقبال کہتے ہیں کہ میں نہ اُس طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں نہ اس سے:
نویس اللہ الخ یعنی آپ مجھے اللہ تعالیٰ سے ملا دیجئے یا اس کا عرفان عطا کر دیجئے یا اُس کی محبت میرے دل میں پیدا کر دیجئے: کہ ہم خود را الخ یعنی جب مجھے اس کی معرفت حاصل ہو جائے گی تو میں آپ سے بھی آگاہ ہو جاؤں گا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اگر آپ میرے دل میں اللہ کی محبت پیدا کر دیں تو میں اپنی خودی سے آگاہ ہو جاؤں گا اور جب معرفت نفس حاصل ہو جائیگی تو معرفت باری تعالےٰ بھی حاصل ہو جائیگی۔ اِس صورت میں یہ مصرعہ اس مقولہ کا ترجمہ ہو جائیگا:
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا:۔ رباعی کا مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی خودی اور اپنے رب کی معرفت درکار ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرے۔

توجہ: دل پر اللہ لکھنے سے مطلب یہ ہے کہ پہلے سالک اپنی ہستی کو خدا کی محبت کی آگ میں جلا کر بھسم کر دے، پھر اس کو نئی زندگی حاصل ہو جائے گی، جو معرفت الٰہی سے مسعود ہوگی: ۱۲۔

پہلی رباعی بر ص ۶۵

حل لغات :۔ دلِ ملا گرفتار الخ یعنی ملا کے دل میں آپؐ کی محبت نہیں ہے ؛ "غمے" میں یائے تخصیصی ہے یعنی غمِ مخصوص یا عشقِ رسولؐ ؛ نگہے ہست الخ یعنی ملا کی آنکھ میں دیکھنے کی قوت تو ضرور ہوتی ہے (لیکن) نمے نیست یعنی اُسکی آنکھ سے آپؐ کی یاد میں کبھی آنسو نہیں نکلتے ؛ نم :۔ کنایہ ہے جذبۂ عشق سے ؛ مکتب او :۔ اِس کے دو معنی ہیں (۱) ملا کی صحبت۔ (۲) ملا کا طریقِ درس و تدریس ؛ ریگِ حجاز :۔ کنایہ ہے مذہبی تعلیم سے ؛ زمزمے نیست :۔ زمزم کنایہ ہے رنگِ محبت سے : واضح ہو کہ اس رباعی کے چوتھے مصرعہ میں صنعتِ مراعاۃ النظیر پائی جاتی ہے۔ ملکِ حجاز میں ریگستان بھی ہے اور زمزم بھی۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ ملا کی صحبت اور مدرسہ کی تعلیم سے عشقِ رسولؐ پیدا نہیں ہو سکتا ؛

دوسری رباعی بر ص ۶۵

حل لغات :۔ سرِ منبر :۔ یعنی جب ملا منبر پر بیٹھتا ہے ؛ کلامش نیش دار است :۔ تو اس کے وعظ میں بڑی تلخی ہوتی ہے ؛ نیش۔ یہ لفظ نوش کی ضد ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں چاقو کی نوک یا بچھو کا ڈنک۔ یہاں کنایہ ہے دوسروں کی تحقیر یا تکفیر سے ؛ کہ او را صد کتاب الخ کیونکہ وہ کتابی علم حاصل کرنے کے بعد، اپنے آپ کو دین کا "اجارہ دار" سمجھنے لگتا ہے، اور جو لوگ اُس سے اختلاف کرتے ہیں ان کو جاہل یا خارج از اسلام قرار دیتا ہے ؛ حضورِ تو من از خجلت الخ اے میرے آقاؐ! میں آپؐ کے سامنے اس حقیقت کے اظہار سے شرماتا ہوں ؛ ز خود پنہاں یعنی وہ اپنی حقیقت سے بالکل

بے خبر ہے: بر ما آتش کار است یعنی مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس کا وجود ملت کے حق میں نقصان رساں ہے کیونکہ مُلّا عموماً دوسروں کی تحقیر اور تکفیر کر کے، ملّت کے اندر افتراق پیدا کرتا ہے۔ آج مسلمانوں میں جس قدر منافرت کا رنگ نظر آتا ہے یہ سب اسی طبقہ کا پیدا کردہ ہے اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے:

پہلی رباعی بر ۶۶

حل لغات:۔ صاحبدل:۔ کنایہ ہے عاشق سے۔ یہ لفظ تصوف کی اصطلاح ہے۔ تصوف کی رُو سے صرف وہی شخص صاحب دل ہے جس کے دل میں عشق رسولؐ کا جذبہ موجزن ہو: دل صاحبدلاں او برد الخ یعنی آپؐ کے عاشقوں کو عشق کا پیغام مُلّا نے نہیں سُنایا، بلکہ میں نے سُنایا: کیشِ دیں۔ کیش بمعنی ترکش۔ اقبال نے مُلّا اور اپنے آپ کو تیر سے تشبیہ دی ہے: بر ہدف او خورد الخ خوردن کے کئی معنی ہیں یہاں مراد ہے مارنا، نشانہ پر تیر مارنا یا لگانا:

مطلب:۔ اے میرے آقاؐ! میں آپؐ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپ انصاف فرمائیے کہ آپؐ سے محبت کرنے کا پیغام، میں نے قوم کو سُنایا یا مُلّا نے؟ میں اور مُلّا، ہم دونوں اسلام کے ترکش کے دو تیر ہیں یعنی ہم دونوں اسلام کی خدمت کے مُدعی ہیں لیکن یہ فیصلہ صرف آپؐ کر سکتے ہیں کہ کون سا تیر نشانہ پر جا کر لگا؟ یعنی دراصل یا حقیقی معنوں میں کس نے اسلام کی خدمت کی؟

بنیادی تصور یہ ہے کہ مُلّا نے اپنا فرضِ منصبی ادا نہیں کیا۔ اُس نے قوم کو عشق رسولؐ کا سبق پڑھانے کے بجائے دوسروں کی تکفیر کا سبق پڑھا دیا:

نوٹ:۔ اقبال نے مُلّا کے خلاف ہر کتاب میں لکھا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عرصہ دراز سے مُلّاؤں نے قوم کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ صرف اس بات میں

منحصر کر دی ہے کہ باہم دگر تکفیر کا بازار گرم کرتے رہیں جس طرح زوال بغداد سے کچھ عرصہ پہلے احناف اور شوافع کے علماء آپس میں لڑتے رہتے تھے اُسی طرح آج بھی مسلمانوں کے مختلف فرقے رات دن ایک دوسرے کی تکفیر میں مشغول ہیں اور اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ طبقہ ایک ہزار سال سے مسلسل تخریب قومی میں مشغول ہے اور یہی وجہ ہے کہ دوسری قومیں تو کسی کسی رنگ میں ترقی کر رہی ہیں لیکن ہم عرصۂ دراز سے ہر اعتبار سے روبزوال ہیں اور روز بروز قعرِ ذلت میں گرتے جاتے ہیں۔ اہل مغرب نے ایٹم بم ایجاد کر لیا لیکن مُلّا ابھی تک ارسطو کے فلسفہ کی وہ شرح پڑھ رہا ہے جو چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی تھی ؛

دوسری رباعی ص ۱۲۶

حل لغات:۔ غریبم یعنی اجنبی ہوں ؛ محفل خویشم یعنی اپنی ہی قوم میں ؛ پنہاں غم ۔ یعنی میرا دردِ دل جو پوشیدہ ہے ؛ غم خود را الخ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے اور بانظر سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر بلیغ انداز ہے۔ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ میں اپنا غم اپنے دل سے بھی نہیں کہتا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے سوا اور کون ہے جس سے میں اپنا دردِ دل بیان کروں ؟

بنیادی تصور یہ ہے کہ میری قوم میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی اور یہی وہ غم ہے جس کا داغ مرحوم اپنے سینہ میں اپنے ساتھ ہی لے گئے جس کا ثبوت اس شعر سے مل سکتا ہے :۔

ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

پہلی رباعی بر ص ۶۷

حل لغات:۔ دل خود را الخ یعنی میں نے آپ کے سوا کسی سے محبت نہیں کی کسی کو مقصود حیات نہیں بنایا۔ گرہ از روے الخ یعنی دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ گرہ کشادن کنایہ ہے حل مشکلات سے۔ بغیر اللہ کردم تکیہ الخ یعنی اگر میں نے ایک دفعہ غیر اللہ پر بھروسہ کیا تو دو سو بار اسلام کی تعلیم سے دور ہو گیا۔ مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان کو اللہ کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی مطلب ہے۔ مقامِ خود یعنی مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ سے استمداد نہیں کرتا۔ جو مسلمان، اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا یا مشکلکشا سمجھتا ہے وہ اپنے مقام یعنی مقامِ توحید سے گر جاتا ہے۔

نوٹ:۔ میرے روحانی پیشوا الشیخ العالم حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے ایک دفعہ ایک حاجتمند کی سفارش سلطان غیاث الدین بلبن سے بایں الفاظ فرمائی تھی کہ اے بادشاہ اگر تو اس شخص کو اس کا مقصود عطا کرے گا تو دراصل مُعطی (عطا کرنیوالا) اللہ تعالیٰ ہے تو مشکور رہیگا اور اگر نہیں، تو مانع دراصل اللہ تعالیٰ ہے تو معذور ہوگا۔

دوسری رباعی بر ص ۶۷

حل لغات:۔ ہماں سوز جنوں الخ یعنی مجھ پر دیوانگی کا وہی عالم طاری ہے۔ جو ابتدائے عشق میں تھا۔ ہماں ہنگامہ ہا الخ اور میرے سینہ میں آج بھی وہی تلاطم برپا ہے جو پہلے کسی زمانہ میں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس ضعیفی کے عالم میں بھی عشق کی شدت وہی ہے جو جوانی میں تھی۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میرا عشق بوڑھا نہیں

ہوا ہے: ہنوز از جوش الخ مطلب یہ ہے کہ میری بیقراری کا عالم وہی ہے جو پہلے تھا۔ اقبالؔ سرکارِ دو عالم صلعم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت مجھے حضوری نصیب ہے لیکن دفورِ جذبات میں کسی طرح کمی نہیں ہوئی ہے: نیاسوداست یعنی میرے دل کو قرار نصیب نہیں ہوا ہے: موجِ گوہر سے ذاتِ عشق مراد ہے: مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشق کو حضوری میں بھی قرار نصیب نہیں ہوتا:

پہلی رباعی بر ص۶۸

حل لغات:- ہنوز این خاک الخ- اس رباعی کا مضمون سابقہ رباعی سے مربوط ہے کہتے ہیں کہ اے میرے آقا صلعم! ابھی تک (حالانکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں) عشق کی آگ میرے سینہ میں سلگ رہی ہے: ہنوز این سینہ الخ اور ابھی تک میں آپ کی یاد میں آخر شب اُٹھ کر روتا ہوں۔ واضح ہو کہ سرکارِ دو عالم صلعم کا ارشاد یہ ہے کہ آخر شب بیدار ہو کر تہجد پڑھنا اور تلاوت کرنا اور اُس کی یاد کرنا (آہ سحر گاہی) روحانی ترقی کے لئے اکسیر ہے۔ خود سرکارِ دو عالم صلعم کا ساری عمر یہی معمول رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کو "آہ سحر گاہی" کا درس دیا ہے: تجلی ریز بر چشمم الخ اپنی حالت بیان کرنے کے بعد، اب اقبالؔ بارگاہِ رسالت میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! آپ میری بظاہر چھوٹی اور کمزور آنکھوں پر اپنے حسنِ عالمتاب کی ایک تجلی نازل فرمائیں تو سہی، میں آپؐ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس ضعیفی کے عالم میں بھی، میری آنکھوں میں آپؐ کے جمالِ جہاں آرا سے بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت باقی ہے۔ واضح ہو کہ تاثیر کے لحاظ سے اس رباعی کا چوتھا مصرعہ قیامت ڈھا رہا ہے۔ اس میں اقبالؔ نے اپنے عشق کی پوری کیفیت، نہایت بلیغ انداز میں بیان کر دی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں بلاغت اس کتاب کی سب سے نمایاں صفت ہے

اور یہ شان اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کو اظہار مطالب پر قدرت حاصل ہو جائے۔

بلاغت کے علاوہ اس مصرعہ میں سوز و گداز کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کا اظہار لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔ عاشق نے چار لفظوں میں اپنے دل کی پوری داستان بیان کر دی ہے۔

اس وقت عاشق یہ بھول گیا ہے (دفور جذبات کی وجہ سے) کہ جس سے میں مخاطب ہوں وہ میرے دل کی کیفیت سے بخوبی واقف ہے۔ تجلی کے حصول کی آرزو نے اُسے دیوانہ بنا دیا ہے وہ اُس ذاتِ بابرکات سے، جس کو وہ خود بھی جانتا ہے کہ: "تو احوال مرانا گفتہ دانی" وارفتگی کے عالم میں یہ کہہ رہا ہے۔ کہ حضور میں بیشک بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میرا عشق بوڑھا نہیں ہوا ہے۔ آپ خدا کے لئے میری طرف دیکھیں تو سہی، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کی تجلی برداشت کرونگا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشق، محبوب کی تجلی کا انتہائی آرزومند ہوتا ہے اور یہ تابِ نظر، ذاتِ محبوب میں فنا ہو جانے کے بعد پیدا ہو سکتی ہے:

دوسری رباعی بر صفحہ ۶۸

حل لغات:- نگاہم زانچہ بینم الخ یعنی اس دنیا میں جو چیزیں دوسروں کے لئے باعثِ کشش ہیں (زن، زر، زمین) میں ان سب سے بے نیاز ہوں۔ میرے دل میں ان میں سے کسی کی محبت نہیں ہے۔ اس کا سبب دوسرے مصرعہ میں بیان کیا ہے: دل از سوزِ درونم الخ کیونکہ میرا دل تو آپ کی محبت کی بھٹی میں پگھل رہا ہے: من و ایں عصر الخ لیکن اے میرے آقا! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ اللہ نے مجھے اس الحاد انگیز، مادیت نواز اور فریب پرور زمانہ (عصر) میں کیوں پیدا کیا؟ اقبال نے عصرِ حاضر کو بے اخلاص اور بے سوز کہکر حقیقت یہ ہے کہ دو لفظوں میں اس دور کی تصویر کھینچدی ہے:-

(۱) یہ عصر بے اخلاص ہے یعنی اس زمانہ میں کسی شخص کے اندر نہ خلوص ہے اور نہ کہیں خلوص کی قدر ہے۔ بلکہ آجکل تو مخلص آدمی کو بیوقوف سمجھا جاتا ہے ہماری ذہنیت اس قدر پست ہو گئی ہے کہ انسانیت کا سب سے بڑا جوہر، سب سے بڑا عیب ہو گیا ہے۔ خلوص یا اخلاص مسلمان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ بلکہ دینِ اسلام کی روح ہے۔ میرے مرشد روحانی حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوب میں اپنے مرید یا اخلاص خان جہان لودہی مرحوم کو تحریر فرماتے ہیں کہ "اسلام تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایمان، عمل اور اخلاص۔ اور یہ اخلاص اس قدر اہم ہے کہ اگر کسی مسلمان میں یہ جوہر نہ ہو تو ایمان اور عمل دونوں بیکار ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اخلاص ہے کیا؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ واضح ہو کہ اس سوال کا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے۔ لیکن میں نہایت اختصار کے ساتھ دو لفظوں میں اس کا مطلب بیان کرتا ہوں کہ اخلاص کہتے ہیں نفس کی اس حالت کو جب تمام اعمال و افعال سے صرف استرضائے باری تعالیٰ مطلوب ہو یعنی اس کی مرضی کا حصول انسان کا مقصود بن جائے، نہ جنت کا تصور ہو نہ شہرت کا خیال ہو نہ کوئی لالچ ہو نہ کوئی ذاتی غرض ہو نہ کسی قسم کا نفع مدِ نظر ہو۔ بس صرف ایک داعیہ کارفرما ہو اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائے۔ یعنی نیکی اور طاعت اس لئے سرزد نہ ہو کہ جنت میں حوریں ملیں گی یا شرابِ طہور کا دور چلے گا۔ بلکہ محض اس لئے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے، یعنی صرف رضائے الٰہی مقصود ہو اور وہی مطلوب ہو:

(ب) اقبالؔ نے اس عصر کی دوسری خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ بے سوز ہے اس کا مطلب واضح ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی ذہنیت اس قدر مادہ پرستانہ ہو گئی ہے کہ وہ ہر کام کو مالی اور معاشی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے سینے عشقِ رسولؐ کے جذبہ سے معّرا ہو چکے ہیں۔ کیونکہ عشقِ رسولؐ میں بظاہر کوئی مالی فائدہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ بسا اوقات اپنی دولت کے کثیر حصّہ سے محروم ہونا پڑتا ہے۔:

بنیادی تصوّر:۔ یہ ہے کہ اقبالؔ سرکارِ دو عالم صلعم کی بارگاہ عالیہ میں اپنے دردِ دل کا اظہار کرتے ہیں کہ حضورؐ! مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسے زمانے میں پیدا کیا جب کہ میری قوم مادہ پرستی میں مبتلا ہو چکی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی:

نوٹ:۔ طلبہ تو معذور ہیں اگر شائقینِ کلامِ اقبالؔ ناراض نہ ہوں تو میں عرض کردوں کہ ان رباعیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اقبالؔ اپنی قوم کی تغافل شعاری کا داغ لے کر دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اب اگر قوم ہر سال اُن کے مزار پر چادریں چڑھا دیتی ہے اور ہوائی جہاز سے پھول برسا دیتی ہے تو کیا اس سے مرحوم کے زخموں کا اندمال ہو سکتا ہے؟:

پہلی رباعی برص ۶۹

حلِ لغات:۔ واضح ہو کہ اس رباعی کا مضمون بھی وہی ہے جو سابقہ رباعی کا ہے: **عصرِ بے سوز:۔** یعنی موجودہ زمانہ جس میں عشقِ رسولؐ کو "رجعت پسندی" قرار دیا جاتا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آج یہی طبقہ ہماری رہنمائی کا مدعی ہے: بخاکم جانِ پُرشورے الخ یعنی کارکنانِ قضاء قدر نے میرے دل میں

عشق کی آگ بھڑکا دی۔ خاک کنایہ ہے جسم سے اور جانِ پرشور کنایہ ہے جذبۂ عشق رسولؐ سے۔ نخ لغوی معنی ریشم کا مضبوط تاگا۔ تو گوئی الخ یعنی مجھ پر سکراتِ موت کی سی عالت طاری ہے۔

اقبالؔ بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ مجھے اللہ نے پیدا تو اس زمانہ میں کیا لیکن میرے دل میں آپؐ کی محبت کا بے پناہ جذبہ ودیعت فرما دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی میرے لئے وبال ہو کر رہ گئی۔ میری حالت اُس شخص کی سی ہے جس کے گلے میں ریشم کا پھندا پڑا ہوا ہو۔ (ریشم کا پھندا سُوت کے پھندے بہت زیادہ شدید ہوتا ہے) بس حضورؐ یوں سمجھ لیجئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے مجھے سولی پر لٹکا دیا ہو۔

بنیادی تصوّر:۔ قصّہ یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک حضرتِ اقبالؔ اپنی قوم کی سرد مہری، حق ناشناسی، عیّاری، منافقت اور زر پرستی کا مشاہدہ کرتے رہے اس لئے ۱۹۳۷ء میں جب پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اُنہوں نے سرکار دو عالم صلعم کی بارگاہِ عالیہ میں داستانِ غم کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اقبالؔ بہر حال انسان تھے، فرشتہ نہ تھے۔ کیا وہ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے۔ کہ وہی لوگ جو اُن کے سامنے اپنے سر کی قسم کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے تھے جب خلوت میں اپنے دوستوں سے ملتے تھے تو اقبالؔ اور مسلم لیگ دونوں کی تخریب کے منصوبے باندھتے تھے؟ ناظرین ان رباعیات کو، پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست کا مطالعہ کرنے کے بعد، پڑھیں، (کم از کم ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ تو اشد ضروری ہے) تب وہ اس مصرعہ کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں:۔ ع تو گوئی بر سرِ دارم کشیدند

یہ مصرعہ نہیں ہے اقبالؔ کی پوری زندگی کی سرگذشت ہے: اللہ اکبر! جس

شخص نے اپنی ساری زندگی اپنی قوم کے عشق میں تڑپ تڑپ کر بسر کی، اُسی قوم کے سربرآوردہ حضرات نے اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اقبال کو عروج نصیب ہو جائے اگر ناظرین اقبال جناح مراسلت کا مطالعہ کریں گے تو یقین ہے کہ اس مصرعہ کا کچھ مفہوم ضرور ان کی سمجھ میں آجائے گا۔[1]

دوسری رباعی ۶۹

حل لغات:۔ نگیرد یعنی قبول نہیں کرتے۔ لالہ وگل۔ کنایہ ہے افراد قوم سے۔ رنگ و بو یم:۔ یعنی میرا پیغام۔ بحرف اندر نگنجد یعنی میں اپنے غم کی کیفیت لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ با کہ گویم یعنی اگر کہوں بھی تو کس سے کہوں، کوئی سننے والا تو ہے نہیں۔

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصوّر یہ ہے کہ اقبال کو آخر عمر میں یہ یقین ہو گیا تھا کہ میری قوم مجھے محض ایک شاعر سمجھتی ہے اسی لئے میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا دردِ دل، سرکارِ دو عالم صلعم کی بارگاہ میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی رباعی برصفحہ

حل لغات:۔ اندر مشرق و مغرب یعنی ساری دنیا میں۔ غریبم یعنی تنہا ہوں اجنبی ہوں۔ یارانِ محرم: ہم خیال لوگ یا وہ جو میرے پیغام کو سمجھ سکیں۔ معصومانہ:۔

---

[1] اگر تمام مراسلت پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو صرف ۱۰ر نومبر ۱۹۳۶ء کے خط کا مطالعہ کافی ہے۔

نادان بچوں کی طرح (غربت را فریبم یعنی جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں تنہا ہوں تو اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا ہوں تاکہ تنہائی کا احساس کچھ تو کم ہو جائے:
چوتھے مصرعہ میں جو کیفیت مضمر ہے وہ لفظوں سے ظاہر نہیں ہو سکتی:
مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال اپنا دردِ دل (احساسِ تنہائی) سرکارِ دو عالم صلعم کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں کہ حضورؐ! یوں تو میرے یہاں صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی شخص بھی میرا محرمِ راز، غم گسار، یا رفیقِ کار نہیں تھا۔ میری زیارت کے لئے تو دور دور سے لوگ آتے تھے لیکن میرے مقصد کی تکمیل میں کوئی میرا معاون نہ تھا۔
نوٹ:- یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک میرے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس کی تفصیل تو "حیاتِ اقبال" میں لکھوں گا۔ اس جگہ اس قدر لکھنا کافی ہے کہ:-
(۱) ٹیگور نے اپنی قوم سے کہا کہ میں اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ قوم نے اپنے شاعر کی آرزو فوراً پوری کر دی آج شانتی نکیتن ساری علمی دنیا میں مشہور و معروف ہے۔
اقبال بیچارہ نے بھی اپنی قوم سے کہا کہ میں اپنے خیالات کی اشاعت کیلئے ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کسی نواب، جاگیردار، زمیندار، سجادہ نشین، کرسی نشین، یا کے سی آئی ای کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس کی آرزو پوری کر دیتا:
ادارہ کا قیام تو بڑی بات ہے، کسی دولتمند نے اقبال کو یورپ بھی نہ بھیجا کہ وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کے بعد وہ اسلام پر کوئی شاندار کتاب لکھ سکتے، جس کی آرزو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے یہ صراحت اس لئے کرنی پڑی کہ اس کے بغیر ان المناک رباعیوں کا بنیادی تصور سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ۱۲:

دوسری رباعی پر

حل لغات: طلسم عصر حاضر:- یہ اقبال کی اصطلاح ہے، اسلئے وضاحت طلب ہے۔ عصر حاضر سے محض موجودہ زمانہ مراد نہیں ہے کہ "عصر" بذاتہ نہ اچھا ہے نہ بُرا، بلکہ اس سے وہ تمام غیر اسلامی تحریکیں مراد ہیں جو اس زمانہ میں لوگوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ مثلاً:-

(ا) مادیت اور اس سے متعلقہ تحریکات مثلاً دہریت، الحاد، بیدینی، تشکیک، لاادریت، ہیومینزم، سیکولرازم، نیچرل ازم، ڈی ازم، نہلزم، یوٹی لیٹرین ازم وغیرہ وغیرہ۔

(ب) اشتراکیت اور اس سے متعلقہ تحریکات مثلاً بالشوزم، سوشلزم، سائنٹیفک میٹریلزم۔

(ج) وطنیت۔ جو خدا کے بجائے وطن کو مقصودِ حیات قرار دیتی ہے۔

(د) ملوکیت۔ جو خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بناتی ہے۔

(ہ) جمہوریت:- جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں۔ تولا نہیں کرتے۔

واضح ہو کہ یہ تمام تحریکات (مذاہب) اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان چونکہ یورپ کی غلامی پر رضامند ہو چکے ہیں، اس لئے اسلام کے سب سے بڑے دشمن یعنی انگریزوں کے مقرر کردہ نصاب تعلیم کے واسطہ سے اِن غیر اسلامی اور لادینی تحریکات کے مہلک جراثیم اُن کے اندر سرایت کر چکے ہیں۔ لیکن "ساحرِ انگلیس" کا کمال فن یہ ہے کہ اُس نے اس سمِ قاتل کو آبِ حیات کے نام سے مسلمانوں کے حلق سے نیچے اُتار دیا۔ مسلمان چونکہ اسلام اور خودی دونوں سے بیگانہ ہو چکے ہیں اس لئے وہ عصر حاضر کی ان تحریکوں کو اپنے لئے مفید سمجھنے لگے۔

گویا عصرِ حاضر کے طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ اقبالؔ سرکارِ دو عالم صلعم سے یہ عرض کرتے ہیں کہ حضور! آپؐ کی روحانی تائید کی بدولت میں نے اس طلسم کو پاش پاش کر دیا:
آئندہ تین مصرعوں میں اسی کارنامہ کی تفصیل بیان کی ہے:

ربودم دانہ و دامش الخ عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! میں نے اس طلسم کو اس طرح پاش پاش کیا کہ صیادِ مغرب نے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے جو دانہ ڈالا تھا، اُسے ضائع کر دیا۔ اس مصرعہ میں لفظ "دانہ" بہت بلیغ ہے:۔ دانہ سے مراد ہے وُہ مادی اور دنیاوی عروج جو لادینی سے حاصل ہوتا ہے۔ یا وُہ سرکاری عہدے اور مناصبِ عالیہ جو مغربی تعلیم کی بدولت حاصل ہوتے ہیں: دامش گسستم لفظی معنی تو ہر شخص جانتا ہے مراد اس لفظ سے یہ ہے کہ میں نے عقلی اور نقلی دلائل کی مدد سے کافرانہ نظام کو باطل کر دیا اور اہلِ عالم پر اسلام کے اصولوں کی حقانیت واضح کر دی[ط]: خدا داند: اب اقبالؔ اپنے طرزِ عمل کی صداقت یا خلوص پر اللہ کو گواہ کرتے ہیں۔ اس ترکیب میں جو لطف مضمر ہے اسے لفظوں کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا: مانندِ براہیمؑ: حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کی طرف اشارہ ہے: بنارِ او۔ لفظی معنی ہیں وُہ آگ جو اس زمانہ کے نمرود نے مجھے جلانے کے لئے بھڑکائی تھی۔ مراد یہ ہے کہ جب باطل پرستوں نے یہ دیکھا کہ اقبالؔ مسلمانوں کو توحیدِ الٰہی کی طرف بلا رہا ہے تو انہوں نے مخالفت کا بازار گرم کر دیا لیکن اے میرے آقاؐ! میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر آپؐ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے مدۃ العمر کسی انگریز کی خوشامد نہیں کی اور کسی انگریز سے نہیں ڈرا۔ اور میں نے اپنی ساری عمر انگریزوں کے خلاف قلمی اور

ط اسکی تفصیل ناظرین کو اقبالؔ کی انگریزی کتاب "مذہبی فکر" کی تشکیل جدید میں مل سکتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو اردو فارسی کلام کی شرح سے فراغت کے بعد اسکی شرح ہدیۂ ناظرین کروں گا۔۱۲

لسانی جہاد میں بسر کی اور اس راہ میں جس قدر میری مخالفت ہوئی میں نے بڑے استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا، میں کبھی کافرانہ نظام یا انگریزوں سے مرعوب نہیں ہوا۔ میں نے ہمیشہ کلمۂ حق کہا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ قوم نے تو اقبال کی خدمات جلیلہ کی کوئی قدر کی نہیں، اس لئے تقاضائے بشریت سے مجبور ہو کر، انہوں نے اپنا کارنامہ، اپنے اور ساری کائنات کے آقا کی خدمت میں پیش کیا تاکہ حضورؐ خوش ہو کر انہیں اپنے خاص غلاموں میں داخل فرمالیں:

نوٹ:۔ مقام مسرت ہے کہ اقبال کو تاجدارِ مدینہؐ نے اپنے مقربینِ بارگاہ میں داخل فرمالیا۔ یہی تو سبب ہے کہ آج اقبال مسلمانانِ عالم کا محبوب بنا ہوا ہے ۱۲:

پہلی رباعی پر صادِ

حل لغات:۔ نگہ آوردۂ تست۔ یہاں نگہ (نگاہ) سے بصارتِ ظاہری مراد نہیں ہے بلکہ بصیرتِ باطنی مراد ہے یعنی وہ فراست جو مومن کو سرکار دو عالم صلعم سے محبت کی بدولت حاصل ہوتی ہے: فروغ لاالٰہ الخ توحید الٰہی سے آپؐ ہی نے دنیا کو اور مجھ کو مالامال کیا ہے:

مطلب:۔ اے میرے آقا! اور مولیٰ! آپ تمام حقانیت اور روحانیت کا منبع ہیں۔ آپ ہی نے دنیا کو توحید کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ آپؐ ہی نے دنیا کو اللہ سے محبت کا درس دیا ہے۔ اس لئے میں آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ مجھے اپنا جمال جہاں آرا دکھا دیجئے تاکہ میرا وجود منور ہو جائے:

نوٹ:۔ اقبال نے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعہ میں سرکار کو داتا (معطی) قرار دیا ہے۔ یہ تصور اس حدیث سے ماخوذ ہے "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ" یعنی

اصل عطا کرنے والا تو اللہ ہی ہے ہاں وہ مجھے دیتا ہے اور میں اسی کے حکم سے اسکی نعماء اہلِ عالم پر تقسیم کرتا ہوں۔

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلعم کی حقیقت، نوری ہے جس کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے۔ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ یعنی کائنات میں سب سے پہلے جو شئی پیدا ہوئی وہ میرا نور تھا۔ نیز فرمایا اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ یعنی میری حقیقت یہ ہے کہ میں اللہ کے نور سے ہوں۔ اسی لئے یہ فرمایا کہ مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاٰءَ اللّٰہ یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ جب رات کے وقت چاند دنیا کو منور کرتا ہے تو اہلِ علم جانتے ہیں کہ وہ تنویر در اصل سورج کی ہوتی ہے اسی طرح رسول اللہؐ کا دیدار دراصل اللہ ہی کا دیدار ہے کیونکہ حضورؐ کا نور (نور یا حقیقۃ محمدیہ) اللہ تعالیٰ کے نور سے مستفاد ہے۔۱۲:

دوسری رباعی پر

حلِ لغات:۔ چو خود را در کنار خود الخ یہ مصرعہ نہیں ہے بلکہ اقبال کے طریق فکر اور نظام فلسفہ کا خلاصہ ہے، افسوس کہ اس جگہ اس کی تفصیل نہیں لکھ سکتا اتنا اشارہ کافی ہے کہ "خود را در کنار خود کشیدن" کا مطلب وہی ہے جو اس مصرعہ کا ہے:۔

؎ "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی"

لفظی معنی تو آسان ہیں "اپنے آپ کو اپنے آپ میں یا اپنی آغوش میں لینا" یہ معنی تو ہر شخص جانتا ہے اور جان سکتا ہے، جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہ طریق کشیدن ہے یعنی میں اپنے آپ کو اپنی آغوش میں کیسے اور کیونکر لے سکتا ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نظریہ نہیں جو گفتگو ہو سکے۔ یہ تو پریکٹیکل بات ہے، اس لئے صرف عمل سے سمجھ میں آ سکتی ہے اُستاد پہلے "نفیوری" بتاتا ہے کہ آکسیجن اندر

ہائیڈروجن کو ایک خاص تناسب سے ملاؤ تو پانی بن جاتا ہے۔ چونکہ زبانی قیل وقال سے پانی نہیں بن سکتا، اسلئے اُستاد "لیبارٹری" میں لے جاکر "عمل" کے ذریعہ سے دونوں غاذوں کو ملاکر پانی بناکر دکھا دیتا ہے۔

اسی طرح مرشد پہلے "تھیوری" بتاتا ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو اپنی آغوش میں خوب کھینچ کرلے لوگے تو معرفتِ نفس حاصل ہو جائیگی۔ چونکہ زبان سے کہدینے سے معرفت حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے مرشد "خانقاہ" میں لے جاکر "عمل" (مراقبہ ومجاہدہ) کے ذریعہ سے معرفتِ نفس عطا کرکے دکھا دیتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح سائنس، عمل کا نام ہے اُسی طرح تصوف بھی عمل ہی کا نام ہے اور اسی عمل صالح سے وہ معرفت حاصل ہوتی ہے جو مقصدِ حیات ہے ÷ ہنوز تو مقامِ خویش دیدم یعنی سرکار دوعالمؐ کی اتباع کے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کسی شخص کو معرفتِ نفس حاصل نہیں ہوسکتی ؛

مقامِ خویش ؛ یعنی اپنی حقیقت۔ یہ بہت دقیق نکتہ ہے، تفصیل تو "اقبال اور تصوف" میں لکھوں گا۔ اس جگہ اس قدر لکھنا کافی ہے کہ انسان یا مسلمان "خلیفۃ اللہ" ہے اور عقل کا تقاضا ہے کہ اللہ کے خلیفہ میں اللہ کی صفات کا عکس ضرور پایا جائے۔ پس مسلمان جس قدر اپنے اندر اللہ کی صفات کا رنگ پیدا کریگا اسی قدر اپنی حقیقت سے قریب ہوتا جائے گا۔ بس اتنی صراحت اور ضروری ہے کہ یہ رنگ (صبغۃ اللہ) سرکار دوعالم صلعم کی اتباع کاملہ کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا ؛ دریں دیر سے یہ دُنیا مراد ہے۔ یہ دُنیا ایک عظیم الشان بت خانہ ہے جس میں مختلف انواع واقسام کے بُت رکھے ہوئے ہیں اور سب سے بڑے بُت تین ہیں۔ زن، زمین، زر ؛ نوائے صبحگاہی ؛ پچھلی رات کو اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں الحاح وزاری کرنا۔ سرکار دوجہاں فرماتے ہیں کہ اس کے بغیر دعائی

ترقی محال ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اقبال سرکار ابد قرار کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ حضور! جب میں نے آپ سے محبت کی بدولت آپ کے نور تک رسائی ہوئی اور آپ کے نور سے میں نے اپنی حقیقت معلوم کی کہ میرا مقام تو فرشتوں سے بھی بلند تر ہے۔ اس کے بعد میں نے اس بت خانہ میں، جہاں ہر طرف بت پرستی ہو رہی ہے، اذان دی اور نوائے صبحگاہی کی بدولت، اس بت خانہ میں بت پرستوں کو آپ سے محبت کا درس دیا۔ یعنی میں نے مسلمانوں کو بتایا کہ اے مسلمانو! وزارت اور سفارت ٹھیکوں اور ہوٹلوں کے علاوہ اور ان سے بالاتر ایک اور "عالم" بھی ہے جسے عشق و مستی کی دنیا کہتے ہیں۔

ع اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

پہلی رباعی پر

حل لغات: بہشت خرمے ہست: یعنی یہ دنیا بہت دلکش ہے اس میں ہر قسم کی آسائش موجود ہے یا موجود ہو سکتی ہے۔ نمے ہست: یعنی میں نے اپنے پیغام سے (جو عشق رسول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے) اس کے باشندوں کے اندر کسی حد تک، سوز و گداز (نم)، کا رنگ بھی پیدا کر دیا ہے۔ ہاو ہو نیست: لیکن مسلمان ابھی اس قابل نہیں ہوئے کہ دنیا میں ہنگامہ (انقلاب) برپا کر سکیں۔ درانتظار آدمے ہست: یعنی ابھی دنیا کسی (خاص) آدمی کے ظہور کی منتظر ہے۔

مطلب واضح ہے کہ حضور! آپ کے عاشقوں کی مٹھی بھر جماعت تو ہر وقت آپ کے نام پر سر کٹانے کے لئے تیار ہے لیکن افسوس کہ قوم میں اس وقت کوئی ایسا جانباز رہنما موجود نہیں ہے (نہ کوئی ٹیپو سلطان ہے نہ سید احمد ہے) جو انہیں

باطل کے مقابلہ میں صف آرا کر سکے

نوٹ:۔ آدم سے یہاں فوق البشر بھی مراد ہو سکتا ہے اور ارباب علم جانتے ہیں کہ اقبال کا فوق البشر دنیا کے لئے سراسر رحمت ہوگا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو مامور نفرمائے اسلامی طرز کا انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ یہ کام نہ دو چار کتابیں پڑھ لینے سے ہو سکتا ہے۔ نہ اسلامی جماعتیں بنانے سے بلکہ اس کے لئے شدید روحانی طاقت درکار ہے جو بواسطۂ مرشد کامل، صرف سرکار دو عالم کے قلب مطہر سے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ حضورؐ کا سینۂ مبارک بفحوائے "اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ" تمام روحانی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ مثلاً حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا، لیکن اس سے پہلے انہوں نے کئی سال تک اکبرآبادی مسجد مرحومہ (دہلی) کے حجرہ میں بیٹھ کر حضرت شیخ عبدالقادر صاحبؒ کے واسطہ سے سرکار دو عالم صلعم سے روحانی طاقت بھی تو حاصل کر لی تھی ۱۲

دوسری رباعی بر ص ۲

مطلب:۔ چونکہ دنیائے اسلام اس وقت چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں محصور ہے۔ اس لئے اے میرے آقاؐ! میں آپ سے التجا کرتا ہوں، کہ آپ ازراہِ کرم، قوم میں کوئی ایسا نوجوان نامزد پیدا کر دیجئے۔ جو:۔

(۱) پاک باز ہو، متقی ہو، اور مرغ پلاؤ کے بجائے نان جویں کھاتا ہو۔

(۲) اور وہ اسلامی رنگ میں رنگین ہو۔

"شراب خانہ ساز" اقبال کی خاص اصطلاح ہے یعنی اسلامی روایات۔

(۳) اس کا بازو حیدر کرارؓ کے بازو کی طرح قوی ہو کہ اگر وہ میدانِ جہاد میں اسی

دور کے "مرحب" کے سر پر تلوار ماری تو راکب کے ساتھ مرکب کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔
(۴) اس کا دل دونوں جہان سے غنی ہو۔ یعنی صرف اللہ کی خوشنودی مد نظر ہو۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ جب تک رہنما میں حیدرِ کرارؓ کا رنگ نہ ہو، کامیابی نہیں ہوسکتی اور اہلِ علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حیدرِ کرارؓ ہم مسلمانوں کے لئے عشقِ رسولؐ کا بہترین نمونہ ہیں:

پہلی رباعی ص۲۳۔

حل لغات:۔ بیا ساقی! اقبال نے والہانہ انداز میں سرکارِ دو عالم صلعم سے نگاہِ کرم کی آرزو یا درخواست کی ہے۔ "بیا" میں پوشیدہ طور پر طلب صادق کا تعلق پایا جاتا ہے۔ جامِ مے سے محبت کی شراب مراد ہے۔ سوزِ ندہ تر سے مراد یہ ہے کہ اپنی محبت کی بدولت میرے کلام میں اور بھی تاثیر پیدا کر دیجئے۔ آن دل بنہ الخ یعنی مجھے ایسی طاقت عطا کر دیجئے کہ میں بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکوں۔ بپیچم پنجۂ کاؤس الخ کہ میں نامور بادشاہوں کو مغلوب کرسکوں۔ پنجہ کسے پیچیدن یعنی کسی کو مغلوب کرنا یا شکست دینا کاؤس اور کے، قدیم ایران کے مشہور بادشاہ گذرے ہیں۔ ۱۲۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشقِ رسولؐ دُنیا میں کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔

دوسری رباعی ص۲۳۔

حل لغات:۔ یہ مشکل رباعیوں میں سے ہے اس لئے بہت غور طلب ہے ۱۲۔
جہاں از عشق داست، یعنی اس کائنات کی تخلیق کا سبب عشق کا جذبہ ہے یعنی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیّاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ میں ایک مخفی خزانہ تھا

میں نے چاہا (جذبہ عشق و محبت) کہ میں پہچانا جاؤں (کوئی میرا عاشق ہو) اس لئے میں نے کائنات کو پیدا کر دیا۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں:۔

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابن آدم سرے از اسرارِ عشق

عشق از سینۂ تست۔ یہ بات بہت تفصیل طلب ہے مختصراً یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کی تخلیق کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے نورِ محمدی (جسے حقیقتِ محمدی یا حقیقت الحقائق بھی کہتے ہیں) کو پیدا کیا۔ اس نور میں دو شانیں تھیں۔ یہ اللہ ہی کے نور کا پرتو تھا۔ اسلئے اس میں صفاتِ الٰہیہ کا رنگ بدرجۂ اتم جلوہ گر تھا اور چونکہ مخلوق تھا اس لئے اس میں بشریت کا رنگ بھی تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی نور کے واسطے سے کائنات کو خلق فرمایا۔ جب یہ نورِ محمدی، بتقاضائے ذاتِ خویش، اپنی اصل کی طرف مائل ہوا۔ کیونکہ (کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ہر شے قدرتی طور پر اپنے اصل کی طرف مائل ہوتی ہے) تو اس میلان کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں عشق کا رنگ پیدا ہو گیا یعنی جزو اپنے کل پر عاشق ہو گیا۔ (جس طرح ہر مسلمان، سرکارِ دو عالم پر عاشق ہے)۔ پس حضورؐ میں عشق کا رنگ پیدا ہو گیا اور اس لئے حضورؐ ساری کائنات کے لئے عشق کا منبع بن گئے۔ کیا خوب کہا ہے جامیؒ نے:۔

ع وَصَلَّی اللہُ عَلٰی نورٍ کزو شد نورہا پیدا

یعنی تمام اقسام کے نور حضورؐ ہی کے نور سے پیدا ہوئے ہیں: سرورش از مئے دیرینہ الخ اور اس عشق میں جو سرور اور کیف ہے وہ سب آپؐ کی ذات کی بدولت ہے۔ یعنی آپؐ کی ذات منبعِ عشق و سرور ہے: پاک جوہر از آئینۂ تست:۔ یعنی جبریلؑ کو حضورؐ سے وہی نسبت ہے جو "جوہر" کو آئینہ سے ہے یعنی اگر آئینہ نہ ہو تو جوہر کا ظاہر ہونا ممکن ہے۔ حضرت جبریلؑ، آپؐ کے آئینہ کے جوہروں سے ایک

جوہر ہیں۔ یہ بہت بلیغ مصرعہ ہے اور بہت سی معنوی اور ظاہری خوبیوں کا حامل ہے۔

(۱) جوہر اور آئینہ میں مناسبت ہے کیونکہ شعراء اپنی اصطلاح میں تابش یا صیقل آئینہ کو "جوہر" سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

(۲) جوہر میں صفت ایہام پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے دو معنی ہیں۔

(ا) جوہر منطق کی اصطلاح میں اُسے کہتے ہیں جو قائم بالذات ہو۔ اس کی ضد عرض ہے۔ یعنی وہ شئی جو قائم بالغیر ہو۔

(ب) جوہر بمعنی تابش یا چمک یا خوبی یا حُسن یا کمال۔

(ج) جوہر کے تیسرے معنی ا میں واضح کر دیئے ہیں یعنی آئینہ کی پالش۔

(۳) جوہر اگرچہ معناً اور اصطلاحاً جوہر ہے یعنی عرض کی ضد ہے، لیکن اقبال کا کمال فن ملاحظہ ہو کہ یہاں جوہر کو عرض ثابت کیا ہے۔ چنانچہ "یک جوہر از آئینہ" سے ثابت ہے کہ وہ جوہر، عرض ہے کیونکہ آئینہ کی بدولت قائم ہے۔ یہاں جوہر سے مراد صیقل ہے اور ظاہر ہے کہ صیقل، بذات خود قائم نہیں ہو سکتی۔ یعنی

(۴) جبریل کا وجود، سرکار دو عالم کے وجود پر منحصر ہے۔

(۵) آئینہ سے ذات یا حقیقت یا نور محمدی مراد ہے۔ جو اپنی اصل کے لحاظ سے بلاشبہ آئینہ ہے۔ کیونکہ حضور کی اصل نوری ہے اور نور کی تعریف یہ ہے کہ نور وہ ہے جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسروں کو بھی ظاہر کر دے۔ یعنی حضور خود بھی عیاں ہیں اور آپ ہی کی بدولت یہ کائنات بھی مشہود ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت جبریل آپ کو علم دیتے تھے لیکن اقبال نے اس رباعی میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ خود جبریل کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ آپ کی قوت آخذہ یعنی علم عاقل

کرنے کی قوت ہے جو مصلحت ایزدی متمثل ہو کر جبریلؑ کے نام سے معروف ہو گئی ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر حضرت ابن عربیؒ نے اس قوتِ آخذہ کو ملکۂ نبوت سے تعبیر کیا ہے۔

پہلی رباعی پر

حل لغات:- ایں سوز یعنی کیفیت عشق ‖ فیض دمِ تُست یعنی بہ سبب آپؐ کا روحانی فیض ہے ‖ تاکم لفظی معنی ہیں میرے انگور کی بیل ہیں۔ مراد ہے شاعر کی شخصیت ‖ موجِ مئے سے عشق و مستی مراد ہے اور زمزم سے سرکارؐ کا روحانی فیض مراد ہے جو سبز گنبد سے نکل کر ساری دُنیا کو سیراب کر رہا ہے ‖ خجل ملک جم الخ یعنی میری فقیری جمشید کی بادشاہت سے افضل ہے ‖ کیوں افضل ہے اس کا جواب چوتھے مصرعہ میں ہے یعنی میرے دل میں حضورؐ کی محبت ہے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصوّر یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں حضورؐ کی محبت ہے وہ جمشید سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

دوسری رباعی پر

حل لغات:- دریں بتخانہ۔ کنایہ ہے اسی دُنیا سے ‖ دل باکس نہ بستم یعنی کسی سے محبت نہیں کی ‖ از مقام خود گسستم یعنی میری عزت اور توقیر بھی واقع ہو گئی ‖ دی بمعنی گذرا ہوا دن یا گذری ہوئی رات ‖

مطلب:- عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! اگرچہ میں نے بذاتِ خود دُنیا سے دل نہیں لگایا لیکن چونکہ میری قوم کی اکثریت، دنیا کی طرف مائل ہو چکی ہے اس لئے میں بھی

اپنے مقام (مقامِ عزت) سے نیچے گر گیا ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج وہ قوم مجھ سے اطاعت کا مطالبہ کر رہی ہے جس پر میں نے کل تک حکومت کی تھی۔ یا جس خدا کو کل میں نے شکست دی تھی، آج مجھ سے سجدہ کا طلبگار ہے!

بنیادی تصور یہ ہے کہ جب کوئی قوم عزت کے مقام سے محروم ہو جاتی ہے تو کوئی شخص اس قوم کے افراد کی عزت نہیں کرتا۔ کیا خوب لکھا ہے عارفِ شیراز نے:-

چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

پہلی رباعی بر ص۵۲

حلِ لغات:- لالہ۔ کنایہ ہے قلبِ عاشق۔ مشتِ غبارم سے شاعر کی شخصیت مراد ہے۔ می تراود۔ ٹپک رہا ہے۔ کنارم میرے پہلو سے۔

مطلب واضح ہے کہ حضورؐ! میرے پاس صرف ایک دل ہے، جس میں آپؐ کی محبت بسی ہوئی ہے۔ یہی محبت بھرا دل میں آپؐ کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشق کی نگاہ میں دل سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے جو وہ معشوق کی بارگاہ میں پیش کر سکے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ حضورؐ میرے پاس دل کے علاوہ اور کوئی شے ہے بھی تو نہیں جو پیش کر سکوں۔ ۱۲-

دوسری رباعی بر ص۵۲

مطلب:- یہ رباعی سہلِ ممتنع کی بہت عمدہ مثال ہے۔ بظاہر کوئی لفظ مشکل نہیں ہے، لیکن مطلب بیان کرنا مشکل ہے، عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقاؐ! میں نے اپنی قوم میں فقیرانہ (عاشقانہ) رنگ میں زندگی بسر کی (اور) عاشقانہ

زندگی کی بدولت، قوم کو عشق کا پیغام دیا۔ چونکہ حضورؐ کے سامنے طویل گفتگو بے ادبی میں داخل ہے اس لئے بس صرف تین لفظوں میں اپنی داستانِ حیات عرض کئے دیتا ہوں: ع تپیدم، آفریدم، آرمیدم
یعنی میں نے حضورؐ سے محبّت کی، قوم کو حضورؐ سے محبّت کا درس دیا اور پھر جب وقت آئیگا تو حضورؐ ہی کی محبّت کو رفیق راہ بنا کر رخصت ہو جاؤں گا۔

بنیادی تصوّر:۔ عاشق کی زندگی از سرتا پا عشق سے عبارت ہوتی ہے۔

نوٹ:۔ چوتھے مصرعہ میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

(۱) تپیدن کے تین معنی ہیں، ایک تو تڑپنا یعنی محبّت کرنا، دوسرے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا۔ تیسرے معنی ہیں غور و فکر کرنا۔

(۲) آفریدن کے تین معنی ہیں ایک تو اپنا تصوّر یا خیال پیش کرنا دوسرے معنی ہیں دوسروں کو تڑپانا، تیسرے معنی ہیں نئی جماعت پیدا کرنا۔

(۳) ان تین لفظوں میں ایک منطقی ربط بھی پایا جاتا ہے۔ پہلے انسان خود تڑپتا ہے یا تڑپنے کا فن سیکھتا ہے پھر دوسروں کو تڑپا سکتا ہے۔ پہلے خود کسی مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے پھر اس میں کامیابی حاصل کرتا ہے یعنی دنیا کو اپنی جدوجہد کے ثمرات سے مستفید کرتا ہے۔

(۴) آرمیدن کے معنی تو آرام کرنا بیشک ہیں لیکن یہاں اپنی وفات کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اقبال کے فلسفہ میں آرام یا سکون یا قرار کی کہیں گنجائش نہیں ہے

پہلی رباعی پر

حلّ لغات:۔ بصدق فطرت رندانہ الخ۔ بصدق میں بے وسیلہ کے معنی میں ہے یعنی میری عاشقانہ فطرت کی سچائی کے وسیلہ سے۔ صدق سے یہاں سچائی

کے علاوہ خلوص یا پاکیزگی بھی مراد ہو سکتی ہے ⁂ بسوزِ آہ الخ یعنی میری بیتاب آہوں کے سوز کے وسیلہ سے ⁂ خاک۔ کنایہ ہے شخص سے۔ دانہ سے پیغام مراد ہے ⁂

مطلب:۔ اے میرے آقاؐ! میں آپؐ سے التجا کرتا ہوں کہ جو شخص میرے پیغام پر عمل کرنے کی کوشش کرے یا جو شخص آپؐ سے محبت کرے، آپؐ میری فطرتِ رندانہ اور آہ بیتابانہ کے وسیلہ سے اُس پر نگاہِ کرم فرمائیں۔

بنیادی تصور:۔ اقبال اُن مسلمانوں کے لئے بارگاہِ رسالت میں دُعا کر رہے ہیں جو حضورؐ سے محبت کرتے ہیں ⁂

دوسری رباعی بر صفحہ

مطلب:۔ اے میرے آقاؐ! میں نے مسلمانوں کو اپنا دردِ دل سُنایا یعنی اُن کو عشق کا پیغام دیا لیکن اُنہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ میں نے عشق کی دولت اُن کے سامنے پیش کی لیکن اُنہوں نے اس جوہر کی قدر نہیں کی۔ اس لئے میں آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ میرے دل میں تشریف فرما ہو جائیں تا کہ تنہائی کی اذیت سے نجات حاصل ہو سکے۔ میں اتنی بڑی دُنیا میں بالکل تنہا ہوں ⁂

بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال نے بارگاہِ رسالت میں مسلمانوں کی غفلت شعاری اور دُنیا طلبی کی شکایت کی ہے، یہ مضمون اس سے پہلے بھی گذر چکا ہے ⁂

پہلی رباعی بر صفحہ

مطلب:۔ عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقاؐ! میں نے بھی رومیؒ کی طرح آپؐ کا لایا ہُوا پیغام دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ انہی سے میں نے اسلام کے حقائق و معارف حاصل کئے ہیں۔ جس طرح انہوں نے ساتویں صدی ہجری میں

اپنے زمانہ کی تمام خلافِ اسلام تحریکات کا مقابلہ کیا تھا، اُسی طرح میں نے بھی اس زمانہ میں تمام خلافِ اسلام تحریکات کا مقابلہ کیا ہے ؀

بنیادی تصوّر:۔ اقبالؔ، سرکارِ دو عالم صلعم کے حضور میں اپنی کارگذاری اور خدمات دینی و ملّی کی روداد پیش کر رہے ہیں ؀

نوٹ:۔ ہمارے لئے اقبالؔ نے اپنی پوزیشن واضح کر دی ہے یعنی رومیؒ کے شاگرد ہیں اور اسلام کے مُبلّغ ہیں ۱۲ ؀

دوسری رباعی پر

مطلب:۔ اے میرے آقاؐ! میں آپ سے ملتجی ہوں کہ آپؐ میری زندگی (خاک) کو اس قدر بابرکت اور بارآور بنا دیجئے کہ میرے پیغام سے مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑ جائے اور میرے جذبۂ عشق میں ایسی تاثیر پیدا کر دیجئے کہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہو جائے۔ میری آرزو تو یہ ہے کہ میں بھی حضرت علیؓ کی طرح جہاد بالسّیف کروں لیکن اگر میں اس بلند مقام کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم میرے اندر اُن کا سا جذبۂ عشق ہی پیدا کر دیجئے۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبالؔ اپنے لئے دعا کرتے ہیں کہ میرا وجود، ملّت کے حق میں مفید ثابت ہو اور کم از کم حضرت علیؓ کی سی مومنانہ فراست میرے اندر بھی پیدا ہو جائے ؀

پہلی رباعی پر

مطلب:۔ عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! میری قوم چونکہ عیش طلب اور کاہل ہو گئی ہے، اس لئے دُنیا کی طاقتوں کے سامنے خجل ہو گئی ہے اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو گئی ہے۔ ترکِ عمل اور ترکِ جہاد سے مسلمانوں کو جس قدر نقصانات پہنچے ہیں، اس زمانہ

میں میرے علاوہ اور کسی شخص نے اُن کا صحیح اندازہ نہیں کیا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبالؔ نے بارگاہِ رسالتؐ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے اور ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب تک ہمارے اندر آرام طلبی اور عیش پسندی کا مرض باقی ہے، ہم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ذلیل رہیں گے:

دوسری رباعی پر

مطلب:۔ اے میرے آقاؐ! اس دورِ انحطاط اور عالمِ مایوسی میں، میں نے اُن کو یہ مژدہ سنایا کہ اے مسلمانو! مایوس مت ہو۔ سرکارِ دو عالم صلعم کا فضل ضرور تم پر نازل ہو گا اور تمہیں پھر دُنیا میں سربلندی نصیب ہو گی۔ اور جب ان کے دلوں سے آپؐ کی محبت نکل گئی تو پھر میں نے اُن کو آپؐ سے محبت کا درس دیا۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبالؔ، سرکارِ دو عالمؐ کی بارگاہ میں، اپنی خدمات کا تذکرہ کر رہے ہیں:

پہلی رباعی پر

حلِ لغات:۔ زبحرِ خود۔ بحر سے سرکارِ دو جہاںؐ کی ذاتِ قدسی صفات مراد ہے: بجوئے من۔ جو سے ذاتِ شاعر مراد ہے۔ اقبالؔ نے حضورؐ کو بحر سے اور اپنے آپکو نہر یا دریا سے تشبیہہ دی ہے تاکہ فرقِ مراتب قائم رہے گہر سے فیضانِ رسالتؐ مراد ہے: متاعِ من سے حقائق و معارف کے وہ موتی مراد ہیں جو اقبالؔ سرکارِ دو عالمؐ سے طلب کر رہے ہیں: کوہ و دشت و در سے ساری دُنیا اور دنیا والے مراد ہیں: دلم نکشود یعنی میں مطمئن نہیں ہُوا یا مجھے تسکین حاصل نہیں ہوئی: ازاں طوفاں۔

طوفاں سے نگاہِ کرم یا جذبۂ عشق یا فیضانِ روحانی مراد ہے۔ شورے: شورے میں یائے تخصیصی ہے یعنی ایک خاص قسم کا جذبہ۔ طوفانِ دگر سے نگاہِ خصوصی مراد ہے۔

مطلب:۔ اے میرے آقا! میں آپؐ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھ پر نگاہِ کرم فرمائیے اور میرے سینہ کو حقائق و معارف سے معمور کر دیجیئے تاکہ میں اِس نعمت کو عام کر سکوں یہ سچ ہے کہ آپؐ نے قبل ازیں مجھ پر نگاہ کرم فرمائی لیکن اُس سے سیری نہیں ہوئی اس لئے میں آپؐ سے نگاہِ خصوصی کا طالب ہوں۔

بنیادی تصوّر:۔ عاشق ہمیشہ اپنے محبوب سے عنایاتِ خصوصی کا تقاضا کرتا رہتا ہے کیونکہ اُسے جلووں سے سیری نہیں ہوتی "طوفانے دگر" کی ترکیب، اقبال کی طلب کی شدت پر دلالت کرتی ہے۔

دوسری رباعی نمبر ۷۹

حلِ لغات:۔ بجلوت: یعنی جب میں لوگوں سے ملتا ہوں۔ نے نوازی سے تبلیغِ حق یا تبلیغ و اشاعتِ اسلام مراد ہے۔ بخلوت یعنی جب میں تنہا ہوں۔ خود گدازی سے آتشِ فراق میں جلنا مراد ہے۔ گرفتم یعنی حاصل کردم۔ نکتۂ فقر یعنی طریقۂ فقر جو اسلام کی روح ہے۔ نیاگانِ سلف مثلاً مولانا رومیؒ عارف جامیؒ یا حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ سلطاں سے دنیاوی بادشاہ مراد ہیں۔ بے نیازی سے بے تعلقی مراد ہے۔

مطلب:۔ اے میرے آقا! میری زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ جب میں لوگوں سے ملتا ہوں تو اُنہیں آپؐ کے پیغام سے آگاہ کرتا ہوں اور جب تنہا ہوتا ہوں تو آپؐ کی یاد میں یا آپ کی محبت میں اپنے آپؐ کو فنا کرتا ہوں، چونکہ میں نے بزرگانِ دین کی تصانیف کے مطالعہ سے طریقِ فقر اخذ کیا ہے، اسلئے میں بادشاہوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبال نے سرکارِ دو عالم کی بارگاہ میں اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے :

پہلی رباعی پر نمبر ۵

مطلب:۔ عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقا! میں جس حال میں بھی رہا، آپ کا پیغام دنیا کو سناتا رہا اور مسلمانوں کو آپ کی اتباع کی تلقین کرتا رہا اور دین کے حقائق و معارف و انکشاف بیان کرتا رہا۔ یہ تو میری زندگی کا ظاہری پہلو ہے، اب رہا باطنی پہلو، تو اس کا حال کیا بیان کروں۔ عشق نے مجھے ایسا مضطرب کر رکھا ہے کہ اس حالت کو بیان نہیں کر سکتا۔ بس ایک حالت بیخودی طاری ہے کبھی ہوش میں آجاتا ہوں تو اپنے کو موجود سمجھنے لگتا ہوں اور جب بیخودی طاری ہوتی ہے تو معدوم ہو جاتا ہوں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب آپ کے روحانی فیوضات کی تجلی ہوتی ہے تو موجود ہو جاتا ہوں اور جب تجلی رک جاتی ہے تو معدوم ہو جاتا ہوں :

بنیادی تصوّر:۔ اقبال نے اس رباعی میں صوفیاء کے مشہور عقیدہ "تجدّدِ امثال" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسکی تفصیل کا تو یہ موقع ہے نہیں کیونکہ یہ شرح طلبہ کے لئے ہے نہ کہ صوفیہ کے لئے۔ بس اتنا لکھنا کافی ہے کہ صوفیاء کے عقیدہ کی رُو سے انسان، بذاتِ خود تو معدوم ہے، اس لئے اس کا وجود ظاہر تجلیاتِ ربانی کا کرشمہ ہے، یہ تجلیات ہر لمحہ اور ہر آن نت نئی ہوتی رہتی ہیں ہر تجلی کے ساتھ انسان موجود ہوتا ہے اور اس کے بعد معدوم ہو جاتا ہے، دوسرے لمحہ میں نئی تجلی ہوتی ہے تو پھر موجود ہو جاتا ہے۔ غرض ہر لمحہ فنا طاری ہوتی ہے اور ہر لمحہ نئی زندگی ملتی ہے۔ فنا و بقا کا یہ سلسلہ اس قدر سرعت کے ساتھ ہوتا ہے کہ تصوّر میں نہیں آسکتا۔ اس نکتہ کو شعلۂ جوالہ کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں جس طرح

گردشِ پیہم سے آگ کی گیند، جس کو کسی لکڑی سے مربوط کر دیا جاتا ہے، جو ایک نقطہ ہے، ایک دائرہ نظر آتی ہے اُسی طرح تجلیات نزول پیہم سے حیات انسانی مسلسل معلوم ہوتی ہے ؛

دوسری رباعی بر صؐ

حل لغات :۔ شریک دردو سوز لالہ الخ یعنی میں ساری عمر اپنی قوم کے افراد کے درد میں شریک رہا ؛ ضمیر زندگی سے حیات انسانی کے حقائق مراد ہیں ؛ نکتۂ شوق سے عشق رسولؐ کا پیغام مراد ہے ؛

مطلب واضح ہے کہ اگرچہ میں ساری عمر قوم کو آپؐ کی محبت کا درس دیتا رہا لیکن قوم اس طرف متوجہ نہیں ہوئی۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال نے حضورؐ کی خدمت میں قوم کی غفلت کا شکوہ کیا ہے؛

پہلی رباعی بر صؐ

حل لغات :۔ بنور تو برافروزم الخ یعنی میں آپؐ کے نور سے اپنے قلب کو منور کرنا چاہتا ہوں ؛ کہ بینم اندرون الخ تاکہ اپنی ادر کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو سکوں ؛ کہ دانم مشکلات الخ یہ بہت بلیغ مصرعہ ہے، مطلب یہ ہے کہ لاالٰہ الا اللہ زبان سے کہہ دینا تو بہت آسان ہے لیکن اس کے مفہوم پر عمل کرنا بہت مشکل ہے :۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کلمۂ طیبہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں ایک اللہ کے سوا نہ کوئی خالق ہے، نہ رازق ہے، نہ مالک ہے، نہ حاکم ہے، نہ دستگیر ہے، نہ مطلع ہے نہ بادشاہ ہے، نہ نفع اور نہ نقصان پہنچانے والا ہے، نہ مطلوب ہے، نہ مقصود ہے، نہ

معبود ہے نہ مؤثر فی الوجود ہے اور نہ حقیقی معنی میں موجود ہے۔ جب حقیقت حال یہ ہے تو پھر ایک مسلمان اس کائنات میں نہ کسی کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتا ہے نہ کسی کو سجدہ کر سکتا ہے، نہ کسی کی اطاعت کر سکتا ہے نہ کسی کو اپنا آقا اور حکمران تسلیم کر سکتا ہے، نہ کسی کو اپنا مقصود اور معبود بنا سکتا ہے نہ کسی کی عبادت کر سکتا ہے اور نہ کسی کی ہستی سے مرعوب ہو سکتا ہے۔

لیکن اس کائنات میں ہر زمانہ میں، نمرود اور فرعون پیدا ہوتے رہتے ہیں جو انسانوں کو اپنا غلام بناتے رہتے ہیں اور اُن کو اپنے قانون کی اطاعت پر مجبور کرتے ہیں اور جو لوگ ان کی اطاعت نہیں کرتے ان کو ہر قسم کی ایذا پہنچاتے ہیں پس جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ لا الہ الا اللہ تو اس کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کے حکمرانوں کے خلاف، اعلانِ جنگ کر دے، بلکہ آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ یہ کلمۂ طیبہ تمام باطل خداؤں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے یعنی اس کلمہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے جو ہر وقت سر بکف رہے۔

چونکہ سر بکف رہنے کے لئے بڑی ہمت درکار ہے اس لئے اقبال بہ بارگاہ دو عالم صلعم سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ مجھے اپنا نور عطا فرمائیں تاکہ میرے دل کی آنکھیں منور ہو جائیں اور اس کی بدولت میں اس حقیقت سے آگاہ ہو جاؤں کہ واقعی ساری کائنات میں اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ (معبود، مطلوب، مقصود، مؤثر فی الوجود اور موجود) نہیں ہے جب یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو جائیگی تو یقیناً مجھ میں باطل خداؤں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔

مطلب واضح ہو گیا۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر مسلمان، لا الہ الا اللہ کے صحیح مفہوم سے آگاہ ہو جائے تو وہ اللہ کے سوا کسی ہستی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتا۔ اور اس کلمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں

کوئی ہستی حقیقی معنی میں فاعل اور موثر نہیں ہے کیونکہ حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں ہے۔ جب کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے تو پھر اس کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کائنات میں بظاہر ہم کو بہت سی اشیاء موجود نظر آتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی ہے کائنات میں اللہ کے سوا کسی کا وجود حقیقی یا مستقل بالذات نہیں ہے۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں درج کر چکا ہوں وہاں دیکھ لیجئے۔

نوٹ:۔ اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ پر یہ حقیقت منکشف نہ ہو جاتی تو وہ جہانگیر کا مقابلہ کس طرح کرتے؟

دوسری رباعی ص۱۸

مطلب:۔ یا رسول اللہ! میرے لئے یعنی میری کامیابی کے لئے یا منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک آہِ جگر دوز کافی ہے، خوشا نصیب اُس عاشق کے جس کو آپؐ کے کوچہ میں ایک نوائے عاشقانہ سرزد کرنے کا موقع مل جائے کیونکہ اس نوائے عاشقانہ سے سوز و گداز کی جو کیفیت پیدا ہو جائے گی وہ کون و مکان سے بھی افضل ہے!

یا رسول اللہ! میرے لئے آپؐ کی محبت کونین میں سرفرازی حاصل کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپؐ کی محبت ہی میری ابتداء اور وہی میری انتہا ہے جب میں دنیا سے رخصت ہوں تو آپؐ ہی کی محبت میرا توشۂ آخرت ہو۔

اس کے بعد اقبال والہانہ انداز میں سرکارؐ سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں قربان جاؤں اُس عاشقِ رسولؐ کے جس نے خدا سے یہ بات برملا کہہ دی کہ "میرے لئے سرکار دو عالم صلعم کا وجود بالکل کافی ہے"۔

نوٹ:۔ خود اقبال نے بھی پیامِ مشرق میں اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے :۔

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہان و تو پیدائے من

بنیادی تصوّر:۔ اقبال نے چوتھے مصرعہ میں جو بات کہی ہے اس کا منبع یا ماخذ یہ آیت ہے :۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ط یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی دراصل اُس نے اللہ کی اطاعت کی ۔ (۴: ۷۹) اس سے ثابت ہوا کہ جہاں تک اتباع اور اطاعت کا سوال ہے ، اللہ اور رسول اللہ میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ پس اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے سرکارِ دو عالم صلعم کا نبی ہونا تو بالکل ٹھیک کہتا ہے ۔ کیونکہ حضورؐ کی اتباع ، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کیلئے بالکل کافی ہے ۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۸۲

مطلب :۔ یا رسول اللہؐ! میں نے آپؐ کی محبت کی بدولت ایسی طاقت حاصل کرلی ہے کہ پتھر سے پانی نکل سکتا ہے یعنی میری صحبت میں اگر کوئی سنگدل انسان بھی کچھ دنوں بیٹھے تو اس میں عشق کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے ۔ (اشارہ ہے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کی طرف کہ جب انہوں نے اپنا عصا پتھر پر مارا تو چشمے جاری ہوگئے) اسلئے اے میرے آقاؐ! بس میری یہی آرزو ہے کہ یہی رنگِ محبت میرے فرزند دلبند جگر پیوند جاوید (سلمہ الرحمٰن) میں پیدا ہو جائے ۔

بنیادی تصوّر:۔ اس رباعی سے اُس غیر معمولی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو حضرت علامہ مرحوم کو اپنے فرزند سے تھی ۔

نوٹ:۔ چونکہ میں مرحوم کا شاگرد بھی ہوں کہ گلشنِ رازِ جدید اور اسرار و رموز اُن سے سبقاً سبقاً پڑھی تھیں ، اور عقیدتمند بھی ہوں کہ انہی کی صحبت میں بیٹھ کر

میں نے کملی والے آقائے کائناتؐ سے محبت کرنی سیکھی (جس کی تفصیل گلشن راز کی شرح میں بیان کروں گا) اور ممنونِ احسان بھی ہوں، کہ انہی کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھ پر اسلام کے حقائق و معارف آشکار ہوئے اسلئے میں بھی خلوص قلب کے ساتھ جاوید سلمۂ کے لئے دعا کرتا ہوں، کہ اس کے اندر بھی وہی رنگ (عشق رسولؐ) پیدا ہو جائے جس نے اس کے باپ کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

دوسری رباعی بر صـ۸۲

حل لغات:۔ بیکے بنگر۔ یہ ترکیب کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا اپنی بات پر غور کرنے کی دعوت کے لئے مستعمل ہے یعنی ذرا ان فرنگی لڑکیوں کی طرف تو دیکھو! کتنی حسین ہیں! گویا چندے آفتاب، چندے ماہتاب کا مصداق ہیں! فرنگی کجکلاہاں سے فرنگی لڑکیاں مراد ہیں: جوان سادہ من الخ یعنی میری قوم کے نوجوان جو تقاضائے سن و سال عقل و خرد سے عاری ہیں اور جوانی کے جوش میں مست ہیں: نگہدارش ازیں الخ اے میرے آقاؐ! آپؐ انہیں ان شوخ و شنگ، مسلح با تیر و تفنگ لعبتانِ فرنگ کے حملوں سے محفوظ رکھیئے۔

بنیادی تصور:۔ چونکہ اقبال اپنی آنکھوں سے دن رات مشاہدہ کر رہے تھے کہ لعبتانِ افرنگ ہر وقت مسلمان قوم کے نوجوانوں کو اپنی زلفِ گرہ گیر میں اسیر کرتی رہتی ہیں اس لئے انہوں نے بجا طور پر سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں ان کے ایمان کی سلامتی کے لئے دعا کی ہے:

پہلی رباعی بر صـ۸۳

حل لغات:۔ بدہ دستے۔ یا رسول اللہؐ! امداد فرمائیے: زپا افتادگاں را۔

اُن لوگوں کی جو معذور اور درماندہ ہیں، عاجز اور ناتواں ہیں: بغیر اللہ الخ ان لوگوں کی جو افلاس اور پریشانی کے باوجود غیر اللہ کی اطاعت نہیں کرتے: ازاں آتش الخ یعنی جس محبت (عشقِ رسولؐ) سے میرا وجود منوّر ہوگیا: نصیبے وہ الخ سارے مسلمانوں کو اس محبت سے حصّہ عطا فرمائیے:

نوٹ:۔ ص۱۸ پر دوسری رباعی کے ساتھ ذاتی معروضات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد پہلی رباعی میں اقبال، خاص اپنے فرزند کے لئے دعا کرتے ہیں دوسری رباعی میں سب نوجوانوں کے لئے دعا کرتے ہیں اور اس رباعی میں سب مسلمانوں کیلئے دعا کرتے ہیں۔ اس رباعی پر حضورؐ سے التجاؤں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور آئندہ سات رباعیوں میں اقبال نے سلطان ابن سعود والیٔ نجد و حجاز سے خطاب کیا ہے:

دوسری رباعی ص۸۳

حل لغات:۔ تو ہم یعنی اے سلطان ابن سعود! تو بھی: آں مے بگیر یعنی شراب الفت پی: از ساغر دوست سرکار دو عالم کے دستِ مبارک سے: کہ یعنی تاکہ: باشی تا ابد الخ تاکہ تجھے حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے۔ اقبال کی رائے میں ہمیشہ کی زندگی صرف سرکار دو عالم سے محبت کی بدولت مل سکتی ہے اور کوئی صورت نہیں ہے: عبد العزیز یہ سلطان ابن سعود کا ذاتی نام ہے۔ ابن سعود خاندانی لقب ہے: بردہم میں "ب" زائد ہے۔ دہم، دادن کا فعل حال۔ ہے یعنی چھوڑ دیتا ہوں: مژہ بمعنی پلک: دوست سے سرکار دو عالم صلعم کی طرف اشارہ ہے:

بنیادی تصور:۔ چونکہ نجدی وہابی، سرکار دو عالم صلعم سے محبت نہیں کرتے

لہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں راقم الحروف کو گنبدِ خضراء کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو میں نے دیکھا کہ مسجد نبوی میں حضورؐ کے اسمائے مبارکہ میں سے روٗف اور رحیم باقی

اس لئے اقبال نے سچے عاشق رسولؐ کی حیثیت سے سلطان ابن سعود نجدی کو عشق رسولؐ کا پیغام دیا ہے اور نجدیوں کے اس اعتراض کا کہ اہل سنت حضورؐ کے روضۂ مبارک کو سجدہ کرتے ہیں" جواب دیا ہے کہ اے عبدالعزیز! جسے تو اپنی کم فہمی کی بنا پر سجدہ سے تعبیر کرتا ہے، یہ سجدہ تو نہیں ہے، میں تو اپنے محبوبؐ کے دروازہ پر اپنے پلکوں سے جھاڑو دے رہا ہوں۔

نوٹ:۔ علامہ اقبال نے ایک دفعہ ایک وہابی سے فرمایا تھا کہ اگر حضورؐ کے روضہ مبارک کی جالیوں کو بوسہ دینا شرک ہے تو تم اپنے بیٹے کا موتہہ کیوں چومتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ "میں فرطِ محبت سے اپنے بیٹے کے رخسار کو بوسہ دیتا ہوں اس کو اپنا معبود تو نہیں سمجھتا" علامہ نے جواب دیا کہ ہم بھی حضورؐ کو معبود نہیں سمجھتے صرف فرط محبت سے جالیوں کو چوم لیتے ہیں اگر بیٹے کو چومنا شرک نہیں ہے تو جالیوں کو چومنا بھی شرک نہیں ہے۔ سارا دارومدار تو نیت پہ ہے، پس جب ہم رسول اللہ کو اللہ نہیں سمجھتے تو ہم پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

پہلی رباعی نمبر ۵۲

حل لغات:۔ تو سلطان حجازی الخ یعنی اے ابن سعود! تو نجد و حجاز کا حکمران ہے۔ اور میں تیرے سامنے اگرچہ فقیر ہوں۔ ولے در کشورِ معنی الخ لیکن جہاں تک اسلام کی حقیقت سے آگاہی کا سوال ہے تو میرے سامنے فقیر ہے

حاشیہ ۱۴۹۔ یہ نام مٹے ہوئے ہیں۔ میں نے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نجدیوں کو ان ناموں سے شرک کی بو آتی ہے اس پر میں نے کہا کہ بات تو عجب ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ان لفظوں کو خارج کر دیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَبِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ الرَّحِيمٌ ۱۲

اور میں امیر ہوں ؛ جہانے میں یائے توصیفی ہے یعنی وہ جہان جو توحید الٰہی کے عقیدہ اور اس کے اقتضاء پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے ؛ بیا بنگر الخ وہ جہان وہ عالم یا وہ رنگ میرے دل میں بخوبی جلوہ گر ہے ؛

مطلب یہ ہے کہ میں تجھ سے بہتر موحد ہوں کیونکہ اللہ کے سوا کسی کو مستقل طور پر موجود بھی نہیں مانتا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر غیر اللہ کو، اللہ کی صفات میں شریک قرار دینا شرک ہے تو صفتِ وجود میں شریک قرار دینا بدرجۂ اولیٰ شرک ہے۔ کیا یہ صریح شرک نہیں ہے کہ خدا بھی موجود ہے اور ہم بھی موجود ہیں ؟ اگر دو خالق نہیں ہو سکتے تو دو موجود بھی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خدا کا وجود اور ہے ہمارا وجود یعنی (ہمارے وجود کا مفہوم) اور ہے۔ یعنی خدا تو بذاتِ خود موجود ہے، اس کا وجود حقیقی ہے۔ اور ہم اس کے وجود کا پرتو ہیں یعنی ہمارا وجود محض ظلّی ہے، اس کی مزید تفصیل مقدمہ میں دیکھ لیجئے۔ ۱۲۔

دوسری رباعی نمبر ۸ صفحہ ۱۲

مطلب :۔ اقبال سلطان ابن سعود سے خطاب کرتے ہیں کہ تو یہ مت سمجھ کہ میں تباہ حال خستہ اور پریشان ہوں۔ یہ ضعف اور عاجزی اسلئے ہے کہ میں ملّت اسلامیہ کے غم میں نڈھال ہو رہا ہوں۔ بیشک میں ملّتِ اسلامیہ کے ترکش سے نکلا ہوا ایک تیر ہوں، لیکن بیکار تو نہیں ہوں، اگر قوم کے دل میں یا تیر اندر تبلیغ و اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہو جائے (جو نہ اب تک پیدا ہوا اور نہ آیندہ پیدا ہونے کی اُمید ہے) تو میں بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہوں ؛

بنیادی تصور :۔ اقبال نے اس رباعی کے چوتھے مصرعہ میں اپنی حالتِ زار

کا نقشہ کھینچ دیا ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے" چونکہ ساری قوم تبلیغ واشاعت اسلام کے جذبہ سے عاری ہو چکی ہے، اس لئے اس مصرعہ پر مزید تبصرہ بے سود ہے :

پہلی رباعی بر ص۸۵

مطلب: ۔ اقبال، ابن سعود سے کہتے ہیں کہ اگر تم اتباعِ رسولؐ کے دعویٰ میں سچے ہو تو آؤ ہم دونوں ملکر تبلیغ واشاعت اسلام کریں۔ اس رباعی کے پہلے مصرعہ میں جو "درآ، بنیم وقصیم" آیا ہے اس سے دراصل ناچنا مراد نہیں ہے کیونکہ میں بخوبی واقف ہوں کہ اقبال فن رقص سے بالکل نابلد تھے۔ (ہاں اگر وہ اس وقت کراچی میں ہوتے تو ضرور اس میں مہارت حاصل کر لیتے) پس رقص سے مراد وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ اقبال نے یہ لفظ اپنی ہر تصنیف میں اسی معنی میں استعمال کیا ہے مثلاً جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:۔

رقصِ تن در گردش آرد خاک را
رقصِ جاں برہم زند افلاک را

بزرگانِ دین کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی کہ جب تک روح پر حالت رقص طاری نہ ہو جائے کوئی شخص تبلیغ واشاعت اسلام نہیں کر سکتا جسے شک ہو وہ خواجہ اجمیریؒ یا مخدوم ہجویریؒ کے سوانح حیات کا مطالعہ کر لے : پھر کہتے ہیں آؤ ہم تم دونوں دنیا پر لات ماردیں اور سرکار دو عالمؐ سے محبت میں زندگی بسر کریں (عشق رسولؐ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عاشق تبلیغ واشاعت اسلام میں منہمک ہو جاتا ہے) اے ابن سعود آ! ہم دونوں مدینہ کی گلیوں کو اپنے آنسوؤں سے شاداب

کردیں اور عشق رسولؐ میں مست ہوکر دنیا کو حضورؐ کے پیغام سے روشناس کردیں۔

بنیادی تصور:۔ اقبالؔ نے ابن سعود کے پردہ میں مسلمانوں کو رقص یعنی عشقِ رسولؐ کا پیغام دیا ہے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ کی جراُت واقعی قابلِ داد ہے کہ وہ ریت میں سے تیل نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا درس دے رہے ہیں" جبکہ بقول اکبرؔ۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دوسری رباعی ص۸۵

حلِ لغات:۔ ترا اندر الخ بیاباں نے میں یائے توصیفی ہے یعنی اے ابن سعود! تو ایسے ریگستان میں رہتا ہے جس کی شام بھی صبح کی طرح روشن ہے۔ بہرحال یہ کہ اللہ یعنی خدا نے تجھے بہت وسیع ملک دیا ہے تو نے حجاز کو زیرنگین کر لیا لیکن ابھی بہت سے علاقے غیر مفتوحہ ہیں۔ طناب از دیگراں الخ تو اپنی قوت بازو سے عرب کے مختلف علاقوں کو فتح کر لیکن غیر اسلامی طاقتوں سے فوجی یا مالی امداد طلب مت کر۔ طناب بمعنی خیمہ کی رسی۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر ابن سعود، امریکہ یا کسی دوسرے ملک سے مالی امداد حاصل کرے گا تو کچھ عرصہ کے بعد اس کا بھی وہی حشر ہو جائے گا جو مصر کا ہو گیا ۱۲۔

پہلی رباعی ص۸۶

حلِ لغات:۔ مسلمانیم و آزاد از مکانیم۔ اس مصرعہ میں مسلمانیم کے بعد جو

وارد ہوا ہے وہ تفسیری ہے یعنی چونکہ ہم مسلمان ہیں اسلئے ہم زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ط اس کے بعد اب قیامت تک کوئی دین اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوگا، اس لئے اس کی خاتمیت اور کاملیت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ یہ دین ہمیشہ کے ہو یعنی قیدِ زمان سے آزاد ہو اور ساری اقوام عالم کے لئے ہو یعنی قیدِ مکان سے بھی آزاد ہو۔ دوسرا مصرعہ اسی مصرعہ کی تفصیل ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ۔

ع سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

ہما آموختند الخ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے یا کارکنانِ قضا و قدر نے اُس سجدہ کی تلقین کی ہے کہ اب ہم دنیا کے تمام معبودانِ باطلہ کو پرکاہ سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتے۔ یعنی موحد غیر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا ؛

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے بالفاظ دگر، مسلمان وہ ہے جس کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو تاکہ طلبہ کے اندر ذوقِ یقین پیدا ہو جائے اسلئے قرآن حکیم سے اس دعوی کو ثابت کرتا ہوں ؛

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط یعنی مسلمان کا خدا ساری کائنات کا رب ہے ؛

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ط یعنی مسلمان کا آقا ساری کائنات کے لئے رحمت ہے ؛

(۳) اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ط یعنی مسلمان کی کتاب ساری کائنات کے لئے ہدایت ہے ؛

ان عقائد سہ گانہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو۔ اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے :-

ع درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی

دوسری رباعی پر ۸۶

حل لغات: ۔ زافرنگی صنم الخ اقبالؔ سلطان ابن سعود کو نصیحت کرتے ہیں کہ ان فرنگی حکومتوں سے قطع تعلق کرلے ورنہ کچھ عرصہ کے بعد تو ان کی پرستش کی طرف مائل ہو جائیگا۔ بات یہ ہے کہ فرنگی بت دو مرے کہ بیں ہوا دیت اسلئے ہے کہ ساری دنیا اس کے قبضہ میں ہے۔ چنانچہ آج کل کراچی میں امریکی موٹر کاروں کی وہ کثرت ہے کہ الاماں! اور ہر دکان پر دُنیا بھر کے سگریٹ پاکستان کے مقابلہ میں ارزاں قیمت پر دستیاب ہو سکتے ہیں اور عورتوں کے سامان آرائش کی تو وہ افراط ہے کہ صفا مروہ کا بازار پیرس اور لندن کا نمونہ بنا ہوا ہے مصلحتاً یہیں قلم روکتا ہوں۔ کہ پیمانش نمی ارزد الخ فرنگی صنم سے بیگانگی کا درس اسلئے دیا ہے کہ یہ قوم اوّل درجہ کی عیّار مکار فریبی دغاباز جھوٹی اور بے ایمان ہے۔ اور راقم الحروف کے عقیدہ میں تو انگریز سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کا دشمن آج تک پیدا نہیں ہوا۔ رچرڈ شاہ انگلستان کے زمانہ سے لیکر آج تک یعنی ریڈ کلف ایوارڈ تک۔ انگریز نے کس دن ہماری دشمنی میں کمی کی؟

ع کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

نگاہے وام کن الخ اے ابن سعود! تو چونکہ سنّت نبویؐ پر عامل ہونے کا مدّعی ہے، اس لئے اپنے اندر فاروق اعظمؓ کی سی فراست مومنانہ پیدا کر اور اگر نہ کر سکے، تو پھر اُن سے یہ نعمت عاریتہً لے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو آزادی کی فضا میں سانس لے سکیگا۔ ورنہ تیرے محلات میں جس قدر سامان عیش بڑھتا جائیگا اسی قدر تیری آزادی میں کمی ہوتی جائے گی حتیٰ کہ تو یا تیرا جانشین کسی دن حجاز و نجد کا "تاج پوش گورنر" بن کر رہ جائے گا۔

نوٹ:- اقبال کی فراست قابل داد ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں ۱۹۵۲ء کی حالت کا اندازہ کر لیا۔ چونکہ یہ شرح طلبہ کے لئے لکھ رہا ہوں جن کا مقصد امتحان پاس کرنا ہے نہ کہ اسلامی ممالک کی سیاست سے آگاہی حاصل کرنا اس لئے یہیں قلم روکتا ہوں، ورنہ بہت کچھ لکھ سکتا تھا۔

حصۂ سوم

حضورِ ملت

تمہید:- اس حصہ میں اقبال نے ملت اسلامیہ سے خطاب کیا ہے اور جس رباعی کو انہوں نے عنوان بنایا ہے، اس کے مطالعہ سے خطاب کی نوعیت بہ آسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس میں انہوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے۔ کہ میری سرشت چونکہ عاشقانہ ہے اس لئے تم میرے کلام میں "معرفت" کی باتیں یعنی فلسفیانہ حقائق مت تلاش کرو۔ میرا مسلک عاشقانہ ہے اس لئے میں نے قوم کو بھی عشق ہی کا پیغام دیا ہے۔

سرشک لالہ گوں: لغوی معنی ہیں سرخ رنگ کے آنسو۔ مراد ہے پیغام عشق و محبت۔ باغ سے ملت اسلامیہ مراد ہے۔ بیفشانم چو شبنم الخ اقبال نے اپنے کلام کو شبنم سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح شبنم سے پھولوں میں رنگت اور شادابی پیدا ہوتی ہے،

اسی طرح میرے کلام کے مطالعہ سے مسلمانوں کے قلوب میں روحانیت اور عشق کا رنگ پیدا ہوسکتا ہے (بشرطیکہ وہ اس کا مطالعہ کریں)؂

پہلی رباعی بر صہ ۸۹

حل لغات:۔ بمنزل کوش یعنی اے مسلمان! اپنے مقام کے حصول کی کوشش کرو ما نندمہ نو۔ یعنی جس طرح نیا چاند ہر روز ترقی کرتا ہے تو بھی ہر روز روحانیت (عشق) میں ترقی کر؂ دوسرا مصرعہ پہلے کی شرح ہے؂ فزوں شدن سے روحانیت میں ترقی مراد ہے؂ مقام خویش مرتبۂ نیابت الٰہیہ مراد ہے جو مسلمان کا حقیقی مقام ہے۔ اس کے حصول کی صورت چوتھے مصرعہ میں بیان کی ہے جو اس حقہ کی جان ہے یعنی اللہ کو اپنا مقصود بناؤ اور اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے سرکارِ دوعالم صلعم کی اتباع کرو؂

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی مقصودِ حیات مسلم، نیابت الٰہیہ ہے اور یہ مقصود اتباع رسولؐ سے حاصل ہوسکتا ہے؂

پہلی رباعی بر صہ ۹۰

حل لغات:۔ چو موج از بحر خود الخ بحر خود سے ذاتِ شاعر (انائے مقید) مراد ہے؂

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی خودی کی نشوونما کے لئے کوشش کی؂ بجود مثل گہر الخ یعنی جب خدا تعالیٰ نے مجھے خلعتِ وجود عنایت کر دیا تو میں نے اپنی خودی کی تربیت کی، جس طرح صدف، اپنی آغوش میں موتی کی پرورش کرتی ہے؂ بخود پیچیدن۔ یہ اقبال کی اصطلاح ہے یعنی خودی کو مستحکم کرنا؂ ازاں نمودیکہ الخ

یعنی اس زمانہ کے نمرود اور فرعون (اعدائے دین) مجھ سے اسلئے ناراض ہیں ؛ یہ تعمیر حرم الخ کہ میں نے اسلام کی سربلندی کی کوشش کی ہے ؛

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ جو شخص اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کریگا تمام طاغوتی طاقتیں اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائینگی اسلئے اس شخص کو لازم ہے کہ اتباع رسولؐ سے اپنی خودی مستحکم کر لے تاکہ ان کا مقابلہ کر سکے ۱۲ ؛

دوسری رباعی نمبر ۹۰

حل لغات :۔ بیا ساقی ! مرشد روحانی سے خطاب یا استمداد ہے ؛ بگرداں ساتگیں را ساتگیں ۔ قدح شراب :۔ شراب کا چھوٹا پیالہ ہے :۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے معرفت کی شراب پلا دے یعنی حقائق کائنات مجھ پر روشن کر دے ؛ آستیں افشاندن یعنی ترک علائق کرنا یا قطع تعلق کرنا ؛ بیفشاں ہر دو گیتی الخ یعنی دونوں جہاں سے قطع تعلق کرے یعنی مجھے دونوں جہان سے بے نیاز کر دے ؛

حقیقت سے مراد ہے اسلام کی حقیقت یا اس کی روح ؛ رندے ہیں یا سے وحدت ہے یعنی ایک رند یہ ملّا سے وہ شخص مراد ہے جو دین اسلام کی روح اور اسکے تقاضوں سے بیگانہ ہو صرف یہ جانتا ہو کہ کنز میں یہ لکھا ہے اور قدوری یہ کہتی ہے مطلب یہ کہ صرف فقہی مسائل سے آشنا ہو یا کچھ نحوی بحث کر سکتا ہو ؛ کم شناسد یعنی نہیں شناسد ؛ رمز دین یعنی دین اسلام کی حقیقت یا روح ؛

مطلب واضح ہے ۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبالؔ نے یہ رباعی اسوقت لکھی تھی جب دیوبند کے ایک بڑے ملّا نے دلی کے ایک جلسہ میں یہ کہا تھا کہ "موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں" تو اقبالؔ نے یہ کہا کہ :۔

ع حقیقت را بر ندے فاش کردند

یعنی اگرچہ میں اُس ملّا کے مقابلہ میں "رند" ہوں لیکن مصلحتِ خداوندی دیکھو کہ اسلام کی حقیقت اُس ملّا پر منکشف نہ ہوسکی، اور مجھ جیسے جاہل کم سواد اور گنہ گار پر منکشف ہوگئی کہ اسلام یعنی قرآن کی رُو سے مسلمان قوم، وطن سے نہیں بن سکتی۔ بلکہ عقیدۂ توحید سے بنتی ہے، ہر وہ شخص جو سرکارِ دو عالم صلعم کا غلام ہے خواہ وہ کسی ملک میں رہتا ہو۔ اسلامی قومیت کا رکن ہے اگر مسلمانوں کی قومیت، اوطان سے وابستہ ہوجائے تو قرآن اور اسلام دونوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ کیونکہ وطنیت اسلام کی ضد ہے ۱۲

پہلی رباعی ص۱۹

حل لغات:۔ اس رباعی میں بھی مرشدِ روحانی سے استمداد کی ہے پہلی رباعی میں جامِ شراب کی فرمائش کی ہے۔ اس رباعی میں دیدار کی آرزو ظاہر کی ہے اس کی وجہ دوسرے مصرعہ میں بیان کی ہے: کہ چکید از چشمِ من خونِ دلِ من: یعنی اے مرشدِ روحانی! اسوقت میں سخت مشکلات میں مبتلا ہوں۔ چاروں طرف سے اعدائے اسلام کا ہجوم ہورہا ہے۔ چونکہ میں اسلام کا پیغام دُنیا کو سنارہا ہوں اسلئے دُنیا میرے خلاف متحد ہوگئی ہے۔ اب شاعر کیا چاہتا ہے، یہ دوسرے شعر میں بیان کیا ہے: بآں سجدے کہ نے شرقی نہ غربی است: یعنی اے مرشد! مجھے اس سجدہ میں قرآن حکیم کی اس آیت کے مطابق سے مستفید کیجئے، جو نہ شرقی ہے نہ غربی: نوائے از مقامِ لَا تَخَفْ زن: اس مصرعہ میں مقام کا لفظ "نوا" کی رعایت سے لائے ہیں۔ مقام سے یہاں راگنی یا دھن مراد ہے مطلب یہ ہے کہ مجھے ایسی روحانی طاقت عطا کیجئے کہ میں دنیا میں کسی

فرعون یا نمرود سے خوفزدہ نہ ہوں۔

اقبال نے اُس لحن کی آرزو کی ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ یہ بہت بلیغ نکتہ ہے کیونکہ یہ ترکیب قرآن مجید کی اُس آیت سے ماخوذ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی صفت میں یہ فرمایا ہے کہ وہ نہ شرقی ہے نہ غربی۔ اس لئے لحن سے اس جگہ وہ لہجہ مراد ہے جس میں خدائی صفات کا رنگ منعکس ہو۔ اب سوال یہ ہوگا کہ مرشد کے پاس ایسا لہجہ کیسے آسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب سالک بواسطۂ رسولؐ فنافی اللہ ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی میں صفاتِ ایزدی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ جس طرح لوہا جب کچھ عرصہ تک بھٹی میں رہتا ہے تو اس میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔

دوسری رباعی بر ۱۹

حلِ لغات:- بروں از سینہ کش الخ یعنی توحید کے اقتضاء پر عمل کر۔ بخاک خویش زن الخ یعنی یہ عقیدۂ توحید تیرے حق میں اکسیر ہے، اگر تو اس اکسیر کو اپنی خودی پر لگا دے تو تیری خاک (شخصیت) سونا بن جائے گی یعنی تجھ میں شانِ فقر پیدا ہو جائے گی۔ خودی را گیر الخ یعنی اے مسلمان! اس عقیدۂ توحید کے اقتضاء پر عمل کر کے اپنی خودی کو مستحکم کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کریگا۔ محکم گیر یعنی خودی کی حفاظت کر۔ مدہ در دستِ کس الخ یعنی اللہ کے سوا کسی کی اطاعت مت کر۔

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان کو اپنی تقدیر خود بنانی چاہیئے۔ جیسے اعمال ہوں گے ویسی ہی تقدیر بھی ہوگی۔

پہلی رباعی بر ص۹۲

مطلب:- کہتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا کمال خودی کے استحکام پر موقوف ہے۔ اگر وہ اپنی خودی کو مستحکم نہیں کریگا تو دوسروں کا غلام ہو جائیگا اور اقبال کے فلسفہ میں غلامی، اسلام کی ضد ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

اے مسلمان! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیری متاع پر دوسرا قابض نہ ہو یعنی اگر تو غیروں کی غلامی سے نجات کا طالب ہے تو غیر کا سہارا مت ڈھونڈو۔

بنیادی تصور:- غیر کی طرف دیکھنا یعنی دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا اسلامی تعلیمات کی رُو سے حرام ہے مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ خود اپنی خودی کو مستحکم کرے اور استحکام خودی، اتباع رسولؐ پر موقوف ہے۔

دوسری رباعی بر ص۹۲

مطلب:- کہتے ہیں کہ جو مسلمان، اتباع رسولؐ کی بدولت اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ ہر حالت میں عزت کی زندگی بسر کرتا ہے اور جو مسلمان اپنی حقیقت سے بیگانہ رہتا ہے وہ دوسروں کا غلام ہو جاتا ہے، یا غلامی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اقبال کی رائے میں غلامی کی زندگی مسلمان کے حق میں موت کا حکم رکھتی ہے اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور بھی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ مسلمان کی حقیقت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب یا خلیفہ ہے۔ لیکن مسلمان اس مرتبہ پر صرف اتباع رسولؐ کی بدولت پہنچ سکتا ہے۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۹۲

مطلب:- کہتے ہیں کہ اے مسلمان! میں نے تیری تقدیر تجھ پر واضح کر دی ہے یعنی تجھے کامیابی کا گر بتا دیا ہے جو یہ ہے کہ تو رحمتِ الٰہی سے نا اُمید مت ہو۔ اور پورے یقین کے ساتھ اتباعِ رسولؐ کو اپنا شعارِ زندگی بنا لے۔ اگر تجھے میری بات کا یقین نہیں آتا تو پھر دین سے بیگانگی اختیار کر لے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تو کافر کی موت مر جائے گا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اسلامی زندگی بسر کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ صورت اتباعِ رسولؐ ہے:

دوسری رباعی بر صفحہ ۹۳

مطلب:- ہندی مسلمان سے خطاب کرتے ہیں کہ ۱۹۲۲ء میں ترکوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا لیکن انہوں نے اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کیا، غیر کا سہارا نہیں ڈھونڈا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں دوبارہ زندگی حاصل ہو گئی۔ اسی طرح اہلِ مصر بھی اپنی خودی کو مستحکم کر رہے ہیں اور انشاء اللہ انہیں بھی آزادی نصیب ہو جائیگی۔ پس تو ان لوگوں کی جد و جہد سے سبق لے اور اپنی خودی کو مستحکم کر کیونکہ اس کے بغیر "ملک و دین" یعنی دنیاوی اور اُخروی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ ۹۴

مطلب:- کہتے ہیں کہ جو قوم رو بزوال ہو جاتی ہے تو وہ اپنے شاندار

ماضی کے تصور میں مگن رہنے لگتی ہے، اس ماضی پرستی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قوم کے نوجوان دلالہ، عالم مایوسی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنی ترقی کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ قومی ترقی جدوجہد پر منحصر ہے۔

دوسری رباعی نمبر ۹۴

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ سُنتہ اللہ یہ ہے کہ وہی قوم دنیا میں سرداری حاصل کرسکتی ہے جو سرداری کے لئے جدوجہد کرے۔ خدا کبھی اُس قوم کو سربلند نہیں کرتا جس کے افراد، غیروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مزدور یا کاشتکار اگر کسی سرمایہ دار یا زمیندار کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو اس کا فائدہ اس مزدور یا کاشتکار کو کیسے پہنچ سکتا ہے؟

بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کو دوسروں کی غلامی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

پہلی رباعی نمبر ۹۵

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم امام رازی کی تفسیر سے استفادہ کرو اور اُن کی تصانیف سے اپنی معلومات میں اضافہ کرو۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ عقلی علوم سے زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتے اس کے لئے عشق و مستی لازمی ہے۔ یعنی مسلمان کی کامیابی عشق رسولؐ سے وابستہ ہے اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے۔

دوسری رباعی نمبر ۹۵

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ جب مسلمان نے توحید کی مدد سے اپنی خودی کو مستحکم کرلیا

اس کے اندر اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے یعنی کافروں کے اندر ایمان کا رنگ پیدا کر سکتا ہے۔

اے مسلمان! تو ایسے مردِ کامل کی صحبت سے کبھی ہرگز گریز مت کیجو۔ کیونکہ وہ تو کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔

بنیادی تصوّر:۔ خودی کا استحکام، مردِ مومن کی صحبت پر موقوف ہے۔ اور مردِ مومن وہ ہے جو فنا فی الرسولؐ ہو چکا ہو ۱۲

پہلی رباعی بر ص۹۶

حلِ لغات:۔ تو اے ناداں۔ ناداں سے وہ مسلمان مراد ہے جو اپنی خودی کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہے؛ دل آگاہ دریاب یعنی اپنے دل کو زندہ کرنے کی کوشش کر۔ بالفاظِ دگر، حقیقت سے آگاہی حاصل کر؛ مثلِ نیاکاں:۔ بزرگانِ سلف کی طرح نیاکاں سے وہ حضرات مراد ہیں جنہوں نے اتباعِ رسولؐ کی بدولت، حقیقت سے آگاہی حاصل کر لی مثلاً خواجہ اجمیریؒ یا محبوب الٰہی دہلویؒ یا شیخ جیلانیؒ وغیرہم؛ بخود راہ دریاب یعنی اپنی خودی سے آگاہی حاصل کر؛ چساں مومن کند الخ یعنی مومن اُس پوشیدہ حقیقت سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے؛ لاَ مَوْجُوْدَ اِلاَّ اللّٰہ دریاب یعنی تو اس حقیقتِ کبریٰ پر غور کر کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی حقیقی معنوں میں موجود ہی نہیں ہے؛

مطلب:۔ اے مسلمان! اگر تو جویائے حقیقت ہے تو اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ تو بزرگانِ دین کے نقشِ قدم پر چل کر اس نکتہ کو ذہن نشین کر لے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ یعنی اس کائنات میں سب سے بڑی اور بنیادی حقیقت یہ کہ لا موجود الا اللّٰہ جب تو اس حقیقت کو سمجھ لیگا تو تجھے

اپنی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کسی کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ اور جب یہ حقیقت دل میں جاگزیں ہو جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان حقیقی معنی میں مومن بن جائیگا۔ پھر وہ غیر اللہ کے سامنے کبھی سرِ تسلیم خم نہیں کریگا۔ کیونکہ اُسے اسبات کا یقین کامل حاصل ہوگا کہ خدا کے سوا جب کوئی موجود ہی نہیں تو پھر میں کسی کے آگے سر کیوں جھکاؤں ؟

نوٹ:۔ حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ نے بادشاہ دہلی کو جو وہ تہدید آمیز خط لکھدیا تھا تو یہ ہمت ان میں اس وجہ سے پیدا ہوگئی تھی کہ ان کی نگاہ میں غیر اللہ کی ہستی باقی ہی نہیں رہی تھی۔ لہذا وہ بادشاہ دہلی سے کیسے مرعوب ہو سکتے تھے ؟ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے مقدمہ کی طرف رجوع کرو ۔ ۱۲ ؛

دوسری رباعی نمبر ۹۶

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! افسوس ہے کہ تیرے دل میں عشق رسولؐ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ تیرے اندر نہ اسلام کا رنگ ہے نہ سچے مسلمانوں کی سی شان و شوکت ۔ تونے اپنی خودی کی آبیاری اور تربیت تو کی ہے لیکن غلط طریق پر تونے کسی عاشق کی صحبت نہیں اُٹھائی ؛ یہی وجہ ہے کہ تیرے اندر جوش اور ولولہ (طوفان) پیدا نہ ہوسکا ؛

بنیادی تصور:۔ عشق رسولؐ کا جذبہ صرف عاشقان رسولؐ کی صحبت سے پیدا ہو سکتا ہے ؛

پہلی رباعی نمبر ۹۷

حل لغات:۔ اناالحق یہ وہ کلمہ ہے جو عالم مستی میں حسین ابن منصور حلاج

کی زبان سے نکل گیا تھا۔ یعنی "میں حق (اللہ) ہوں"۔ حلاجؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید تھے اور اس کلمہ کی پاداش میں ان کو ۳۰۹ھ میں سُولی دی گئی: جنہ مقامِ کبریا نیست یعنی صرف خدا ہی کو یہ سزاوار ہے کہ وہ "انا الحق" کہے: سزائے او چلیپا الخ یعنی اس لئے اس قول کے قائل کی سزا یہی ہے کہ اُسے مصلوب کیا جائے:

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ انا الحق چونکہ مقامِ کبریا ہے، اسلئے انسان اگر یہ کلمہ زبان پہ لائے تو اس کی سزا وہی ہے جو حلاجؒ کو ملی۔ لیکن اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ اگر فرد ایسی بات کہے تو بیشک مستوجب سزا ہے لیکن اگر پوری قوم یہ بات کہنے لگے تو جائز ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر فرد انا الحق کہتا ہے تو اس کے بھی گمراہ ہوجانے کا اندیشہ ہے اور اس کی تقلید میں دوسروں کے بھی گمراہ ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً زید یہ کہنے لگے کہ میں حکومتِ پاکستان ہوں تو وہ شخص حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ دراصل وہ حکومتِ پاکستان نہیں ہے لیکن اگر قوم کے تمام افراد بیک وقت متفق اللسان ہوکر یہ کہنے لگیں کہ ہم حکومتِ پاکستان ہیں تو کوئی جرم نہیں ہے کیونکہ وہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ آخر حکومتِ پاکستان قوم کے علاوہ اور ہے کیا؟ ٹھیک اسی طرح یہ کائنات، خدا کے علاوہ اور ہے کیا؟ اس کا یعنی اس کائنات کا اپنا یا ذاتی تو کوئی وجود ہے ہی نہیں۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبال نے اس رباعی میں، شاعرانہ انداز میں، اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ یہ کائنات اللہ کے سوا اور ہے کیا؟ یہ کائنات عین خدا ہے اور خدا عین کائنات ہے۔ دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے، جسے ہم غلطی سے کائنات سمجھتے ہیں یہ سب اُسی کی ذات کی تجلیات ہیں:

ع چوں پردہ برافتد، نہ تو مانی و من

اس لئے کائنات کو عین خدا کہنا بالکل صحیح ہے۔ یہی لَا مَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ کا حقیقی معنیٰ ہے، کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں اور کوئی ہستی موجود نہیں تفصیل کے لئے مقدمہ کی طرف رجوع کرو۔

نوٹ:۔ جو لوگ اس مسئلہ سے آگاہ نہیں ہیں وہ گھبرا کر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو اقبالؔ نے بندہ کو خدا بنا دیا۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم بندہ کو موجود ہی کب مانتے ہیں جو اس کے "خدا" بننے کا سوال پیدا ہو سکے؟ جسے تم بندہ کہتے ہو اس کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے، بلکہ وہ اُس کی تجلی ذاتی کا کرشمہ ہے جس طرح شعلۂ جوالا ہاتھ کی گردش کا کرشمہ ہے۔ دراصل نہ دائرہ کا وجود ہے نہ انسان کا صرف اللہ ہی حقیقی معنی میں موجود ہے۔ انسان کو اگر موجود کہا جاتا ہے تو محض ظلی طور پر ۱۲؎

دوسری رباعی نمبر ۹۰

مطلب:۔ اس رباعی میں سابقہ رباعی کی مزید وضاحت کی ہے، کہتے ہیں کہ انا الحق کہنا اُس قوم کے لئے مناسب ہے جس کا ہر فرد اپنی خودی کی تکمیل کر چکا ہو۔ خونش میں شین کا مرجع "ملت" ہے، اور شاخسار سے فرد مراد ہے۔ یعنی ہر فرد میں ملت کا رنگ پایا جائے جسے وحدت افکار اور وحدت کردار کہتے ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اُس قوم کے جلال میں جمال کا رنگ پوشیدہ ہو۔ اِسکی تشریح یہ ہے کہ:۔ جو قوم انا الحق کہنا چاہتی ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ:۔

(۱) وہ اس قدر طاقتور ہو کہ ساری کائنات "دنہ سپہر" اسکی خادم دائمنہ دار ہو؛

(۲) جب یہ کیفیت ہو گی تو یقیناً اس میں جلال پیدا ہو جائیگا؛

(۳) لیکن انا الحق کہنے کے لئے اس جلال میں جمال کا رنگ بھی لازمی ہے؛

(۴) کیونکہ انا الحق (اللہ) میں یہ دونوں شانیں پائی جاتی ہیں یعنی وہ حکمران تو ہے، لیکن اس کی حکومت، بنی آدم کے لئے باعث رحمت ہے ؛

(۵) اسی طرح اگر کوئی قوم انا الحق کہنا چاہتی ہے تو اس کی حکومت بھی بنی آدم کے حق میں موجب رحمت و برکت ہونی چاہیئے ؛

بنیادی تصور:۔ یہ ہے کہ وہ قوم انا الحق کہہ سکتی ہے جس کے جلال (اقتدار) میں جمال (رحمت) کا رنگ بھی پایا جائے ؛

نوٹ:۔ فاروق اعظمؓ کی حکومت میں یہی خوبی تو تھی جس نے انہیں بقول مسٹر گاندھی تمام اقوام عالم کے لئے آیئڈیل حکمران بنا دیا۔ بلاشبہ ان کے جلال میں جمال کا رنگ پوشیدہ تھا، جسے شک ہو تاریخ اٹھا کر دیکھ لے ۱۲ ؛

پہلی رباعی بر ۹۵

حل لغات:۔ میان امتاں والا مقام است یعنی دنیا کی تمام قوموں میں معزز ہے ؛ کہ آں امت الخ آں امت سے وہ قوم مراد ہے جس کے جلال میں جمال کا رنگ پوشیدہ ہو ؛ نیاساید زکار الخ وہ قوم دنیا میں ہر لحظہ نئی نئی چیزیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ یہاں آفرینش وسیع ترین معنی میں مستعمل ہے، جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے نیستی سے ہستی کرنا یا انسان پیدا کرنا یا جاندار پیدا کرنا۔ لیکن یہاں اس لفظ سے ایجادات واختراعات وانکشافات حکمیہ مراد ہیں مثلاً ریڈیو تلغراف، فونوگراف، ٹیلیفون وغیرہ کہ خواب وخستگی الخ چونکہ وہ قوم اپنے اندر خدائی صفات رکھتی ہے اور خدا نہ سوتا ہے نہ تھکتا ہے، اس لئے وہ قوم بھی ہر وقت مصروف عمل (آفرینش) رہتی ہے ؛

نوٹ:۔ اقبال نے ان رباعیات میں انا الحق کی انوکھی توجیہہ کی ہے یعنی (۱) فرد اگر

انا الحق کہے تو نا جائز ہے، کیونکہ اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔
(۲) قوم اگر انا الحق کہے تو جائز ہے کیونکہ کسی فرد کی گمراہی کا امکان نہیں ہے۔
(۳) جب کوئی قوم انا الحق کہتی ہے تو لازمی ہے کہ اس میں خدائی صفات بھی ہوں اگر مثلاً پاکستانی یا افغانی یا عربی مسلمان "انا الحق" کا نعرہ بلند کریں تو بالکل غلط ہوگا بلکہ لوگ ہنسیں گے کیونکہ ہم لوگ جب اپنی ضروریات زندگی تک کے لیے یورپ اور امریکہ کے محتاج ہیں تو ہم انا الحق کیسے کہہ سکتے ہیں؟

بنیادی تصور یہ ہے کہ جو قوم انا الحق کہتی ہے وہ دن رات نئی نئی ایجادات سے دُنیا کو فائدہ پہنچاتی ہے، بلکہ اہلِ دُنیا کو اپنا ممنونِ احسان بناتی رہتی ہے۔

دوسری رباعی صفحہ ۹۸

حل لغات:۔ وجودش شعلہ از الخ یعنی وہ قوم اپنے سوزِ دروں کی وجہ سے شعلہ بن جاتی ہے جس کے سامنے یہ دُنیا خس و خاشاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی یعنی وہ جس ملک کو چاہتی ہے فتح کر لیتی ہے، کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

سوزِ دروں۔ یہ اقبال کی اصطلاح ہے، اور اس کا مفہوم وہی ہے جو "جذبِ دروں" سے ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:۔

امیناں راز ندگی، جذبِ دروں
کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جب تک یہ "سوزِ دروں" کارفرما رہتا ہے قوم ترقی کرتی رہتی ہے یعنی "انا الحق" کہتی رہتی ہے، لیکن جب یہ جوہر فنا ہوجاتا ہے تو وہ قوم بتدریج فنا ہو جاتی ہے۔ بعض حالتوں میں زندہ بھی رہتی ہے لیکن ہماری طرح۔ حضرت خالد جانبازؓ میں یہ سوزِ دروں ہی تو کارفرما تھا۔

جس کی بدولت اگر ایک طرف اُنہوں نے محیّر العقول کارنامے انجام دیئے تو دوسری طرف اپنی معزولی کے فرمان پر خاموشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کردیا۔ مردہ قوموں کی شناخت یہ ہے کہ جب تک اس کے افراد اقتدارِ اعلیٰ کی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اسوقت تک اپنی قوم یا مملکت سے وفا کرتے ہیں اور جب مناصبِ عالیہ سے محروم ہوجاتے ہیں تو اپنی قوم یا مملکت سے غداری کرنے لگتے ہیں: کند شرح انا الحق الخ یعنی وہ قوم اپنی ہمت سے "انا الحق" کی تشریح کرتی رہتی ہے: ہے ہر کن الخ یعنی وہ اپنے عمل سے ثابت کرتی ہے کہ وہ اس دعوےٰ میں صادق ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جس طرح الحق (خدا) جب کُن (ہوجا) کہتا ہے تو وہ شئی موجود ہوجاتی ہے (فیکون) اسی طرح یہ قوم جب کسی بات کا ارادہ کرتی ہے تو اُسے فوراً یا کچھ دیر کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا دیتی ہے۔ یعنی اس میں جبر کے بجائے اختیار کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ جو قوم انا الحق کہتی ہے اسمیں اس قدر طاقت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

پہلی رباعی بر ص۹۹

حلِ لغات: - پرد در وسعت گردوں الخ یعنی وہ قوم اپنی سطوت کے اعتبار سے دنیا میں عدیم المثال ہوجاتی ہے اور اسکی صفت یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ ساری دنیا پر حکمران ہوجاتی ہے لیکن اپنے مرکز (شاخ آشیانہ) سے کبھی غافل نہیں ہوتی۔ بالفاظ دگر، وہ قوم، مسلمانوں کی طرح نہیں ہوتی کہ جب اُنہوں نے اپنے آشیانہ (حجاز) سے نکل کر عراق اور ایران میں پرواز کی تو ہمیشہ کے لئے اُسے فراموش کردیا اور ترکانِ تیموری کا تو یہ حال ہوا کہ باستثنائے حضرت عالمگیرؒ حجاز کا تصور بھی اُن کے دماغوں میں پیدا نہ ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے اُن کے آخری نام

بیوا کو حجاز کے بجائے رنگون بھیجدیا؛ مہ و انجم گرفتار الخ یعنی اقوام عالم در کنار عناصر کائنات اور اجرام فلکی بھی اُس قوم کے تصرف میں ہوتے ہیں؛ بلکہ چوتھے مصرعہ میں تو اقبال نے قصہ ہی کوتاہ کر دیا؛ بدست اوست تقدیر زمانہ یعنی وہ قوم ساری کائنات پر حکمران ہوتی ہے؛

نوٹ :- آجکل روس اور امریکہ یہ دو قومیں انا الحق کا نعرہ بلند کر رہی ہیں اور میرا خیال ہے کہ تیسری جنگ عظیم میں اسبات کا فیصلہ ہو گا کہ "رستم زماں" کون ہے یا تقدیر زماں کس کے ہاتھ میں ہے؟

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے؛

دوسری رباعی بر ص۹۹

حل لغات :- بباغاں الخ یعنی اگر وہ قوم کسی باغ میں ہو یا کسی بزم طرب میں تو بلبل کی طرح چہکتی ہے اور اہل بزم کو مسرور کر دیتی ہے؛ براغاں الخ یعنی اگر وہ قوم میدان جنگ میں صف آرا ہوتی ہے تو پھر شاہین اور شہباز کی طرح دشمنوں کا قلع قمع کر دیتی ہے؛ امیراد بسلطانی الخ اس کی دوسری شناخت یہ ہے۔ کہ اس قوم کے دولتمند افراد، اپنی دولت کے باوجود، فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور فقیر، اپنے فقر (افلاس) کے باوجود امیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں؛

اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس قوم کے دولتمندوں میں ایثار کی صفت پائی جاتی ہے اس لئے وہ قومی مفاد کے لئے بوقتِ ضرورت اپنی ساری دولت قوم یا حکومت کے حوالہ کر سکتے ہیں (صدیق اکبرؓ نے دو مرتبہ ایسا ہی کیا تھا) اور غریبوں میں استغناء کا رنگ پایا جاتا ہے اسلئے وہ ذاتی مفاد کے لئے قوم یا حکومت سے غداری نہیں کرتے۔ اور اس رنگ استغناء کی بدولت ایک روحانی تسکین حاصل

کرسکتے ہیں۔ یعنی بظاہر فقیر ہیں لیکن وہ اس حالت کو بخوشی گوارا کرتے ہیں:
بنیادی تصوّر:۔ جو قوم "انا الحق" کہتی ہے اس کے افراد کی سیرت میں مذکورہ بالا صفات لازمی طور سے پائی جاتی ہیں۔
غالباً اس امر کی صراحت ضروری نہیں ہے کہ ہم مسلمان جن کو کبھی "خیر اُمّت" کا لقب زیب دیتا تھا، آج ان تمام صفات سے یکسر محروم ہو چکے ہیں ۱۲:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱

حل لغات:۔ بجام نو سے نئی پود یا موجودہ نسل مراد ہے: کہن مے سے اسلام کی روح یا عشقِ رسولؐ مراد ہے: سبو سے قرآن حکیم مراد ہے: دریز۔ امر کا صیغہ ہے، اس کا مخاطب "مسلمان" ہے: **فروغ خویش** سے پاکیزہ زندگی کے ثمرات مراد ہیں اور زندگی میں پاکیزگی (تقویٰ) صرف اتباعِ رسولؐ سے پیدا ہوسکتی ہے: **بر کاخ و کو ریز**۔ یعنی صحیح اسلامی زندگی سے ساری دنیا کو منور کردے: **اگر خواہی ثمر الخ** یعنی اے مسلمان! اگر تو "انا الحق" کہنا چاہتا ہے یعنی دنیا میں سربلند ہونا چاہتا ہے: **بہ دل لا غالب الا اللہ الخ** تو پھر اپنے دل میں اس صداقت کو جگہ دے کہ تجھ پر اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی غالب نہیں آسکتی۔ واضح ہو کہ یہ بات اسی وقت ذہن نشین ہوسکتی ہے جب اس سے پہلے ایک مسلمان کے دل میں یہ حقیقت جاگزین ہو جائے کہ لا موجود الا اللہ یعنی جب میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے تو پھر مجھ پر کسی کے غالب یا مسلّط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا:
مطلب تو واضح ہوگیا۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ پہلے اقبال نے ہم کو یہ بتایا۔
(۱) کہ فرد کے لئے انا الحق کہنا جائز نہیں ہے۔ پھر یہ بتایا۔

(۲) کہ ملت انا الحق کہہ سکتی ہے یعنی یہ بتایا کہ
(۳) صرف وہ ملت، انا الحق کہنے کی مستحق ہے جس میں فلاں فلاں صفات پائی جائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے سابقہ رباعیوں میں اُن صفات کی وضاحت کردی
(۴) اب اس سلسلہ کی آخری رباعی میں وُہ مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ اگر تم انا الحق کہنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے اندر یہ یقین پیدا کرو کہ تم پر دُنیا کی کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی ۱۲ :

دوسری رباعی بر صنا

حل لغات:۔ گرفتم یعنی میں تسلیم کرتا ہوں: ترش رُو۔ تند مزاج: نگاہش مغرور الخ یعنی وہ ظاہر بیں ہے: از کعبہ می راند یعنی مجھے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے:

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ میں نے مانا کہ مُلّا بہت تند مزاج اور ظاہر بیں ہے، لیکن میں اسلام سے اس قدر دور ہو چکا ہوں کہ اگر وہ مجھے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے تو حق بجانب ہے یعنی اس کا یہ طرزِ عمل بالکل صحیح ہے:

بنیادی تصوّر: مسلمان دین اسلام سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں:

پہلی رباعی بر صلنا

حل لغات:۔ فرنگی سے یہاں انگریز قوم مراد ہے: صید بست از الخ یعنی انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کو اپنا غلام بنایا: صدا از خانقاہاں رفت۔ تو خانقاہوں کے خطاب یا نعرہ سجادہ نشینوں نے کہا: لا غیر اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں:۔

(۱) پہلے معنی یہ ہیں۔ انگریز غیر نہیں ہیں بلکہ اپنے ہی ہیں کیونکہ ہمارے حاکم ہیں:

(۲) دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر انگریزوں نے ہمیں غلام بنایا ہے تو کسی غیر نے
ایسا نہیں کیا، جو کچھ ہوتا ہے خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے، اُنہوں نے
خدا کے حکم سے ایسا کیا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ صوفیوں نے مسلمانوں
کو سرِ تسلیم خم کرنے کا مشورہ دیا۔

مطلب: کہتے ہیں کہ جب انگریزوں نے مسلمانوں کو غلام بنانا شروع کیا
تو میں نے صوفیوں سے حالِ دل بیان کیا۔ اُنہوں نے مجھے اُن کی اطاعت کا
مشورہ دیا۔ میں اُن سے مایوس ہو کر مُلّا کے پاس گیا اور سارا قصّہ بیان کیا۔ تو
اُس نے بھی جہاد کا حکم نہیں دیا بلکہ صرف دُعا پر اکتفا کی کہ اے خدا! مسلمانوں
کا انجام بخیر ہو۔

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ صوفی اور مُلّا دونوں ملوکیت کے غلام ہیں۔

دوسری رباعی بر ص ۱۰۱

مطلب: اے مسلمان! صد حیف کہ تو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے
بجائے صوفی اور مُلّا کی غلامی کر رہا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ قرآن
حکیم، جو زندگی کا سرچشمہ ہے، تیری نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ نوبت
یہ ہے کہ تو نے اس سرچشمۂ حیات سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لیا ہے اور
اب تجھے اِس کتابِ مقدّس سے بس اتنا علاقہ باقی رہ گیا ہے کہ جب تیرے گھر
میں کوئی مرنے لگتا ہے تو اُسے سورۂ یٰسین سُنا دی جاتی ہے" تاکہ اُس کا دم
آسانی سے نکل جائے۔

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ مسلمان قرآن حکیم سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں۔

نوٹ: اس رباعی کو غور سے پڑھو تو معلوم ہو جائیگا کہ اقبال کی رائے

ہیں اصلی مجرم وہ صوفی اور مُلّا ہیں، جنہوں نے عامۃ المسلمین کو اس سرچشمۂ حیات سے محروم کر دیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے خود حکمتِ قرآن سے محروم ہیں:

ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند

پہلی رباعی برص۱۰۲

حلِ لغات:۔ ز قرآں پیش خود الخ یعنی اے مسلمان! اس حقیقت پر غور کر کہ تو اور تیرے اعمال قرآن حکیم کے ارشادات سے کس قدر دور ہو چکے ہیں بالفاظِ دگر اپنی شکل قرآن کے آئینہ میں دیکھ: دگر گوں گشتہ۔ تو بالکل بدل چکا ہے یعنی تجھ میں اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی ہے: از خویش بگریز۔ تو اس غیر اسلامی زندگی سے کنارہ کر: ترازوئے بنہ یعنی اپنے خیالات اور اعمال کو قرآن مجید کی ترازو میں وزن کر دیعنی احتساب نفس کر: قیامت ہائے پیشیں سے وہ انقلابات مراد ہیں جو خالد جانبازؓ اور صلاح الدین ایوبیؒ اور محمود غزنویؒ نے برپا کئے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر مسلمان دوبارہ اس دنیا میں سربلندی کے طالب ہیں تو انہیں قرآن حکیم کو اپنا ہادی پیشوا رہنما اور دستور العمل بنانا لازمی ہے۔ اسی نکتہ کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:۔

مثنوی تو ملیں گے نہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملیگا کوئی قرآن سے بہتر

نوٹ:۔ اس زمانہ میں قوم کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہر مذہبی رہنما زبان سے تو یہ کہتا ہے کہ میں مسلمانوں کو قرآن کی طرف بلاتا ہوں لیکن دراصل وہ اپنی طرف بلاتا ہے!!:

دوسری رباعی برصفحہ ۱۰۲

حل لغات:۔ تاویل کے لغوی معنی ہیں موڑنا یا پھیرنا۔ فقہی اصطلاح میں تاویل کہتے ہیں کسی لفظ کے ایسے معنی بیان کرنا جو شریعت کے مطابق ہوں مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط" اس کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ "پھر اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھ گیا"، لیکن یہ معنی قرآن اور اسلام دونوں کے خلاف ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ مجسّم نہیں ہے تو بیٹھ کیسے سکتا ہے؟ اس لئے فقہاء نے تاویل کی اور کہا کہ یہاں "استویٰ" سے مراد ہے غلبہ واستیلاء واقتدار یا تصرف فی الکائنات۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ میری طرف سے صوفی اور مُلّا دونوں کی خدمت میں دست بستہ سلام پہنچے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے یعنی قوم کو خدا کے پیغام یعنی قرآن مجید سے آگاہ کیا۔ لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اُنہوں نے خدا کے کلام کی جو تاویلات کیں وہ اس قدر عجیب و غریب، دور از کار اور رکیک ہیں۔ کہ اُن کو سُن کر میری تو حقیقت ہی کیا ہے۔ خدا اور جبرائیلؑ اور حضرت مصطفےٰ صلعم بھی حیران رہ گئے!

بنیادی تصور:۔ اقبال نے نہایت لطیف پیرایہ میں صوفیوں اور مُلّاؤں کی لایعنی بلکہ خلاف اسلام تاویلات پر طنز کی ہے۔ واقعی بعض صوفیوں اور مُلّاؤں نے قرآن حکیم کی بعض آیات کے وہ معنی بیان کئے ہیں جو نہ جبریلؑ کے خیال میں آئے ہوں گے نہ حضور کے نہ خداوند عالم کے ذہن میں۔

نوٹ:۔ چونکہ یہ شرح طلبہ کے لئے لکھ رہا ہوں اس لئے ان بزرگوں کی تاویلات تفصیل اس جگہ بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن ہندی مسلمانوں کی "ثقافتی تاریخ" میں

انشاءاللہ اس بات کو پوری وضاحت سے بیان کر دوں گا۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۰۳

مطلب:۔ ایک دن ایک واعظ (مُلّا کی مشہور قسم ہے) نے جو لوگوں کو کافر بنانے کے فن میں ماہر تھا، دورانِ وعظ میں یہ بیان کیا کہ کافروں کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔ یہ بات سُن کر ایک کافر نے، جو اتفاقاً مجلس وعظ میں موجود تھا، یہ بات کہی جو واعظ کی بات سے بہت زیادہ دلکش اور معقول تھی کہ "جو شخص خود (انگریزوں کا) غلام ہو اور دوزخ کو دوسروں (کافروں) کا ٹھکانا بنائے، سمجھ لو کہ وہ شخص اوّل درجہ کا احمق ہے کہ خود اپنی حالت سے آگاہ نہیں ہے"۔

بنیادی تصوّر:۔ اقبال نے نہایت لطیف پیرایہ میں واعظوں کی حماقت پر طنز کیا ہے کہ یہ لوگ کافروں کو دوزخ کا ایندھن قرار دیتے ہیں حالانکہ خود غلام ہیں اور نہیں جانتے کہ جو مسلمان، مسلمان ہو کر غلامی پر رضامند ہو، وہ کافروں سے بھی بدتر ہے۔

نوٹ:۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان ٹیپو شہیدؒ نے انگریزوں کی غلامی پر سپاہیانہ موت کو ترجیح دی اور اس طرح ابدی زندگی اور سرخروئی حاصل کر لی۔ اور غدار نظام علی خاں نے انگریزوں کی غلامی اختیار کر کے ابدی لعنت خرید لی۔ اور نہ صرف خود غلامی اختیار کی بلکہ اپنے جانشینوں کے اندر بھی یہی "روح" پیدا کر دی۔ چنانچہ اسی غدارِ اعظم کا جانشین آجکل "راج پرمکھ" بنا ہوا ہے۔

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۰۳

مطلب:۔ ایک پیر کے مرید نے، جو سوءِ اتفاق سے اسلامی تعلیمات سے

آگاہ تھا اور اسلئے، بہت زیرک اور ہوشیار تھا، اپنے پیر سے یہ تلخ بات کہی کہ اے مرشد! جو لوگ اپنے بزرگوں کی ہڈیاں بیچتے ہیں یعنی قبروں کی آمدنی پر گذارا کرتے ہیں (جیسا کہ آجکل عام دستور ہے) وہ دراصل روحانی یا اصلاحی اعتبار سے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ حرفِ نیش دار یعنی چبھتا ہوا فقرہ۔ مرگِ ناتمام :۔ اقبال کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد ہے اخلاقی اعتبار سے ذلت کی کی زندگی بسر کرنا۔ جس میں انسان یک لخت مرجانے کے بجائے روز مرتا ہے، مگر مر نہیں چکتا۔

بنیادی تصور :۔ یہ ہے کہ جو مسلمان اپنی قوتِ بازو کے بجائے امجاد پرستی سے روزی حاصل کرتا ہے، اس کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔

پہلی رباعی ص ۱۰۴

مطلب :۔ ایک دن ایک پیشہ ور (خرقہ باز) پیر نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اے جانِ پسر! اگر تم اس پُر آشوب زمانہ میں اپنی جاگیر، دولت، کوٹھیاں، باغات، مربعے، خطابات، عورتیں، کنیزیں اور مسندِ اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتے ہو، تو اس زمانہ کے نمرودوں اور فرعونوں سے اپنے تعلقات اُستوار رکھو۔ کیونکہ تم ان "بزرگوں" کی حمایت سے یہ ہیں بڑی آسانی کے ساتھ "براہیمی" کر سکتے ہو؛ یعنی مسلمانوں کے مذہبی پیشوا بن سکتے ہو اور اگر یہ "پاپائیت" برقرار ہے تو پھر زن، زر اور زمین کے علاوہ تمہیں مسلمانوں کے سجدے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

خرقہ باز۔ اقبال کی اصطلاح ہے جس سے تحقیر و تذلیل کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی وہ شخص جس نے دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے "خرقہ" پہن رکھا ہو۔ بالفاظِ دگر بلیشہ ور پیر۔ یہ لفظ "خرقہ پوش" کی ضد ہے۔ حرزِ جان۔ حرز کے لغوی معنی ہیں برائے پناہ یا تعویذ

مراد ہے وہ شئ جسے انسان بہت عزیز رکھے یا ہر دم اپنے ساتھ رکھے۔ نمرودانِ این دور سے انگریز مراد ہیں۔ براہیمی سے مسلمانوں کی امارت مراد ہے۔
بنیادی تصور:- اس رباعی کا بنیادی تصور اس قدر دقیق ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ طلبہ اپنی اپنی عقل کے مطابق خود دریافت کرلیں اور مجھے بھی مطلع کردیں تاکہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں درج کیا جاسکے۔

دوسری رباعی ص ۱۰۳

حل لغات:- بکام خود لفظی معنی اپنے حلق میں۔ دگر یعنی بار دگر۔ کہنہ مے سے اسلام کی اصلی تعلیم یعنی عشق رسولؐ مراد ہے۔ کہ با جامش الخ یعنی ایک پرویز (سلطنت ایران قدیم) اس کے ایک جام کی بھی قیمت نہیں ہے۔ رومیؒ: اقبال کے اُستاد اور روحانی پیشوا جن کی مثنوی سے اقبال نے یہ نکتہ دریافت کیا کہ اسلام دراصل عشقِ رسولؐ کا دوسرا نام ہے۔ مرحوم نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ قرآن حکیم کے بعد جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مثنوی ہے۔ بدیوارِ حریم دل بیاویز لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ اپنے دل کے حریم (کعبہ) کی دیوار سے لٹک جا۔ مراد یہ ہے کہ اے مسلمان! عشق رسولؐ اختیار کر اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مولینا رومؒ کے کلام سے استفادہ کر۔ اگر تو مثنوی کا مطالعہ کریگا تو یقیناً تیرے اندر سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جائے گی جو عشق کے لئے شرط اولین ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ ان تمام رباعیات کا جو ص۱۰۲ سے ص۱۰۹ تک مسلسل درج ہیں یہ ہے کہ اقبال نے اس دور کے مسلمانوں کو رومیؒ کی عظمت اور اُنکے مقام سے آگاہ کیا ہے اور در پردہ ان کی اتباع یعنی اُن کے مسلک عشق کی اتباع کی

مشورہ دیا ہے:

پہلی رباعی بر ص۱۰۵

حل لغات:- ساغرش میں "ش" کا مرجع رومیؒ ہے اور رومی کے ساغر سے اُن کی مثنوی یا انکی تعلیم مراد ہے: لالہ رنگ کنایہ ہے شراب سے اور شراب سے مراد ہے رومی کی تعلیمات: تاثیرش الخ ش کا مرجع رومی کی تعلیم ہے، مطلب یہ ہے کہ رومیؒ کی تعلیم، پتھر کو لعل بنا سکتی ہے، یعنی کافر کو مومن بنا سکتی ہے، بالفاظ دیگر رومیؒ کی تعلیم سے قلب ماہیت ہو سکتی ہے یا مسلمان کے دل میں عشق کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے: غزال بمعنی ہرن، مراد ہے موجودہ دور کا مسلمان[ا] جو ہرن سے بھی زیادہ تیز ہے: بشوید داغ الخ لفظی معنی ہیں چیتے کی پشت سے کالے دھبے دور کر سکتی ہے مراد یہ ہے کہ قلب ماہیت کر سکتی ہے، یا ناممکن کو ممکن کر سکتی ہے:

دوسری رباعی بر ص۱۰۵

حل لغات:- نصیبے بردم۔ نصیبے میں یائے تعظیمی ہے یعنی بہت بڑا حصہ: از تاب و تب او۔ یعنی رومیؒ کے جذبۂ عشق سے: شبم مانند روز الخ یعنی کلام رومیؒ کے مطالعہ سے میرے دل کی ظلمت اور خیالات کی ناپاکی دور ہو گئی ہے: غزالے سے وہی تیز رفتار مسلمان مراد ہے، جس کا تذکرہ سابقہ رباعی میں ہو چکا ہے،

[ا] جب ۱۹۵۱ء میں سرحد پر فوجیں "لگیں" تو ایک ہفتہ کے بعد لاہور سے کراچی کا ٹکٹ بیٹھے بیٹھے سے ایک سو بیس ۱۲۰ روپے تک پہنچ گیا تھا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط ۱۲

بیابانِ حرم سے دُنیائے اسلام مراد ہے ؛ کہ ریزد خندۂ شیرانہ یعنی آج دل مسلمان میں مومنانہ شان یا جرأتِ رندانہ پیدا ہو سکتی ہے، جو حیدرِ کرار اور ذوالنورین جانبازؓ میں پائی جاتی تھی ؛

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور وہی ہے جو سابقہ رباعی کے ذیل میں مذکور ہوا ؛

پہلی رباعی بر ص۱۰۶

حل لغات :- سراپا درد و سوز الخ یعنی رومیؒ کا کلام یا ان کی تعلیم عشق و محبت کے سوز سے معمور ہے یا رومیؒ نے عشق رسولؐ کا پیغام دیا ہے ؛

وصال او زبان دان جدائی - بہت بلیغ مصرعہ ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اس میں رومیؒ کا فلسفہ پوشیدہ ہے یعنی مولانا روم نے جس قسم کا وصل بطور مطمح نظر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ شنکر آچاریہ اور منصور حلاج کے پیش کردہ تصور سے مختلف ہے یعنی اس کی رُو سے عاشق معشوق میں (قطرہ سمندر میں) گم نہیں ہوتا بلکہ دونوں باقی رہتے ہیں اور چونکہ عاشق اپنی خودی کو معشوق کی خودی میں فنا نہیں کر دیتا - اس لئے جدائی کا رنگ برقرار رہتا ہے وصل تو ہوتا ہے مگر اس وصل کی نوعیت یہ ہے کہ اسمیں جدائی بھی موجود رہتی ہے ۔

واضح ہو کہ ہمارے زمانہ میں ہیگل نے بھی اسی قسم کا تصور پیش کیا ہے کہ آئیڈیل (مقصود) ہمیشہ حاصل ہوتا رہتا ہے لیکن پورے طور پر کبھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو عشق اور عاشق دونوں کا خاتمہ ہو جائیگا ۔

اس مصرعہ کو سمجھنے کے لئے اسی قدر تصریح کافی ہے کہ رومی کے نزدیک وصل کے معنی عاشق اور معشوق کا اتحاد نہیں ہے کہ دونوں مل کر ایک ہو گئے

یا عاشق نے اپنی انفرادیت معشوق کی ذات میں مدغم کردی بلکہ وصل کے باوجود دونوں اپنی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح گلشن راز جدید کی شرح میں درج کروں گا۔ جمالِ عشق الخ اس شعر کی نثر یہ ہے "جمالِ عشق از مسلمان نصیبے از جلال کبریائی می گیرد" یعنی دونوں قسم کے عشق کے عالم پیدا ہیں اس کی وضعیت یہ ہے کہ اگر مسلمان اسے اختیار کرلے تو جمالِ عشق میں جلال کبریائی پیدا ہوسکتا ہے یعنی عاشق اگرچہ سراپا جمال ہے لیکن عشق کی بدولت اس میں معشوق کا رنگ پیدا ہوسکتا ہے اور معشوق (خدا) میں چونکہ جلال بھی ہے اس لئے عاشق میں بھی جلالی شان پیدا ہوجاتی ہے۔ واضح ہو کہ جلال اور جمال یہ خدا کی دو نہایت مشہور شانیں ہیں مختصر طور پر یوں سمجھو کہ خدا رب ہے، رحمٰن ہے رحیم ہے کریم ہے وَدُود ہے غفور ہے۔ یہ شان جمال ہے۔ خدا عزیز ہے قہار ہے جبار ہے غالب ہے عزیز ذُوانتقام ہے، یہ شان جلالی ہے وہ پیدا کرتا ہے یہ شان جمال ہے وہ فنا کر دیتا ہے یہ شان جلالی ہے۔

جب ہم بندوں کے لئے یہ دونوں لفظ استعمال کرتے ہیں تو جمال سے مہربانی مراد ہوتی ہے اور جلال سے حکمرانی مراد ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ حضرت موسیٰؑ خدا کی شانِ جلال کا مظہر ہیں اور حضرت عیسیٰؑ شانِ جمال کا اور سرکار دو عالم صلعم میں دونوں شانیں جلوہ گر ہیں۔ حضورؐ کی مکی زندگی جمالی ہے اور مدنی زندگی جلالی ہے۔ یہی دونوں رنگ فاروق اعظمؓ کی زندگی میں نظر آتے ہیں اور اس آیت میں انہی دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ یعنی جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں یعنی کافروں سے دوستی نہیں کرتے۔ یہ شان جلال ہے۔ آپس میں رحیم ہیں یعنی مسلمانوں سے دوستی کرتے ہیں۔ یہ شانِ جمال ہے۔

دوسری رباعی بر صلہ۱۰

حل لغات:۔ گرہ از کار ایں الخ یعنی رومیؒ نے میری مشکلات کو حل کر دیا۔

یہ داستان تو بہت طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ نے قدیم اور جدید دونوں قسم کا فلسفہ پڑھا لیکن اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوا۔ یہ نعمت اُن کو رومیؒ کی مثنوی سے نصیب ہوئی؛ غبار رہگذر الخ یعنی مجھے سچا مسلمان بنا دیا چنانچہ اگلے شعر میں خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ اُس پاک طینت، نے نواز دعاشق کے نغمہ (پیغام عشق) نے مجھے عشق و مستی (حُبِّ رسولؐ) سے آگاہ کر دیا؛

پہلی رباعی بر صلہ۱۰

حل لغات:۔ بروئے من دردل الخ یعنی جب میں نے مثنوی رومیؒ کا مطالعہ کیا تو کارکنان قضاء و قدر نے مجھے عشق کے اسرار سے آگاہ کر دیا؛ زخاک من جہانے الخ یعنی میری ذات یا میرے کلام کو آئندہ انقلاب کا پیش خیمہ بنا دیا یا میرے وجود سے ایک نئی دنیا پیدا کر دی، اِس مصرعہ میں ساز کردن سے تعمیر کردن مراد ہے؛ زفیض او الخ یعنی رومیؒ کے کلام سے استفادہ کی بدولت ایسی عزت حاصل ہو گئی؛ اعتبار بمعنی عزت، اعتبارے میں یائے توصیفی ہے؛ کہ بامن ماہ و انجم ساز کردند۔ کہ ساکنانِ ملاء الاعلیٰ (فرشتے) بھی میرے ہمدم اور ہم خیال ہو گئے۔ اس مصرعہ میں ساز کردن سے موافقت کردن مراد ہے؛

مطلب یہ ہے کہ مرشد رومیؒ کے روحانی فیوضات کی بدولت عالم ملکوت کے رہنے والے بھی مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے؛

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۰۷

حل لغات :۔ خیالش میں "ش" کا مرجع، مولاتِ رومیؒ ہے ؛ خیالش بامہ انجم الخ یعنی رومیؒ کی پروازِ تخیل بہت بلند ہے ؛ آں سوئے پروین یعنی رومیؒ واقف اسرار ہیں۔ آں سوئے پروین سے عالم غیر مادی مراد ہے ؛ دل بیتاب سے قلبِ مضطرب مراد ہے ؛ دل بیتاب خود را الخ یعنی رومیؒ کی صحبت اختیار کر۔ دم او یعنی تاثیر کلام او ؛ دیم اور عشّہ الخ یعنی رومیؒ کے مطالعہ سے طمانیت حاصل ہو جائے گی ؛

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۰۸

حل لغات :۔ ز رومی گیر اسرار فقیری یعنی رومیؒ سے فقر کا طریقہ سیکھو ؛ کہ آں فقر است الخ کیونکہ رومیؒ جس فقر کی تعلیم دیتے ہیں، اُس پر سینکڑوں بادشاہتیں قربان ہیں ؛ حذر زاں فقر الخ اے مسلمان! اُس فقر سے اجتناب کر جس نے تجھے غلام بنا دیا ؛

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۰۸

حل لغات :۔ خودی تا گشت الخ یعنی جب مسلمانوں کی خودی، رنگ خدائی (جلال) سے محروم ہو گئی تو اُس نے فقر کو گدائی میں تبدیل کر دیا ؛ وام کردم یعنی اُدھار مانگا ؛ یہ مصرعہ عراقی کے مصرعہ سے ماخوذ ہے ۔ ع زچشم مست ساقی وام کردند ؛ زچشم مستِ رومی الخ اس لئے میں نے رومیؒ کی نگاہ (تعلیم) سے سطوت و حکومت (کبریائی) کا سرو رعادیتہً حاصل کیا تا کہ مسلمانوں کو اس نعمت

سے آگاہ کر سکوں۔ یعنی اگر مسلمان رومیؒ کے کلام کا مطالعہ کریں گے تو اُن کے اندر عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہو جائیگا اور جب یہ جذبہ کارفرما ہو جائیگا تو وہ روس اور امریکہ دونوں کو اُسی آسانی کے ساتھ مغلوب کر سکیں گے جس آسانی کے ساتھ صحابہؓ نے ایران اور روما کو مغلوب کر لیا تھا۔

نوٹ:۔ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ حصولِ پاکستان دراصل ایک عظیم الشان امتحان ہے۔ اگر ہمارے اندر عشقِ رسولؐ پیدا ہو جائے تو ہم اس ملک میں، اسلامی حکومت قائم کر سکیں گے اور ہم دنیا میں پھر سربلندی حاصل کر سکیں گے اور اگر ہم بدستور کامن ویلتھ کے گھوڑے کی دُم سے وابستہ رہے تو ۱۸۵۷ء اور ۱۷۹۲ء کے واقعات کا اعادہ یقینی ہے ۱۲

پہلی رباعی بر ص ۱۰۹

حلِ لغات:۔ مئے روشن سے روشن یا پاکیزہ تعلیم مراد ہے۔ تاکِ من سے کلامِ اقبال مراد ہے۔ خوشا مردے کہ الخ مبارک ہے وہ شخص جو میرے کلام سے استفادہ کرتا ہے[۱]۔ اگلے شعر میں اسکی وجہ بیان کرتے ہیں۔ نصیب از آتشے الخ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اُس عشق کی آگ (آتش) سے حصّہ پایا ہے جو حکیم سنائیؒ نے سب سے پہلے مولٰنا رومیؒ کے دل میں بھڑکائی تھی۔

اس رباعی میں اقبال نے اپنے کلام کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں نے پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر، پس چہ باید کرد اور دوسری کتابوں میں

---

[۱] پنجاب یونیورسٹی لائقِ تحسین ہے کہ اُس نے کلامِ اقبال کو نصابِ تعلیم میں داخل کر دیا۔ جب ہزاروں طلبہ اس کا مطالعہ کریں گے تو یقیناً چند طلبہ استفادہ بھی کریں گے۔

جو کچھ لکھا ہے یا جو پیغام دیا ہے وہ سب حکیم سنائیؒ اور مرشد رومیؒ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے؂

دوسری رباعی نمبر ۱۰۹

تمہید:۔ واضح ہو کہ اس رباعی سے لیکر صفحہ ۱۱۳ تک اقبال نے حضرت فاروق اعظمؓ کی زبانِ فیض ترجمان سے ملّتِ اسلامیہ کو پیغام دیا ہے اور اس ضمن میں اسلام کے بعض حقائق و معارف بڑے دلکش انداز میں بیان کئے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں کہ اے بیابان کی ہوا! سرزمین عرب سے اٹھ کر ملک مصر میں جا اور وہاں جا کر دریائے نیل (مصری قوم) میں طوفان برپا کرنے اور شاہِ فاروق والی مصر کو سطوت فاروق اعظمؓ کا پیغام دے کہ اپنی شاہی میں فقر کی شان پیدا کر؂

بنیادی تصور:۔ اسلامی طرز حکومت میں امیر یا حاکم کے اندر شانِ فقر پائی جانی لازمی ہے۔ اگر اس میں یہ رنگ نہیں ہے تو پھر وہ مسلمانوں کا امیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ کی زندگی اسکی زندہ مثال ہے؂

پہلی رباعی نمبر ۱۱۰

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ خلافت یعنی اسلامی حکومت، اس حالتِ فقر کا نام ہے جس کے ساتھ تخت و تاج بھی ہو یعنی خلافت، بادشاہت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل فقر کا نام ہے، فرق اتنا ہے کہ اس فقر میں حکومت بھی شامل ہوتی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اے مسلمان! تو شانِ فقر کو اپنے ہاتھ سے مت گنوا دینا کیونکہ اسکے بغیر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی یہی بنیادی

تصور بھی ہے ۱۲ :

دوسری رباعی بر ص۱۱۱

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ جو مسلمان اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اِس پُرانی دُنیا کو از سرِ نو عدل و انصاف سے آباد کر دیتا ہے گویا اُسے دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ اور اگرچہ وہ خلوت نشین ہوتا ہے یعنی اپنا وقت زیادہ تر یادِ خدا میں بسر کرتا ہے، اس کے باوجود ایک دُنیا اس کے دروازہ کا طواف کرتی رہتی ہے بنیادی تصور یہ ہے کہ خودی کی تربیت کے بغیر شانِ فقر پیدا نہیں ہو سکتی:

پہلی رباعی بر ص۱۱۱

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ بڑی خوشی کے ساتھ جملہ علوم و فنون حاصل کرو۔ اور ہر طبقہ کے لوگوں سے اختلاط کرو۔ لیکن خلوصِ دل کے ساتھ ان دو باتوں کو مدِ نظر رکھو یعنی یہ کہ گناہوں سے اجتناب کرو، خلافِ شرع کوئی کام نہ کرو، اور اپنے دل میں سوز و گداز پیدا کرو:

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مندرج ہے، اسی کی خاطر یہ رباعی موزون کی ہے:

دوسری رباعی بر ص۱۱۱

مطلب:۔ مبارک ہے یا خوش نصیب ہے وہ قوم جو اپنے مقام کو حاصل کر چکی ہو یا اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہو۔ اور ہر دم سرگرمِ عمل ہو جستجو کا درد اُسے کسی گھڑی چین سے نہ بیٹھنے دیتا ہو۔ اس کی چمک دمک یا شان و شوکت اس آسمان کے نیچے ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی تلوار جو نیام سے باہر ہو۔ کوان

اُسے دیکھنے کی تاب لا سکتا ہے!

بنیادی تصوّر:۔ جب تک کوئی قوم اپنے مقام کو حاصل نہیں کرتی دیگر اقوام اُس سے مرعوب نہیں ہوتیں:

پہلی رباعی بر صـ۱۱۲

مطلب:۔ ایک ترک جہازران نے جس کا چہرہ لال بھبھو کا تھا اور آنکھیں نیلی تھیں مجھے یہ نغمہ سُنایا کہ اگر بحالت جہازرانی جب کہ میں سمندر میں ہوں، میرے سامنے کوئی دشواری آجائے تو میں مطلق نہیں گھبراتا بلکہ میں تو یہ دُعا کرتا ہوں کہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا کہ میں اپنی تمام مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکوں یعنی میری زندگی میں جس قدر زیادہ مشکلات درپیش ہوتی ہیں اُسی قدر زیادہ حوصلہ بڑھتا ہے:

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے افراد میں مصائب کو دعوت دینے کی ہمّت اور جراٴت پیدا نہ ہو وہ قوم دُنیا میں سربلند نہیں ہو سکتی:

دوسری رباعی بر صـ۱۱۲

حلِ لغات:۔ جہانگیری بخاکِ ما الخ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کیلئے پیدا کیا ہے۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف :۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَه ط اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں:

امامت در جبین ما الخ یعنی سرداری ہماری پیشانی سے ہویدا ہے۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اے مسلمانو! تم دُنیا کی تمام قوموں میں افضل ہو اور تم دوسروں کو فائدہ پہنچانے، کے لئے پیدا کئے گئے

ہو؛ دردنِ خویش بنگر الخ یعنی جس عالم کا تخم، فرشتوں نے حضرت فاروق اعظمؓ کے دل میں بویا تھا، اُس عالم کو تم اپنے اندر دیکھ سکتے ہو یا وہ عالم تمہارے اندر موجود ہے؛

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم فاروق اعظمؓ کے نقش قدم پر چلو تو دُنیا کو اُسی طرح امن داماں، عدالت اور صداقت سے معمور کر سکتے ہو جس طرح فاروق اعظمؓ نے کر دیا تھا۔ جو کام اُنہوں نے عرب اور عجم میں کر دکھایا۔ تم ساری دُنیا میں کر سکتے ہو جہانگیری اور امامت کی صلاحیت تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر ودیعت کر دی ہے اور تم کو بہترین دستور العمل اور بہترین اُسوہ بھی عطا فرما دیا ہے، اب یہ تمہارا کام ہے۔ کہ تم اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دُنیا کو عدل فاروقیؓ کا نمونہ دکھا دو؛

بنیادی تصور: مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی امامت کے لئے پیدا کیا ہے لیکن اگر وہ انگریز کی غلامی پر قانع ہے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُسے سربلندی عطا نہیں کر سکتی؛

پہلی رباعی نمبر ۱۱۳

حل لغات: ۔ اسرار یقین یعنی ایمان کے اسرار و رموز؛ یکے بیں می کند الخ تو اپنے اندر وحدت کا رنگ پیدا کر لیتا ہے؛

مطلب: ۔ اے مسلمان! اگر تو اسلام کی روح سے آشنا ہے تو دوئی سے اجتناب کر۔ اسلام دین وحدت ہے۔ اس لئے اس میں مُلک (سیاست) اور دین (مذہب) میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے وہ بیک وقت دین بھی ہے اور سیاست بھی، وہ خدا سے بھی ملاتا ہے اور حکمرانی کے طریقے بھی

سکھاتا ہے: بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے:

دوسری رباعی بر ص۱۱۳

حل لغات:۔ کہ خود را امتحاں کرد یعنی جس مسلمان نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا یا اپنی خودی کو مصائب کی کسوٹی پر پرکھ لیا: غبارِ راہ خود را الخ وہ اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کو بھی سربلندی عطا کر سکتا ہے: شرارِ شوق: یعنی جذبۂ عشقِ رسولؐ: نگہدار یعنی اس کی حفاظت کر یا اس کی تربیت کر: آفتابی می تواں کرد یعنی اس کی بدولت تو دنیا میں حکومت کر سکتا ہے:

بنیادی تصور:۔ انسان کی ترقی، شرارِ عشق پر منحصر ہے اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں:

پہلی رباعی بر ص۱۱۴

تمہید:۔ ص۱۱۴ سے ص۱۱۹ تک جو رباعیات ہیں، ان میں اقبال نے شعرائے عرب سے خطاب کیا ہے:

حل لغات:۔ بہائے کم نہادم الخ یعنی میری شاعری میں تغزل کا رنگ بہت کم ہے۔ فارسی کا مطلب یہ ہے کہ تغزل ہے لیکن نہ ہونے کے برابر ہے: لعلِ لب معشوق کے ہونٹوں کو کہتے ہیں: صد دو صد سالہ شب سے طویل مدت مراد ہے: شب سے تاریکی مراد ہے:

مطلب:۔ شعرائے عرب سے خطاب کرتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری میں عورتوں کے حسن و جمال کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ قرآنی تعلیمات پیش کی ہیں، ور اسکے نور سے مدت دراز کی تاریکی کو دور کیا ہے یعنی ایک مدت سے مسلمان شعراء اپنی

شاعری میں عورتوں کے حسن کا تذکرہ کرتے چلے آرہے تھے۔ میں نے اُن کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے اور اُن کو یہ بتایا ہے کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنا چاہیئے لہٰذا تم بھی میری تقلید کرو ؛

بنیادی تصوّر:۔ اقبالؔ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ میں نے شعر کے پردہ میں قوم بلکہ ساری دُنیا کو اسلام کے پیغام سے روشناس کیا ہے ؛

دوسری رباعی صہ ۱۱۴ پر

حل لغات:۔ بجانہا یعنی قوم کے دلوں میں ؛ آفریدم ہائے و ہو را یعنی عشق رسولؐ کا جذبہ پیدا کیا ؛ **کف خاکے شمردم الخ** یعنی میری نگاہ میں دُنیا اور اس کے متعلقات کی قیمت مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں ہے ؛ **حریف** یعنی مدمقابل ؛ **بحر پر شور** سے طاقتور قومیں مراد ہیں ؛ **ز آتش و لے** یعنی جذبۂ عشق رسولؐ کی بدولت ؛ **آبجو** سے مسلمان قوم مراد ہے جو اس وقت بہت کمزور ہے ؛

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کے اندر عشق رسولؐ کا جذبہ پیدا کیا ہے ؛

پہلی رباعی صہ ۱۱۵ پر

حل لغات:۔ تو ہم بگذار یعنی تو بھی ترک کر دے ؛ **صورت نگاری:۔** معشوق کے جسم کی تصویر کھینچنا، لفظوں کے ذریعہ سے ؛ **یاری** یعنی دوستی ؛ **مجو غیر از ضمیر خویش الخ** یعنی اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کر ؛ **بباغ ما برآوردی الخ** یعنی اے مسلمان شاعر! تو نے ملّتِ اسلامی میں پرورش پائی ہے ؛ **مسلمان زادہ الخ** اس لئے تو اپنی شاعری کے ذریعہ سے مسلمان قوم کی خدمت کر ؛

مطلب واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان شعراء کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد شاعرانہ قوتوں کو قوم کی اصلاح میں صرف کریں۔

دوسری رباعی بر ص ۱۱۵

حل لغات:۔ بخاک ما دلے یعنی ہمارے جسم میں ایک لطیفہ ہے جسے دل کہتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہاں دل سے مضغۂ گوشت مراد نہیں ہے کیونکہ یہ تو حیوانات میں بھی ہوتا ہے۔ دل سے اقبال کے یہاں وہ روحانی لطیفہ مراد ہے جو عشق و مستی کا مرکز ہے۔ در دل غمے ہست۔ اور دل میں عشق رسول کا جذبہ پنہاں ہے۔ ہنوز ایں کہنہ شاخے الخ یعنی اگرچہ مسلمان قوم، دین سے بیگانہ ہو گئی ہے لیکن ابھی تک اس کے اندر عشق رسول کی چنگاری پوشیدہ ہے۔ اسی جذبہ کو چوتھے مصرعہ میں "زمزم" سے تعبیر کیا ہے۔ افسون ہنر سے شاعرانہ آرٹ مراد ہے۔ آں چشمہ بکشا یعنی قوم کے دل میں عشق رسول کی آگ بھڑکا دے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان شاعروں کا فرض یہ ہے کہ اپنی قوم کو عشق رسول کا درس دیں۔ ایسی نظمیں لکھیں جن کے پڑھنے سے قوم کے اندر عشق رسول کا جذبہ بیدار ہو۔

پہلی رباعی بر ص ۱۱۶

حل لغات: مسلمان بندۂ مولیٰ الخ یعنی مسلمان ایسا بندہ ہے جس میں خدا کی صفات منعکس ہیں۔ یہاں مسلمان سے . . . . وہ مسلمان مراد ہے جو فطرت صحیحہ پر قائم ہو۔ یعنی اگر مسلمان، غیر اسلامی ماحول سے اپنی فطرت کو ملوث نہ کرے تو بلاشبہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ خدائی صفات کا رنگ

اس کے اندر منعکس ہو سکتا ہے: دلِ او مُشرے الخ اور اس کا دل، بلاشبہ، خدا کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے: یعنی مسلمان کا دل ایک لطیفۂ روحانی ہے اور اس کے اندر یہ قوت پوشیدہ ہے کہ اگر وہ عشق کا طریق اختیار کر لے تو اس کے اندر خدائی صفات منعکس ہو سکتی ہیں۔ چونکہ یہ بات عقل سے بالاتر ہے اس لئے اقبال نے اس کو سِتر سے تعبیر کیا ہے: جمالش یہاں ش کا مرجع مسلمان کا دل ہے: جمالش جُز بہ نورِ حق الخ یعنی اگر تو مسلمان کے دل کے جمال کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ تو اپنے اندر "نورِ حق" پیدا کرے کیونکہ دل کا جمال ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا۔ جمال سے یہاں کمالات روحانی مراد ہیں: اصلش یہاں ش کا مرجع "نورِ حق" ہے: کہ اصلش در ضمیرِ کائنات است یعنی نورِ حق اصلِ ضمیرِ کائنات ہے۔ کائنات کی حقیقت بذاتہا کچھ نہیں ہے، اس کی حقیقت خود نورِ حق ہے، کیونکہ نورِ حق کے علاوہ اور کسی شئی کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن شریف کی اس آیت سے ماخوذ ہے:- اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط یعنی اللہ ہی اس ساری کائنات کا نور ہے، یعنی یہ ساری کائنات اُسی کے نور کا جلوہ ہے۔ وہی ہر شئی میں جلوہ گر ہے:

بنیادی تصور:۔ اس رباعی میں وحدۃ الوجود کا رنگ ہے جس کی تفصیل مقدمہ میں لکھ چکا ہوں۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان شعراء کو لازم ہے، کہ اس حقیقت کو دل میں جاگزیں کریں کہ خدا کے سوا یا نورِ حق کے سوا، اس کائنات میں اور کسی شئے کا وجود نہیں ہے اس لئے وہ اپنی شاعری کا موضوع خدا ہی کو بنائیں۔ جس شئی کا وجود ہی نہیں اس کی تعریف یعنی چہ؟

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۱۶

حل لغات:۔ بدہ بہ خاکِ او الخ یعنی اے مسلمان شاعر! تو مسلمانوں کے

دلوں میں وہ سوز و گداز پیدا کر کہ اُن کے اندر ایمان کا رنگ پیدا ہو جائے ؛ نوا آفریدن یعنی ایسی شاعری کر کہ مسلمانوں کے اندر انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ؛ مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے؛

پہلی رباعی بر صک۱۱

حل لغات :- مسلمانی غم دل الخ یعنی اسلام نام ہے دو چیزوں کا۔ ایک تو غم دل در خریدن یعنی عشق رسولؐ اور دوسری چیز "چوں سیماب از غم یاراں تپیدن" یعنی عشق ملت ؛ حضور ملت از خود الخ اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ ملت کے سامنے تو فرد اپنی کوئی حقیقت نہ سمجھے ؛ دگر بانگ انا الملت الخ اور غیروں کے سامنے اس قدر جری ہو کہ تن تنہا یہ کہہ سکے کہ میں ہی پوری قوم ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے دل میں حضورؐ کی محبت ہو اور حضورؐ کی اُمت کی محبت ہو۔ قوم کے لئے ایثار کرے اور اغیار کے سامنے سدِ سکندری بن جائے۔ یعنی ہر مسلمان، ملت کے سامنے اپنی کوئی حقیقت نہ سمجھے اور غیروں کے سامنے جائے تو ملت کے لئے سینہ سپر ہو جائے ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو ملت پر نثار کر دینے کے لئے آمادہ رہے ؛

دوسری رباعی بر صک۱۱

حل لغات :- کسے کو فاش دید الخ یعنی وہ شخص جو اپنی خودی کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور خودی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کا پرتو ہے اس لئے اس میں خدائی صفات پائی جاتی ہیں۔ جب سالک

اپنی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے نیز یہ کہ میں اُسی کی ذات کا پرتو ہوں اور مجھ میں وہی جلوہ گر ہے۔ غیر کا وجود نہیں ہے ؛ تم بینید بتو بچشم خود الخ اس لئے وہ اس کائنات کو اپنی ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ غیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ غیر کا تو وجود ہی نہیں ہے جس کی تصریح پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکی ہے ؛ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ کائنات کو قرآن حکیم کی روشنی میں دیکھتا ہے یعنی اس کو اپنا خادم سمجھتا ہے اور اس پر حکمرانی کے لئے اپنے اندر طاقت پیدا کرتا ہے ؛ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ مومن، غیر اللہ کا محتاج یا دستِ نگر نہیں ہوتا ؛ **نوائے آفرین** الخ بس اے مسلمان شاعر ! تو اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر اپنے دل میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر اور اسکے بعد اس جذبہ کو اپنی شاعری کے ذریعے سے قوم کے سامنے پیش کر یعنی قوم کو اسی جذبہ کا پیغام دے ؛ پہلے مصرعہ میں مفعول کرد ہی الخ مجھے یقین ہے کہ تو اپنی قوم کی ذلیل زندگی (غلامی) کو عزت اور سر بلندی کی زندگی (آزادی) میں تبدیل کر دیگا۔ مطلب واضح ہو گیا۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ عشقِ رسولؐ کی بدولت مسلمان قوم اور سرور دنیا میں سر بلندی حاصل کر سکتی ہے ۔

نوٹ :۔ ناظرین غور کریں کہ اقبالؔ کے پاس شروع سے آخر تک ایک ہی پیغام ہے یعنی عشقِ رسولؐ اسی نکتہ کو انہوں نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے ؛

پہلی رباعی ۱۱۸

حل لغات :۔ نگہدار۔ حفاظت کر یا تربیت کر ؛ آنچہ در دلِ تُست ۔ اس چیز کی، جو تیرے ضمیر میں ہے اور وہ کیا ہے ؟ وہی جذبہ عشق

رسولؐ ؛ سرور و سوز و مستی الخ اور اس عشق کا نتیجہ (حاصل) یہ ہے، کہ تیرے اندر مستی اور سوز کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور دنیا جانتی ہے کہ جس انسان میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ پہاڑ کاٹ کے رکھدیتا ہے ؛ دُنیا میں آج تک جس قدر محیر العقول کارنامے انجام دیئے گئے ہیں وُہ اسی کیفیت کی بدولت انجام دیئے گئے ہیں۔ یہ کیفیت انسان کے اندر بے پناہ طاقت پیدا کر دیتی ہے ؛ نہی دیدم الخ یعنی اے مسلمان شاعر! اس زمانہ میں غیر مسلم اقوام، عشق کی طاقت سے منکر ہو چکی ہیں اور مادہ پرستی میں غرق ہیں ؛ مے باقی بہ مینائے الخ محبت کی کیفیت جس کو فنا نہیں ہے، وہ تو صرف تیرے دل میں پائی جاتی ہے ؛

بنیادی تصور:- دُنیا میں صرف مسلمانوں کی قوم ایسی ہے جو اپنے رسولؐ سے محبت کرتی ہے ؛

دوسری رباعی ص۱۱۸

مطلب:- اے مسلمان شاعر! تو خوب جانتا ہے کہ اس وقت دُنیا مادہ پرستی میں مبتلا ہے اس لئے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے اور ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دُور کرنے کے لئے آفتاب کی ضرورت ہے۔ یعنی تعلیمات اسلام کی۔ یہ تاریکی غیر قوموں کی شاعری سے (قندیل رہبان) دُور نہیں ہو سکتی ؛ بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے ؛

پہلی رباعی ص۱۱۹

حل لغات:- نکو میخواں۔ بہت غور سے پڑھ ؛ خط سیمائے خود را۔

یعنی اپنی پیشانی کی تحریر یا عبادت کو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی تخلیق کی غایت پر غور کر کہ مجھے خدا نے کس لئے پیدا کیا ہے ÷ بدست آور رگ فردا ے الخ۔ یعنی اپنے مستقبل پر غالب آنے کی کوشش کر یا اُسے مغلوب کر لے یا وہ طریقہ دریافت کر جس سے تو اپنے مستقبل پر غالب آسکے۔ یا اپنے مستقبل کو اپنے منشا کے مطابق بنا سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کی تربیت کر تاکہ تو زندگی میں کامیاب ہو سکے ÷ چو من پا در الخ اور میری طرح قرآن حکیم کا پیغام دُنیا کو سُنا۔ یا میری طرح، عالم اسلام میں داخل ہو جا یا اسلامی زندگی اختیار کر÷ کہ بینی اندرو الخ تاکہ تو اپنی وسعت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکے÷

مطلب یہ ہے کہ جب تو اسلامی زندگی بسر کریگا، جب تو اپنے دل و دماغ کو مسلمان بنالے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ تیری قوتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ کیونکہ "حرم" تو ایک عالمگیر حقیقت ہے جو ساری کائنات کو محیط ہے۔ اور قیامت تک اُسی کی حکومت رہے گی÷

بنیادی تصور اینکہ صرف اسلام (حرم) انسان کو اس کی مخفی قوتوں سے آگاہ کر سکتا ہے یا اسلام ہی کی بدولت انسان کی مخفی قوتیں بروئے کار آسکتی ہیں یا اگر انسان، اسلام کے اصول پر عامل ہو جائے تو لامحدود ترقی کر سکتا ہے یا صرف مسلمان ہو کر ہی ایک انسان اپنی مخفی طاقتوں سے آگاہ ہو سکتا ہے÷

نوٹ:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رباعی بہت بلیغ ہے اس کا ہر مصرعہ معانی سے لبریز ہے÷

دوسری رباعی بر ۱۱۹

تمہید:۔ اس رباعی اور آئندہ دو رُباعیوں میں اقبال نے "فرزند صحرا"

سے خطاب کیا ہے فرزندِ صحرا سے وہ مسلمان نوجوان مراد ہے جو شہری زندگی کی آلودگیوں سے پاک ہو۔

مطلب:۔ جب صبح ہوئی اور آفتاب کی روشنی سے صحرا منوّر ہوگیا تو کھجور کے درخت پر بیٹھے ہوئے ایک پرندنے فرزندِ صحرا سے یوں خطاب کیا کہ اُٹھ! اور سامانِ سفر مہیا کر، روانگی کا انتظام کر کیونکہ زندگی تو مسلسل سفر کی حالت میں رہنے کا نام ہے۔ ایک جگہ یا ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے کاہلی، تن آسانی اور عیش پسندی کی خصلت پیدا ہوتی ہے اور یہ خصلت فرد اور ملّت دونوں کے لئے پیامِ موت ہے:۔

بنیادی تصوّر:۔ دُنیا میں وہی اقوام ترقی کر سکتی ہیں جن کے نوجوان ہر وقت دشوار مہمات سر کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بالفاظ دگر تن آسانی کی زندگی جس میں جد و جہد نہ ہو اقبالؔ کی رائے میں موت کا پیش خیمہ ہے:۔

پہلی رباعی نمبر ۱۲۰

حلِ لغات:۔ عرب را یعنی عرب قوم کو:۔ دلیلِ کارواں۔ اقوامِ عالم کا رہنما:۔ کہ او با فقر الخ کیونکہ اس نے اپنے اندر شانِ فقر پیدا کی یا اپنے آپ کو فقر کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا:۔ تہی دستاں۔ مفلس لوگ:۔ اگر فقر تہی دستاں الخ فقرِ غیور۔ اقبالؔ کی خاص اصطلاحوں میں سے ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ حضرت اقبالؔ کا سارا فلسفہ انہی دو لفظوں میں مضمر ہے۔ کیونکہ اقبالؔ کی رائے میں اسلام فقرِ غیوری کا دوسرا نام ہے اس کی تھوڑی سی وضاحت کئے دیتا ہوں:۔

فقرِ غیور = فقر + غیرت۔ فقر = ذکر + فکر۔

اس لئے فقر غیور = فکر + ذکر + غیرت۔
فکر = مطالعہ کائنات کے بعد خدا کی ہستی کا یقین = ایمان
ذکر = اُس خدا سے محبت اور اس کے حصول کیلئے جدوجہد = عمل صالح
غیرت = جذبہ یا جنون کہ میں ضرور کامیاب ہونگا = اخلاص۔
یا یہ کہ جان جاتی رہے لیکن میں اپنے قول کی پاسداری کرونگا
یا یہ کہ غیر اسلامی اصول سے اجتناب کروں گا۔
اس لئے فقر غیور = ایمان + عمل + جذبِ دروں (اخلاص)
اب آپ قرآن مجید کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ اسلام یہی تین چیزیں پیش کرتا ہے :۔
(۱) خدا پر ایمان لاؤ۔ (۲) خدا سے محبت کرو (۳) خدا کے راستہ میں جہاد کرو لیکن عمل نہیں ہو سکتا، جہاد نہیں ہو سکتا۔ جب تک غیرت کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ جو چیز انسان کو سعیٔ پیہم یا جہاد پر آمادہ کر سکتی ہے، آمادہ کر سکتی ہے وہ یہی "غیرت" تو ہے جو انسان کی زندگی میں سب سے بڑی قوتِ محرکہ ہے۔ سرکار دو عالم صلعم نے تیرہ سالہ مکی زندگی میں صحابہ کرامؓ کے اندر غیرت ہی تو پیدا کر دی تھی جو انہوں نے ساری عمر حضورؐ کے ساتھ جہاد کیا۔
اسی لئے اقبالؒ نے یہ غیر فانی شعر کہا ہے :۔

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام نام ہی ہے فقر غیور کا۔ اسی لئے اقبالؒ نے یہ شعر لکھا ہے :۔

"لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر ؎ دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"

نوٹ:۔ آج جس چیز کا ہمارے اندر فقدان ہے وہ یہی غیرتِ دینی تو ہے لیکن چونکہ میں مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں، اس لیئے یہیں قلم روکتا ہوں اور اس رباعی کے چوتھے مصرعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں:۔

جہانے را تہ و بالا تواں کرد یعنی اگر مسلمان نوجوانوں میں "فقرِ غیور" کا رنگ پیدا ہو جائے تو وہ اس دُنیا کو زیر و زبر کر سکتے ہیں۔

مطلب واضح ہو گیا اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر فقر میں غیرت کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو مسلمان نوجوان پھر انقلاب برپا کر سکتے ہیں:

نوٹ:۔ بیشک یہ صحیح ہے لیکن جب تک انگریزوں کا مجوزہ نظام و نصابِ تعلیم پاکستان میں رائج ہے "ایں خیال است و محال است و جنوں":

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۲

حل لغات:۔ دراں شبہا یعنی صحرا کی راتوں میں: خروشِ صبحِ فردا یعنی آئندہ صبح کا جوش و خروش پایا جاتا ہے: کیوں پایا جاتا ہے؟ اسکی وضاحت دوسرے مصرعہ میں ہے کہ روشن از تجلی الخ کیونکہ صحرا کی راتیں، انوارِ آلٰہیہ سے روشن ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحرائی زندگی میں بدکاری، بدمعاشی عیاری، دغا، فریب، خیانت اور ڈپلومیسی بہت کم ہوتی ہے، نہ وہاں سینما ہوتے ہیں نہ ریڈیو، نہ تھیئٹر نہ کلب، نہ بال روم، نہ حُسنِ عُریاں کے مقابلے نہ گھڑدوڑ نہ شراب، نہ رقص و سرود کی محفلیں نہ سیہ کاریاں: تن و جاں محکم از الخ یعنی صحرائی زندگی سے جسم بھی مضبوط ہوتا ہے اور روح بھی مستحکم ہوتی ہے: طلوعِ اُمتاں از الخ یعنی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ ہر زمانہ میں انہی قوموں نے فتوحات کیں جو کوہ و صحرا سے

تربیت پا کر مہذب دُنیا پر حملہ آور ہو گئیں اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے۔

پہلی رباعی نمبر ۱۲۱ صفحہ

تمہید:- وہ شعر جس کے دوسرے مصرعہ کو اقبال نے اُن رباعیات کا جو صفحہ ۱۲۱ سے صفحہ ۱۲۵ تک مرقوم ہیں عنوان بنایا ہے، یہ ہے:-

خاکساران جہاں را بحقارت منگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اس مصرعہ میں لفظ "سوار" سے اقبال نے مردِ مومن مراد لیا ہے۔ دگر آئین تسلیم و رضا الخ یعنی اے مسلمان! پھر تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کر۔ تسلیم و رضا۔ یہ دو لفظ شریعت کی اصطلاحیں ہیں اور تمام اسلامی زندگی کی بنیاد ہیں۔ تسلیم کا معنیٰ ہے خدا کے احکام کو بلا چون وچرا قبول کرنا اور رضاء کا معنیٰ ہے، خدا کو راضی کرنے کی کوشش کرنا۔ دونوں کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری اور یہی اسلام کا مفہوم ہے۔ اسی لئے میں نے یہ کہا کہ سارا اسلام ان دو لفظوں میں مضمر ہے۔ جب تک یہ دو صفات پیدا نہ ہوں، شانِ فقر بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ طریق صدق و اخلاص الخ یعنی اے مسلمان! صداقت، اخلاص اور وفا کو شعارِ زندگی بنا۔ صدق کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی میں جھوٹ، فریب، دغا خیانت، عیاری اور بے ایمانی کو مطلق دخل نہ ہو۔ اور نہ کوئی ناپاک خیال دل میں آنے پائے۔ "صادق" شریعت میں مومنِ کامل کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہو، اسی لئے ہمیں صادقوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاص کا معنیٰ ہیں اپنے عمل کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دینا یعنی شرعی

احکام کی پابندی اس نیت سے کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہوجائے یا یہ اس کا حکم ہے اس لئے مجھے اس کی تعمیل کرنی چاہئے۔ وفا کا مفہوم ہے پابندیٔ احکامِ شریعت ؛ مگو شعرم چنیں است الخ یعنی نہ مجھے شاعر سمجھو اور نہ میرے کلام پر ادبی تنقید کرو ؛ جنونِ زیرکے از من الخ بلکہ مجھ سے یا میری شاعری سے عشقِ رسولؐ کا طریقہ سیکھو جو میری شاعری کا مقصود ہے ؛

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے کلام کے ذریعہ سے مسلمانوں کو "جنونِ زیرک" کی تلقین کی ہے۔ جنونِ زیرک ؛ اقبالؔ کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے ایسی محبت جس میں دانائی کا عنصر بھی شامل ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مجازی عشق میں عقل کو دخل نہیں ہوتا لیکن عشقِ رسولؐ میں انسان کی عقل، خراب ہونے کے بجائے بہتر ہوجاتی ہے۔ یعنی عشقِ رسولؐ انسان کو صحیح معنی میں زیرک بنا دیتا ہے کیونکہ پھر مسلمان، دُنیا پر عقبیٰ کو ترجیح دینے لگتا ہے اور شرعی اعتبار سے یہ سب سے بڑی دانائی ہے کہ انسان، فانی پر باقی کو ترجیح دے ؛

دوسری رباعی بر صلـ۱۲ـ

مطلب: ۔ جو عشق انسان کو انقلاب برپا کرنے پر آمادہ نہ کرسکے، اُس سے قوم تباہ ہوجاتی ہے اسی لئے میں نے مسلمانوں کو اُس عشق کا پیغام دیا ہے جو اُن کے اندر دانش اور فرزانگی پیدا کرسکتا ہے یعنی اُنکے اندر، دُنیا میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا جذبہ پیدا کرسکتا ہے ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ عشقِ رسولؐ سے مسلمان کے اندر اسلامی طرز

پر انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی عشقِ رسولؐ کا مقصد ہے۔ اسی لیے جب تک پاکستان کے مسلمان عشقِ رسولؐ اختیار نہیں کریں گے وہ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۲۲

مطلب:۔ اے مسلمان! میں اس دور میں تنہا اپنی قوم کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دے رہا ہوں اور عشقِ رسولؐ کی آگ میں ہر وقت جل رہا ہوں یعنی ہر وقت اپنی قوم کو اسی مسلک کی طرف بلا رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں تنہا ہوں لیکن تو اس وجہ سے میری دعوت کی اہمیت کو نظر انداز مت کر، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد میرے ہم خیالوں کی ایک جماعت ضرور پیدا ہو جائے گی۔ بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے، جب مسلمان میری دعوت پر لبیک کہیں گے اور میرا مسلک ہو جائیگا۔

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۲۲

مطلب:۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت میں تنہا بھی ہوں اور مضطرب بھی۔ اس وقت میری حالت اُس گرد کی سی ہے جو فضا میں منتشر ہو لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ میں اُس دور کا منتظر ہوں اور وہ دور نہایت مبارک ہوگا، جب میرے پیغام کی تاثیر سے مردِ مومن (فوق البشر) ظاہر ہوگا۔

بنیادی تصور:۔ اس رباعی میں اقبال نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ میرے کلام کی تاثیر سے اللہ تعالیٰ کسی مومن کو مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے ضرور پیدا کریگا۔

نوٹ:۔ اس رباعی کے بعد صفحہ ۱۲۵ تک جس قدر رباعیات ہیں، سب میں اقبال

نے اسی شہسوار یا مرد مومن یا فوق البشر کی صفات بیان کی ہیں:

پہلی رباعی بر ص ۱۲۳

مطلب: مسلمان قوم اس وقت بہت پریشان ہے لیکن میں اسے خوشخبری دیتا ہوں کہ وہ مرد مومن ضرور پیدا ہوگا جو اس کو سربلندی عطا کریگا لیکن میں وقت کا تعیّن نہیں کرسکتا کیونکہ اُس فوق البشر کا ظہور خدا کے راز دل میں سے ایک راز ہے، وہ جب مناسب خیال فرمائیگا اُس وقت اُس کا ظہور ہو جائیگا یہ مت سمجھو کہ ہر مدعی، وہی موعود مومن ہے اس لئے آنکھ بند کرکے ہر مدعی کی اتباع مت کرو بلکہ پہلے یہ دیکھو کہ اس میں مرد مومن کی صفات بھی پائی جاتی ہیں یا نہیں:

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ مرد مومن کا ظہور اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اسلئے مسلمانوں کو ہر وقت اس مرد کامل کی اتباع اور حمایت کے لئے تیار رہنا چاہیئے:

دوسری رباعی بر ص ۱۲۳

حل لغات: بحرِ خویش: سے اپنی ذات مراد ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں "انائے مقید" کہتے ہیں یہ بحرِ خویش چوں موجے الخ اس مصرعہ کا مضمون ص ۹ کی اس رباعی سے مماثل ہے:-

ع چو موج از بحرِ خود بالیدہ ام من الخ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب میں نے اپنی خودی کی تربیت کی۔ تربیت سے معرفت خویش مراد ہے، کیونکہ معرفت ذاتِ خویش ہی تربیت کی غایت ہے اس معرفت کا نتیجہ اگلے مصرعہ میں مذکور ہے:

تپیدم تا بطوفانے الخ اس تپش یعنی سعیٔ پیہم یا معرفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طوفان کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔ موج اپنی جدوجہد سے طوفان بن گئی یعنی انائے مقید، معرفت حاصل کرکے "انائے مطلق" کے مرتبہ کو پہنچ گیا۔ طوفان کنایہ ہے انائے مطلق یا ذات باری تعالیٰ سے۔ پھر کیا ہوا اسکی تفصیل اگلے شعر میں ہے۔

دگر رنگے ازیں خوشتر ندیدم الخ تو مجھے اُس انائے مطلق (طوفان) کی تصویر کھینچنے کے لئے اپنے رنگ سے خوشتر کوئی رنگ نظر نہ آیا۔ اسلئے میں نے اپنے خون سے اُس انائے مطلق کی تصویر کھینچدی۔ یعنی جب میں فنا ہوگیا تو وہ انائے مطلق ظاہر ہوگیا۔ تصویرش میں "ش" کا مرجع "طوفان" ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ جب سالک، معرفتِ نفس حاصل کرتا ہے، تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ انائے مقید، عین انائے مطلق ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز (ارمغان)
تلاش او کنی، جز خود نہ بینی!
تلاش خود کنی، جز او نیابی! (پیام مشرق)

یعنی اگر خدا کی معرفت حاصل کرلو، تو تمہیں معلوم ہوجائیگا کہ خودی، عینِ خدا ہے، اور خدا، عینِ خودی ہے۔ کیونکہ خودی کا تو کوئی مستقل وجود ہی نہیں ہے۔ جو دوئی یا غیریت کا سوال پیدا ہو۔ موجود حقیقی تو صرف اللہ ہی ہے۔ خودی تو اسی کی صفت کا پرتو ہے یا ظل ہے۔ اس کی تفصیل کیلئے مقدمہ کی طرف رجوع کرو۔

پہلی رباعی برصفحہ ۱۲

حل لغات:۔ نگاہش۔ "ش" کا مرجع وہی شہسوار (مرد کامل) ہے۔ نگاہ

سے اُسکی باطنی یا روحانی قوت مراد ہے ؛ پُرکند خالی سبو حا۔یعنی وہ اپنی روحانی طاقت کی بدولت، مسلمانوں کے دلوں کو، جو عشقِ رسولؐ سے خالی ہیں، اس جذبہ سے لبریز کر دیتا ہے ؛ در اندرے تباک الخ یعنی دلوں میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے ؛ زطوفانے کہ بخشد رائیگانی الخ طوفان سے ولولہ و ذوقِ جہاد مراد ہے۔ رائیگانی بمعنی بلا قیمت ؛ حریف بمعنی مدمقابل ؛ بحر سے غیر مسلم طاقت مراد ہے ؛ آبجو سے کمزور مسلمان مراد ہے ؛

مطلب یہ ہے کہ جب وہ مردِ کامل ظاہر ہوگا تو مسلمانوں کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر دیگا۔ اور مسلمانوں میں اس قدر زبردست شوقِ جہاد پیدا ہو جائیگا کہ وہ عظیم الشان حکومتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ ۱۸۲۵ء میں ایک مردِ مومن نے جس کا اسم گرامی سید احمد شہید رائے بریلویؒ تھا، بے یار و مددگار اور بے سر و سامان ہندی مسلمانوں کے دلوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ اگر خود سرحد کے مسلمان غداری نہ کرتے، تو فرقۂ ضالہ سکھاں ہی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، بلکہ سارے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ صرف مردِ کامل اپنی روحانی قوت سے مسلمانوں کے اندر انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے، یہ کام لیکچروں یا کتابوں سے نہیں ہو سکتا ؛

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۲۴

حلِ لغات :۔ زمام۔ باگ ڈور ؛ ذوقِ تجلی۔ ظاہر ہونے کی خواہش ؛

نہاں - گمنام یا غیر معروف لوگ ؛ کنند افلاکیاں را الخ آسماں بھی اس کے دستِ تصرف میں ہوگا ؛ مطلب یہ ہے کہ جب وہ مرد کامل ظاہر ہوگا، تو مسلمانوں کی رہنمائی کریگا اور ہر گمنام مسلمان کے دل میں کارہائے نمایاں انجام دینے کا جذبہ پیدا کردیگا - اور اس میں اس قدر روحانی قوت ہوگی کہ وہ زمین و آسمان دونوں پر متصرف ہوگا ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ مرد کامل، فوق الفطرت طاقتوں کا مالک ہوگا ؛

پہلی رباعی بر ص ۱۲۵

مطلب :- میری طرف سے اُس مبارک خاتون کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرنا جس کے بطن سے وہ امیرِ کارواں (مرد کامل) پیدا ہو، میں اُس نیک بخت ماں کی آغوش کو حورانِ بہشتی پر ترجیح دیتا ہوں ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ خاتون جس کے بطن سے مرد کامل پیدا ہوگا حوروں سے بھی زیادہ لائقِ احترام ہے ؛

دوسری رباعی بر ص ۱۲۵

مطلب :- میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ وہ مردِ کامل ضرور ظاہر ہوگا - لہٰذا میں مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ "سرمایہ جمع کرلیں غازتگر ضرور آئیگا" یعنی اسلامی زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالیں تاکہ جب وہ مردِ کامل ظاہر ہو تو اس کا ساتھ دے سکیں - آخری وقت میں، آسمان سے یہ آواز (پیغامِ اُمید) میرے کان میں آئی کہ اے اقبالؔ مایوس مت ہو، کیا تو نے قانونِ قدرت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ "شگوفہ چوں فرو ریزد برے ہست" یعنی جب پھول

مرجھا کر گر پڑتا ہے تو اس کی جگہ پھل نمودار ہو جاتا ہے ؛

نوٹ :۔ یہ مصرعہ جیسا کہ حضرت مصنف نے لکھا ہے لطف اللہ آذر کا ہے۔ یہ شاعر عہد عالمگیری میں تھا اور اس نے تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی کو نظم کیا تھا۔ مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے مسلمانوں کو جو پیغام دیا ہے ضرور میرے بعد میرا جانشین پیدا ہوگا جو میرے کام کو جاری رکھے گا ؛ بنیادی تصور یہ ہے کہ حیات ایک مسلسل حقیقت ہے۔ جب شگوفہ فنا ہوتا ہے تو اس سے بہتر نوع کی زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میرے بعد مجھ سے بہتر لوگ پیدا ہوں گے جو مسلمانوں کے اندر ذوقِ یقین پیدا کریں گے ؛

پہلی رباعی ۱۲۶

حل لغات :۔ عرب سے قوم عرب مراد ہے ؛ بنور مصطفیٰ سوخت یعنی عربوں نے سرکارِ دو عالم کی تعلیم پر عمل کیا ؛ چراغِ مُردہ مشرق الخ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے مشرقی ممالک (شام، عراق، ایران، ہندوستان) کو اسلام کے نور سے منوّر کر دیا ؛ ولیکن آں خلافت راہ گم کرد الخ لیکن اُس نام نہاد خلافت نے پھر گمراہی کا دروازہ کھول دیا، جس نے مسلمانوں کو سب سے پہلے ملوکیت کی تعلیم دی ؛

مطلب :۔ اس رباعی اور آئندہ چار رباعیوں میں اقبال نے حکومت کی ان دو صورتوں میں موازنہ کیا ہے (۱) خلافت اسلامی طرز حکومت ہے۔ (۲) ملوکیت غیر اسلامی طرز حکومت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ملوکیت حرام ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ ملوکیت سے دُنیا میں امن و امان

اور عدل و انصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور اس کے بجائے اللہ کی یہ زمین، فتنہ و فساد سے لبریز ہو جاتی ہے یعنی جہنم کا چھوٹا سا نمونہ بن جاتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ عربوں نے سرکار دو عالم کی تعلیم پر عمل کر کے مشرقی ممالک کو اسلام کی برکات سے مالا مال کر دیا۔ لیکن افسوس کہ ۴۰ھ میں خلافتِ اسلامیہ، جو دُنیا کے لئے رحمت تھی، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور بنو اُمیّہ نے دُنیا کو پھر اُسی ضلالت میں مبتلا کر دیا جس میں وہ طلوع اسلام سے پہلے تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام بحیثیت عقیدہ تو باقی رہ گیا لیکن بحیثیت عمرانی نظام ختم ہو گیا۔ اور ابھی تک مسلمانانِ عالم مع ساکنانِ حجاز، اُسی شجرِ خبیثہ کے اثمارِ تلخ سے "بہرہ اندوز" ہو رہے ہیں جو بنو اُمیہ نے ۴۰ھ میں دمشق کے نخلستان میں بو یا تھا:- اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

بنیادی تصور: حضرت اقبال نے اس رباعی میں اسلام کی اس بنیادی تعلیم کو پیش کیا ہے کہ اس میں شاہی (ملوکیت) کی کہیں گنجائش نہیں ہے: بلکہ صاف لفظوں میں ہر مسلمان کو یوں سمجھنا چاہئے کہ ملوکیت بھی وطنیت کی طرح اسلام کی ضد ہے۔

نوٹ: یہ حقیقت راقم الحروف پر علامہؒ ہی کی صحبت کی بدولت منکشف ہوئی تھی کہ "لَا مَلُوکِیَّتَ فِی الْاِسْلَامِ" اور یہی وجہ ہے کہ میں مرحوم سے عقیدت رکھتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے مجھ کو اسلام کی "روح" سے آگاہ کیا۔

دوسری رباعی نمبر ۱۲۶

مطلب: کہتے ہیں کہ مسلمان قوم کا بحیثیت قوم دُنیا میں منصب یا مقام یہ ہے کہ وہ خلافتِ الٰہیہ کی علمبردار ہے یعنی مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ دُنیا

ہیں اللہ کی حکومت قائم کرے خود بھی قرآن حکیم کی اطاعت کرے اور دوسروں کو بھی اسی ازلی ابدی کامل اور مکمل قانون کی اطاعت کا حکم دے۔ کیونکہ قرآن حکیم کا فرمان یہ ہے کہ جو شخص قرآن حکیم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن حکیم ہمارے لئے دستورِ حیات ہے اور ہم مسلمان غیر اللہ کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم نہیں کر سکتے اور دُنیا جانتی ہے کہ بادشاہی کا خلاصہ بھی تو ہے کہ اس میں انسانوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اتباع کرنی پڑتی ہے۔ یعنی انسان خدا بن جاتا ہے اور قرآن کی رُو سے انسان کی اطاعت شرک ہے جو کبھی معاف نہیں ہوگا۔ گویا قرآن حکیم ساری دُنیا کے خلاف چیلنج ہے۔ مسلمان کو ساری دُنیا کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرتا ہے: ہر قسم کی ملوکیت کے خلاف بغاوت کی تعلیم دیتا ہے خواہ وہ ملوکیت، جمہوریت کے پردہ میں پوشیدہ ہو یا دستورِ پارلیمانی کے لباس میں جلوہ گر ہو، خواہ کامن ویلتھ کی نقاب اوڑھے ہوئے ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن حکیم کی رد سے ہر قسم کی بادشاہی (ملوکیت) حرام ہے جو مسلمان اس ملوکیت کا حامی ہو یا بانی ہو یا موسّس ہو یا داعی ہو یا ساعی ہو یا وکیل ہو یا مؤید ہو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ جس طرح لحم خنزیر حرام ہے اسی طرح ملوکیت کو گوارا کرنا بھی حرام ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام تو نور اور حق اور صداقت ہے اور ملوکیت مکر ہے فریب ہے اور شعبدہ بازی ہے۔ یعنی اسلام کی ضد ہے۔ ملوکیت عیاری اور دغابازی کا نام ہے اور خلافت، اللہ تعالیٰ کے قانون کی حفاظت کا نام ہے۔

اب مسلمان خود فیصلہ کرلیں کہ اگر وہ ملوکیت کی حمایت کریں گے یا اس طرزِ حکومت کو برداشت کریں گے تو وہ کس حد تک مسلمان باقی رہ سکیں گے میں خود کچھ نہیں کہنا

چاہتا: بنیادی تصور اس رباعی کا چوتھے مصرع میں مذکور ہے اور وہی خلافت کا نفس مفہوم بھی ہے یعنی خلافت، ذریعہ ہے اللہ کے قانون کی حفاظت کا:

پہلی رباعی بر ۱۲۷

حل لغات:۔ درافتد لفظی معنی ہیں اُلجھ پڑتا ہے یعنی خم ٹھونک کر مقابلہ پر آجاتا ہے: کلیمے سے مردِ مومن مراد ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کی شان پائی جاتی ہو۔ چونکہ آنجنابؑ نے تنِ تنہا اپنے زمانہ کے سب سے بڑے علمبردارِ ملوکیت کا مقابلہ کیا تھا، اس لئے اقبالؔ نے مردِ مومن کو مجازاً کلیم سے تعبیر کیا ہے: دوسرے مصرعہ میں اُس مردِ مومن کی صفات بیان کیں یعنی وہ

(۱) فقیر ہوتا ہے۔ اس کے پاس نہ فوج ہوتی ہے اور نہ خزانہ ہوتا ہے۔

(۲) بے کلاہ ہے۔ وہ کسی قسم کا مادی سامان نہیں رکھتا۔

(۳) بے گلیمے بلکہ اس کے پاس ضرورِیاتِ زندگی بھی نہیں ہوتیں۔

نوٹ:۔ ان تینوں لفظوں میں ایک ترتیب پائی جاتی ہے، مطلب یہ ہے، کہ اُس مردِ مومن کے پاس مادی وسائل بالکل نہیں ہوتے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے روحانی جانشین مرشدی و سیدی حضرت مجدد الف ثانیؒ جب اپنے زمانہ کی ملوکیت کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے تو بالکل دوسرے مصرعہ کا مصداق تھے ایک طرف ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان فرمانروا تھا اور اُس کی تائید کے لئے "ساحرانِ ایران" کا جم غفیر موجود تھا جس کی قیادت اور پشت پناہی ایک ایسی عورت کے ہاتھ میں تھی جو حق کی دشمن تھی۔ دوسری طرف ایک مردِ مومن تھا "فقیرے بے کلاہے بے گلیمے" کی زندہ تصویر لیکن دنیا جانتی ہے کہ "نسیم" نے "صرصر" کا فریضہ انجام دیا اور باطل ہمیشہ کے لئے مغلوب ہوگیا۔

کیونکہ "اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا" بیشک باطل مٹ جانے والا ہے۔
بنیادی تصور یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بوریا نشین، مردِ بے نوا، ملوکیت کا تختہ اُلٹ دیتا ہے اور اس کے شواہد تاریخ اسلام سے بکثرت ملسکتے ہیں۔

دوسری رباعی بر ص ۱۲۷

مطلب: ۔ اقبال نہایت دردِ دل کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ہائے افسوس! ابھی تک انسان اس ناپاک دُنیا میں انسان کا غلام بنا ہوا ہے۔ (دُنیائے اسلام میں اس کی ذمہ داری بنو اُمیہ اور بنو عباس پر ہے) یہی وجہ ہے کہ اس کے نظام زندگی میں نقائص ہیں اور اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ اندریں حالات میں تو اُس ذاتِ پاکؐ کا مدّاح اور غلام ہوں، جس نے دورِ ملوکیت میں ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ :۔
"اے لوگو! اسلام نے ملوکیت کو حرام قرار دیا ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو اپنا غلام بنائے۔"
بنیادی تصوّر:۔ لا ملوکیت فی الاسلام یعنی اسلام میں ملوکیت نہیں ہے۔

پہلی رباعی بر ص ۱۲۸

حل لغات: ۔ محبت از نگاہش الخ نگاہش میں "ش" کا مرجع وہی گیتی پناہ یعنی حضورؐ کی ذاتِ مبارک ہے جس کا تذکرہ سابقہ رباعی میں گذرا۔
مطلب یہ ہے کہ حضورؐ ہی کے انفاسِ قدسی کی بدولت، اس کائنات میں عشق کا وجود برقرار ہے۔ اور آپؐ ہی کا طریقِ زندگی، عشق و مستی کا معیار ہے یعنی وہی عشق و مستی لائقِ اعتبار ہے جس میں حضورؐ کی زندگی کا رنگ پایا جائے۔

مقاماتش عبدہٗ آمد الخ یہ سچ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے بندے اور مخلوق ہیں لیکن عشق و مستی کی دنیا یا اُس کا وجود آپؐ ہی کے دم سے قائم ہے لفظ "پروردگار" اقبال نے مجازی معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ حقیقی معنیٰ میں تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہر شئی کا خالق ہے۔ یہاں لفظ پروردگار سے مراد ہے قیوم یعنی قائم رکھنے والا یا پرورش کرنے والا۔ تو اس میں شک بھی کیا ہے کہ حضورؐ قیامت تک سارے عاشقوں (مومنوں) کے لئے "اُسوۂ حسنہ" ہیں۔ اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصوّر ہے کہ اگر کسی مسلمان کے دل میں دُنیا میں خلافت قائم کرنے کی آرزو جلوہ گر ہو تو اُسے لازم ہے کہ وہ پہلے اپنے آپ کو سرکارِ دو عالمؐ کی محبّت میں فنا کر دے۔ اگر یہ رنگ اس میں نظر نہ آئے تو سمجھ لو وہ مذہب کے پردہ میں "دوٹ" کا طلبگار ہے اور اسلامی حکومت کے پردہ میں اپنی حکومت کا آرزومند ہے۔

دوسری رباعی پر ص۱۲۸

مطلب: کہتے ہیں کہ اپنے ملک میں، تُرک خود مختار ہیں اور جہاں تک دُنیاوی معاملات کا تعلق ہے بڑی سمجھ بوجھ کے مالک ہیں، لیکن اس سے یہ مت سمجھو کہ وہ یورپ کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں بلکہ ابھی تک اُس کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ یعنی سیاسی آزادی تو حاصل ہو گئی ہے، لیکن ذہنی اعتبار سے ہنوز یورپ کے غلام ہیں۔ وہی لاطینی زبان اور وہی لادینی طرزِ حکومت!

بنیادی تصوّر: ترکوں کی غیر اسلامی روش پر سخت تنقید کی ہے۔

پہلی رباعی پر ص۱۲۹

مطلب: جن مبارک لوگوں نے سحرِ فرنگ کو باطل کیا ہے اُنہوں نے کبھی

فرنگیوں کے عہد پیمان پر اعتماد نہیں کیا کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ فرنگیوں نے کبھی ایفاء عہد نہیں کیا۔ صرف ایک مثال درج کرتا ہوں :۔

جب ابوعبداللہ آخری فرمانروائے غرناطہ نے فرڈیننڈ اور آزبیلا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو ان دونوں نے یہ وعدہ کیا کہ کسی مسلمان کی جان، مال اور آبرو سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جب بزدل، ذلیل، غدار اور ننگِ اسلام عبداللہ نے حکومت غرناطہ اُن کے حوالہ کی تو کسی مسلمان کی جان مال یا آبرو محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صدیوں سے نہ اسپین میں کسی مسلمان کا وجود ہے نہ اسلام کا تذکرہ ہے ؛

نوٹ :۔ اگر مسلمان فرمانروا بھی ملکہ ازبیلا کی تقلید کرتے تو آج کشمیر سے لے کر راس کماری تک ایک ہی قوم آباد ہوتی جس طرح اسپین میں ہے ؛

مشو نومید و باخود الخ لیکن اے مسلمان! تو رحمتِ الٰہی سے ناامید مت ہو اور اپنی خودی کی تربیت میں مشغول رہ یعنی اپنی معرفت حاصل کر جس طرح تجھ سے پہلے سلطان نورالدین زنگی مرحوم اور سلطان صلاح الدین ایوبی مغفور نے سحرِ فرنگ کو باطل کر دیا تھا، اُسی طرح تو بھی باطل کر سکتا ہے ؛

بنیادی تصوّر :۔ اگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے اندر ذوقِ یقین پیدا کر لیں تو فرنگیوں کی غلامی سے نجات پا سکتے ہیں ؛

سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

دوسری رباعی بر ۱۲۹

مطلب :۔ یہ سچ ہے کہ کارکنانِ قضاء و قدر نے ترکوں کے اندر نیا ولولہ

پیدا کر دیا اور از سر نو اُن کو استواری عطا کر دی لیکن وہ مسلمان کہاں ہیں، جو اس حقیقت پر غور کریں کہ کارکنان قضاء و قدر نے "تقدیر" کا مفہوم ہمیں سمجھا دیا اور وہ یہ ہے کہ جب ترکوں نے اپنی قومی بقاء کے لئے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کی امداد فرمائی۔

بنیادی تصور: خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

پہلی رباعی صفحہ

تمہید: صفحہ ۱۳۰ سے صفحہ ۱۳۲ تک آٹھ رباعیات میں اقبال نے مسلمان لڑکیوں کو شرعی پردہ اور شرم و حیا اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ علامہ مرحوم بھی جانتے تھے کہ لڑکیوں پر ان رباعیات کا اُلٹا اثر ہوگا لیکن انہوں نے اپنا فرض منصبی ادا کر دیا تاکہ قیامت کے دن اللہ اور اُسکے رسولؐ کے سامنے شرمندگی تو نہ ہو۔

مطلب: اے بیٹی! دلربائی کے یہ سوقیانہ انداز ترک کر دے۔ کیونکہ بے حیائی اور عریانی کے یہ طور طریقے جو کافرانہ ہیں ایک مسلمان لڑکی کو زیب نہیں دیتے۔ تو اُس حسن و جمال کی طرف مائل مت ہو جس کا انحصار "پوڈر" پر ہے بلکہ اپنی سیرت کو اس قدر دلکش بنا لے کہ ہر دیکھنے والا تیری عفت اور پاکیزگی کا معترف ہو جائے۔

بنیادی تصور: جسمانی خوبصورتی کے مقابلہ میں روحانی خوبصورتی زیادہ قدر و منزلت رکھتی ہے۔

دوسری رباعی صفحہ ۱۳۱

مطلب: اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شخصیت میں

بڑی دلکشی رکھی ہے اور اسی قدرتی کشش کی وجہ سے دنیا میں توالد و تناسل کا سلسلہ قائم ہے لیکن حکمائے اخلاق کی نگاہ میں وہی عورت لائقِ احترام ہے جو شرم و حیا کے لباس میں ملبوس ہو۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ شرم و حیا، عورت کے لئے بہت ضروری ہے
نگاہ سے شخصیت مراد ہے؛ شمشیر خداداد سے فطری دلکشی مراد ہے؛ بزخمش میں "ش" کا مرجع "شمشیر" ہے؛ زخم سے تاثیر مراد ہے؛ دل کامل عیار سے حکمائے فلسفۂ اخلاق کا طبقہ مراد ہے؛ آں پاک جاں سے وہ خاتون مراد ہے جو حیا کے زیور سے آراستہ ہو؛ دلِ کامل عیار آں پاک جاں بُرد یعنی عقلاء کی نظر میں وہ عورت عزت کی مستحق ہے جو باحیا ہو ۱۲

پہلی رباعی بر ۱۳۱

مطلب:۔ اے بیٹی! اس دور کی خصوصیت یا ماہیت بالکل واضح ہو چکی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ مادہ پرستی اور ظاہر بینی کا دور ہے۔ دُنیا حُسن ظاہری پر مٹی ہوئی ہے، ہر شخص ظاہر پرستی میں مبتلا ہے۔ اندریں حالات میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اگر دُنیا میں چمکنا ہی چاہتی ہے تو اس باب میں اللہ تعالیٰ سے سبق حاصل کر کے دیکھ لے! وہ ہر جگہ جلوہ گر ہے لیکن اپنی تجلیات کی اس کثرت کے باوجود "پردہ" میں رہتا ہے۔ آج تک کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

بنیادی تصور:۔ اگر عورت ظہور اور نمود کی آرزو مند ہے تو وہ اپنے جسم اور لباس کی نمائش کی بجائے اگر اپنی پاکیزگی سیرت کی نمائش کرے تو اس کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور وہ اپنی لطافت کو بھی برقرار رکھ سکے گی:۔

نہ رہ سکیگی لطافت جو زن ہے بے پردہ (اکبر الٰہ آبادی) سبب یہ ہے کہ نگاہوں کی مار پڑتی ہے

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۳۱

مطلب:۔ اس دُنیا کی بقا اور استواری عورتوں پر موقوف ہے۔ کیونکہ انکی فطرت آئندہ نسلوں کی تربیت کی ذمہ دار ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر عورتوں کے اخلاق پسندیدہ ہوں اور ان میں پاکیزگی اور عِفّت کا مادہ برقرار رہے تو وہ اپنی اولاد کی صحیح طریق پر تربیت کر سکتی ہیں ورنہ نہیں۔ اگر کوئی قوم اس حقیقت سے غافل ہوجائے تو یقیناً اس کی عمرانی اور معاشرتی زندگی تباہ ہوجائے گی۔

بنیادی تصوّر:۔ آئندہ نسلوں کی زندگی عورتوں کی سیرت کی پختگی اور درستی پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہندی میں مثل مشہور ہے "جیسی مائی ویسی جائی"

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۳۲

مطلب:۔ میرے اندر اِسلام اور مِلّت سے محبّت کا جذبہ میری پاک طینت ماں ہی نے پیدا کیا تھا۔ یاد رکھو یہ نعمتِ کُبریٰ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ موجودہ کالج اور مدرسے "جادو منتر" کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ یعنی ان کالجوں میں تعلیم پانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوانوں کی عقل برباد ہوجاتی ہے۔ اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصوّر ہے۔

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۳۲

مطلب:۔ بلاشبہ وہ قوم مبارک ہے جس کی جدوجہد سے اس کائنات میں ہنگامے برپا ہوسکیں۔ لیکن یہ بات اُس قوم کی عورتوں کی پاکیزگی، سیرت

پر منحصر ہے کسی قوم نے ماضی میں کس قدر شاندار کامیابیاں حاصل کیں اور آئندہ کس قدر کامیابیاں حاصل کریگی؟ اس سوال کا جواب اُس قوم کی عورتوں کی پیشانی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی جیسی عورتیں، ویسی قوم اور جیسی قوم ویسے اس کے اعمال:۔

بنیادی تصوّر:۔ قوموں کی ترقی عورتوں کی سیرت کی پختگی پر موقوف ہے:۔

پہلی رباعی پر ۱۳۳

مطلب:۔ اے بیٹی! اگر تو میری ایک نصیحت مان لے تو خواہ ساری قومیں تباہ ہو جائیں، لیکن تو اور تیری قوم تباہ نہیں ہو سکے گی اور وہ نصیحت یہ ہے۔ کہ حضرت بتولؓ کی تقلید کر اور اس مادہ پرست دور اور ہوس پرست انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جا، تاکہ تو حضرت شبیرؓ جیسے فرزندوں کی ماں بن سکے۔

بنیادی تصوّر:۔ اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں دوبارہ حضرت شبیرؓ کی سیرت کے حامل نوجوان پیدا ہوں تو پھر انہیں چاہئے کہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو جناب فاطمہؓ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کریں:۔

نوٹ:۔ اقبال کا یہ ارشاد کہ

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیرے

میرے سر آنکھوں پر، لیکن بہت سی لڑکیوں نے اپنی کتابوں میں اس شعر کی جگہ، یہ شعر لکھ لیا ہے:۔

"ثریا" باش و عریاں شو بہ اسٹیج[1]
کہ در آغوش "محبوبے"[2] بگیری

---

[1] بھارت کی مشہور ایکٹریس جو لاکھوں نوجوانوں کے دلوں پر حکومت کر رہی ہے:۔
[2] بھارت کا مشہور پروڈیوسر جسکا نام ہزاروں دلوں کیلئے تسکین کا موجب ہے ۱۲:۔

دوسری رباعی نمبر ۱۳۲

مطلب :- اے مسلمان خاتون! تو قوم کی زبوں حالی کا خاتمہ کر دے۔ کس طرح؟ اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں ہے۔ کہ خود بھی قرآن پڑھ اور اپنے بچوں کو بھی قرآن پڑھا :-

کیا تو اس تاریخی واقعہ سے آگاہ نہیں ہے کہ تیری بہن کی قرأت کے سوز نے خطاب کے بیٹے کو فاروق اعظمؓ بنا دیا[1]

بنیادی تصوّر :- ان سب رباعیوں کا بنیادی تصور یکساں ہے کہ عورتیں اگر مسلمان ہو جائیں تو پھر قوم کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ لیکن فی الحال تو وہ تلاوت کرنے کی بجائے مشاعرے کر رہی ہیں:

پہلی رباعی نمبر ۱۳۴

مطلب :- کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ (عصرِ حاضر) سراسر مادہ پرستی کی تعلیم دے

---

[1] اس مصرعہ میں مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ یہ فیصلہ کر کے شمشیر بکف اپنے گھر سے نکلے کہ آج بانیٔ اسلام کا خاتمہ کر دونگا تا کہ یہ "فتنۂ عظیم" ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے راہ میں ایک دوست ملا اُس نے کہا کہ "پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، تمہاری بہن بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں"۔ یہ سُنکر حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر پہنچے دونوں میاں بیوی سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ عمرؓ کو دیکھکر سہم گئے۔ اُنھوں نے پوچھا۔ تم لوگ مسلمان ہو گئے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اس پر عمرؓ نے اپنی بہن کے مبارک رخسار پر ایسے زور سے تھپڑ مارا کہ کان سے خون بہنے لگا۔ خون دیکھ کر انکا غصہ فرد ہو گیا اور بولے کہ "اچھا! جو تم پڑھ رہی تھیں وہ مجھے بھی سناؤ"۔ جب انکی بہن نے وہ آیات پڑھیں تو یک لخت حضرت عمرؓ کی تقدیر بدل گئی ۱۲:

رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دین (اسلام) اس کے ہاتھوں بہت نالاں ہے۔ بظاہر اس دَور نے لوگوں کو آزادی عطا کر دی ہے لیکن سچ پوچھو تو اس نام نہاد آزادی کے پردہ میں سینکڑوں قیود عائد کر دی ہیں۔ یعنی کہنے کو آج کل ہر شخص آزاد ہے بلکہ بہت سے نوجوان تو "مادر پدر آزاد" ہیں۔ لیکن دراصل وہ سب بہت سی بُری عادتوں یا فیشن کے ضوابط کے غلام ہیں، مثلاً :۔

(۱) اگر آپ فوج میں افسر ہیں تو **Mess** میں کھانا لازمی ہے اور اگر کسی مہمان کو شراب پلائی جائے گی تو خواہ آپ شریکِ دَورِ شراب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں "بل" آپ کے نام بھی آئے گا اور آپ کو وہ رقم ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ آپ مجبور ہیں کہ وہ رقم ادا کریں ورنہ کورٹ مارشل ہو جائیگا۔

(۲) اگر آپ اپنی بیوی کے ساتھ شریکِ رقص ہوں تو اگر کوئی شریف آدمی آپکی بیوی کے ساتھ رقص کرنا چاہے یا وہ نیک بخت خود کسی کو یہ شرف عطا کرنا چاہے دونوں صورتوں میں آپ کو طوعاً و کرہاً اجازت دینی ہوگی۔ ورنہ آپ اوّل درجہ کے بدتمیز غیر مہذب اور رجعت پسند قرار پائیں گے اور کوئی شریف خاتون آئندہ کبھی آپ کے ساتھ رقص نہیں کریگی۔ مثالیں تو صدہا ہیں لیکن طلبہ کے لئے یہ دو مثالیں ہی بہت کافی ہیں۔

اس مادہ پرست دَور (عصرِ حاضر) نے آدمیت کا خاتمہ کر دیا۔ آدمیّت سے تہذیب اور شرافت مراد ہے۔ شعر کی نثر یوں ہوگی :-

غلط نقشے کہ از بہزادیٔ اوست　　　　زروئے آدمیت رنگ و نم بُرد

یعنی اس دَور نے اخلاقِ انسانی کو ایسا مسخ کیا کہ دُنیا سے شرافت کا خاتمہ ہو گیا۔ بنیادی تصور۔ اس رباعی میں اقبالؔ نے آدمیّت کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے۔

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۳۴

مطلب:۔ عصر حاضر، انسانوں کو خدا سے دور کرتا ہے، الحاد اور انکار کی تلقین کرتا ہے، اور اس کی صنعت کا کمال یہ ہے کہ اس نے بھی "قدیم بت پرستوں" کی طرح بہت سے بت تراشے ہیں اور لوگوں سے ان کی پوجا کرا رہا ہے۔ مثلاً:۔
اشتراکیت، ملوکیت، وطنیت، جمہوریت، نازیت، فاشیت، اشتمالیت، لاادریت، مزدکیت، ابجابیت، مادیت، انارکزم، نہلزم، سیکولرازم، ہیومنیزم وغیرہ وغیرہ:
مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے سوداگروں کے حلقہ سے بہت دور رہیں کیونکہ عصر حاضر کے سوداگر (امریکہ، انگریز، روس، ڈچ اور فرنچ) سوداگر نہیں ہیں بلکہ پکے جواری ہیں یعنی پکے بے ایمان ہیں، جن کا پیشہ ہی دوسروں کو دھوکہ دینا ہے۔
بنیادی تصور: عصرِ حاضر سے اجتناب کی تلقین کی ہے ۱۲:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۳۵

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ مسلمان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے حق میں یہ دَور نہایت نقصان رساں اور بدی کی طرف مائل کرنے والا ہے، بس یوں سمجھو کہ آج کل خدا کے بجائے ابلیس کی حکومت ہے۔
چونکہ یہ دَور بے نور اور بے سوز ہے یعنی اسلام اور عشق رسولؐ دونوں کا دشمن ہے، اس لئے میں اس کے خلاف نبرد آزما ہوں اور حتی المقدور کوشش کر رہا ہوں کہ اس دَور کو خاک سیاہ کر دوں:
نوٹ:۔ اس کوشش ہی نے اقبالؔ کا مرتبہ قوم کی نگاہوں میں اس قدر بلند

کر دیا ہے کہ آج ہر شخص ان کا نام بھی عقیدت کے ساتھ لیتا ہے۔ اور انشاءاللہ قیامت تک ان کا نام زندہ رہے گا۔

بنیادی تصور:۔ اس دور کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

دوسری رباعی نمبر ۱۳۵

مطلب:۔ مسلمان نے درویشی اور سلطانی یعنی فقر اور شاہی دونوں کو باہم مربوط کر دیا۔ یعنی بہت سے مسلمان بادشاہ ایسے گذرے ہیں کہ وہ دن کو بادشاہی کرتے تھے اور رات کو جائے نماز پر آدھی رات سے صبح کر دیتے تھے۔ مثلاً حضرت عالمگیرؒ تمام عمر، رات میں ۲½ یا ۳ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے اور ہمیشہ تہجد کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کی۔ نیز بہت سے مسلمان فقیر ایسے گذرے ہیں جو بظاہر بوریا نشین تھے۔ لیکن سلاطین وقت، ان کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتے تھے۔ مثلاً سیدی و مولائی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کہ سلطان شمس الدین التمش آنجنابؒ کے ادنیٰ کفش برداروں میں سے تھا۔

لیکن اس دور کی کم نظری سے خدا کی پناہ! اگر مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں سلطانی کے ساتھ درویشی کو ملا دیا تھا تو اس دور نے سلطانی کے ساتھ شیطانی کو ملا دیا۔

چونکہ فقر ایک دائمی نعمت ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی مرنے کے بعد بھی یہ دولت انسان کے ساتھ جائے گی، اس لئے اقبال نے اسے "باقی" سے تعبیر کیا ہے اور شاہی چونکہ زندگی کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، اسلئے اسے "فانی" قرار دیا ہے۔

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے۔

پہلی رباعی پر ۱۳۶

حل لغات: چہ گویم رقصِ تو اِلخ یعنی میں تجھ سے تیرے رقص کی کیفیت کیا بیان کروں کہ وہ کتنے معائب سے لبریز ہے: **حشیش** بمعنی بھنگ: **نشاطِ اندروں** یعنی باطنی جذبۂ مسرت: **ایں نشاطِ اندروں نیست**۔ اقبالؒ نے رقص کی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک وہ جس کا باعث خارجی نشہ ہوتا ہے اور یہ رقص اقبالؒ کی نظر میں مذموم ہے۔ دوسرا رقص وہ جس کا باعث باطنی نشہ ہوتا ہے اور یہ رقص محمود ہے پہلی قسم کا رقص، انسان کو ہوٹل میں لے جاتا ہے اور دوسری قسم کا رقص، میدانِ جہاد کی طرف رہنمائی کرتا ہے پہلا رقص شراب سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا رقص عشقِ رسولؐ سے پیدا ہوتا ہے: **تقلیدِ فرنگی** سے انگریزوں کی نقالی مراد ہے: پا کوفتن۔ کنایہ ہے رقص سے: **آں طغیانِ خوں نیست** یعنی وہ طغیانِ خوں یا ولولۂ باطنی نہیں ہے جو نشاطِ اندروں یا جذبۂ عشق سے پیدا ہوتا ہے یعنی اے مسلمان! تو اس لیے رقص نہیں کرتا کہ تیرے اندر کوئی جذبہ کارفرما ہے بلکہ تو شراب یا بھنگ پی کر، محض انگریزوں کی نقالی کرتا ہے، ایسے رقص سے نہ دین کا فائدہ ہے نہ دُنیا کا:

بنیادی تصور یہ ہے کہ رقص بیشک عمدہ بات ہے لیکن وہی جس کا مظاہرہ مومن، میدانِ جہاد میں کرتا ہے۔ اقبالؒ رقص جسمانی کے قائل نہیں ہیں، یہ تو مذموم ہے، بلکہ وہ رقص روحانی کے طالب ہیں۔ ایسا رقص جس میں مومن کی روح، رقص (وجد) میں آجائے اور وہ انقلاب پیدا کر سکے:

نوٹ:۔ جنگ موتہ میں خالد جانباز رضی اللہ عنہ کی روح ہی تو رقص میں آگئی تھی جس کی وجہ سے دورانِ رقص میں نو تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام، روح کو رقص کرنا سکھاتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے مسلمان نوجوانوں سے یوں خطاب کیا ہے:۔

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب — تو اگر رقصِ جہاں گیری نصیب
رمزِ دینِ مصطفےٰ گویم ترا — ہم بقبر اندر دعا گویم ترا
(جاوید نامہ)

دوسری رباعی بر ص ۱۳۶

نوٹ:۔ اس رباعی اور آئندہ تین رباعیوں میں اقبال نے برہمن (ہندو قوم) کی ذہنیت اور اس کے طرزِ عمل اور سیاسی کارناموں پر تبصرہ کیا ہے، ہر رباعی میں انتہائی بلاغت کی شان پائی جاتی ہے۔ گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ان رباعیوں کا مطلب پورے طور سے اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب گذشتہ نصف صدی (۱۸۸۷ء تا ۱۹۳۷ء) کی سیاسی تاریخ پیش نظر ہو۔

مطلب:۔ اے مسلمان! تو نے کانگریس میں شرکت کر کے، اپنی قوم کے حق میں سینکڑوں فتنوں اور مصیبتوں کا دروازہ کھول دیا۔ ہندو قوم تو عرصۂ دراز سے سیاسی جدوجہد کی تیاری کر رہی تھی۔ نیز وہ تجارت، دولت، تعلیم اور تنظیم (سنگھٹن) میں تجھ سے بہت آگے تھی (بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تیرا اور اس کا موازنہ ہی نہیں ہو سکتا) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تو کچھ دنوں تک شریک کار رہا، لیکن اس کے بعد، تیری کمزوریاں اس قوم پر عیاں ہو گئیں اور تو چلنے سے معذور ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تو نے رفیق کار کے بجائے، خیمہ بردار کی حیثیت قبول کر لی اور تیرا کام صرف یہ رہ گیا کہ:۔

(۱) اپنی قوم سے چندہ وصول کر کے تلک سوراج فنڈ میں داخل کرے۔
(۲) سفر خرچ وصول کر کے، کانگریس کے انتخابات میں تقریریں کرتا پھرے۔
(۳) جو فیصلہ کانگریس کرے تو بھی (جمعیۃ العلمائے ہند) اس پر صاد کرے۔
(۴) اور فرصت کے اوقات میں گاندھی کی شان میں قصیدہ خوانی کرتا رہے۔[1]

اے مسلمان! مقام عبرت ہے کہ برہمن نے تو اپنے بتوں سے اپنے طاق کو آراستہ کر لیا یعنی ہندو تو اپنی مردہ زبان، تہذیب، اور طرز معاشرت کو زندہ کر رہے ہیں اور اپنی قوم میں مذہبی بیداری پیدا کر رہے ہیں لیکن تو نے اپنے مذہب کو بالائے طاق رکھدیا اور اس کے بجائے ہندوؤں کے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی۔ مثلاً یہ کہ عالم دین ہو کر جلسوں میں برملا یہ کہنا شروع کر دیا کہ "موجودہ زمانہ میں چونکہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں اس لئے مسلمانوں کو بھی اس نظریہ پر ایمان لے آنا چاہئے اور اپنی قومیت کی بنیاد مذہب کے بجائے وطن کو قرار دینا چاہیے۔"

بنیادی تصور: ہندی مسلمانوں کی غیر اسلامی روش اور عاقبت نااندیشی اور سادہ لوحی پر تبصرہ کیا ہے جنہوں نے ۱۹۲۱ء میں شردھانند جیسے دشمنِ اسلام کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر بیٹھنے کی اجازت دیدی تھی اور مطلق خوفِ خدا نہ کیا کہ کجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر اور کجا ایک دشمن اسلام!

نوٹ: اس رباعی کے دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں "طاق" کا لفظ

---

[1] چنانچہ حضرت مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی مرحوم نے ایک موقع پر اپنی اور اپنی قوم کی گاندھی پرستی کو اس شعر سے ظاہر کیا تھا:

عمریکہ بآیات و احادیث گذشت
رفتی و نثارِ "بُت پرستی" کردی

آیا ہے، لیکن یہ تکرارِ لفظی نہیں ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ طاق خود آراستن کے معنی ہیں اپنے گھر کو مزین کرنا یا آراستہ کرنا، سرطاقِ نہادن کے معنی ہیں کسی چیز سے قطع تعلق کر لینا۔ اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ صدیوں سے مسلمانوں نے قرآن حکیم سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لیا ہے۔ صوفی کے پاس کرامات ہیں۔ مُلا کے پاس روایات ہیں اور عوام کے پاس خرافات ہیں۔ قرآن کسی کے پاس نہیں ہے ۱۲

پہلی رباعی بر صـ۱۳ؔ

مطلب: میں برہمن (ہندو قوم کا نمایندہ) کو بے کار اور فضول قرار نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ تو برابر جد و جہد میں مصروف رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ اپنی سعیٔ پیہم سے بھاری پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ جب تک بازوؤں میں طاقت نہ ہو کوئی شخص پتھر سے اپنا معبود نہیں تراش سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصود کے لئے جد و جہد کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ "معبود" خارجی اور مادی شئے ہے۔ چنانچہ وہ اپنے معبود کو تراشنے کے لئے کافی جد و جہد کرتا ہے۔ پس اس کی ہستی فضول اور بیکار نہیں ہے:۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اگرچہ بُت پرستی عقلاً مذموم ہے لیکن ہندو قوم کی جد و جہد بہر حال قابلِ ستائش ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو عالمِ وجود میں لانے کے لئے پتھروں کو توڑ دیتی ہے۔ پتھر سے خدا تراشنے کے لئے بڑی جد و جہد درکار ہے اور ہندو قوم اس معاملہ میں قابلِ ستائش ہے:۔

دوسری رباعی بر صـ۱۳ؔ

مطلب: کہتے ہیں کہ برہمن (ہندو قوم) بہت عیار اور چالاک ہے اپنے مقصد

سے کسی وقت غافل نہیں ہوتا اور پھر دوسری خوبی اس میں یہ ہے کہ اپنے مقاصد سے کسی کو آگاہ نہیں کرتا۔ ذرا اس کی "دانائی" ملاحظہ کیجئے کہ مجھ سے تو یہ کہتا ہے کہ تسبیح (اسلام) سے قطع تعلق کر لو۔ لیکن اپنے زنار (مذہب) کو کسی وقت بھی اپنے سے جدا نہیں کرتا۔

بنیادی تصور:۔ اس رباعی میں اقبال نے مسٹر گاندھی کے منافقانہ طرز عمل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ لیکن جب اپنی قوم سے مخاطب ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی علاقہ نہیں ہے وہ مذہب کی حقیقت ہی سے ناواقف ہیں مسلمانوں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ کانگریس میں شوق سے آؤ لیکن مسلمان بن کر مت آؤ۔ بلکہ ہندوستانی بن کر آؤ۔ لیکن خود ان کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں "اہنسا اور ستیہ کے ذریعہ سے دیش کی سیوا کرنا چاہتا ہوں"۔ ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہنسا اور ستیہ یہ دونوں خالص مذہبی اقدار ہیں۔ اگر مسلمان کسی معاملہ میں اپنے مذہب کا ذکر کرتے تھے تو یہ فرقہ پرستی تھی۔ لیکن مسٹر گاندھی نے ہندو دھرم اور قوم پرستی کو مرادف بنا دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے علماء اس عیاری کو نہ سمجھ سکے۔ اور طلسم گاندھوی میں گرفتار ہو گئے۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۳۸

مطلب:۔ ہندو قوم نے مسلمانوں سے کہا کہ انگریزوں سے "ترکِ موالات" کر لو اور ہم سے دوستی کا پیمان باندھ لو، کیونکہ ہم سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ہم تو تمہارے پرانے خیر خواہ ہیں اور سلطان محمود غزنوی کے حملوں کو بالکل

فراموش کر چکے ہیں! مسلمان کی سادگی قابل دید ہے کہ وہ ساحرِ وردھا کے دام تزویر میں پھنس گیا۔ چنانچہ یوں تو دو مولوی ایک مسجد میں نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہندوؤں کے افسوں کی تاثیر قابل ستائش ہے کہ ایک بت خانہ (کانگریس) میں دو مولوی بڑے مزے سے دوش بدوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور مطلق آپس میں نہیں لڑتے۔

بنیادی تصور:۔ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک مسجد میں دو ملا بھی نہیں رہ سکتے۔ ضرور ایک ملا دوسرے پر کفر کا فتویٰ عاید کر دیگا۔ لیکن ہندوؤں کی ساحری کا کمال دیکھئے کہ انہوں نے اپنے بت خانہ میں دو ملاؤں کو جن میں سے ایک مکی ہے دوسرا مدنی ہے بآسانی جمع کر دیا۔

دوسری رباعی بر ص۱۳۸

نوٹ:۔ اس صفحہ سے لیکر ص۱۴۸ تک اقبال نے فرنگی نظام ونصاب تعلیم اور اس کے عواقب وثمرات پر تبصرہ کیا ہے۔ اقبال سے مدتوں پہلے اکبر الہ آبادی نے اس سے زیادہ مؤثر پیرایہ میں اُن مفاسد کو واضح کیا جو اس تعلیم سے پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی "مرد کامل" پیدا نہ ہو، جو اس نظام کو تہ و بالا کر دے، اور اسلامی نظام تعلیم رائج کر دے۔ اس وقت تک محض رباعیات سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم:۔

غریب اکبر نے بحث پردہ کی، کی بہت کچھ مگر ہُوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اُس نے یہ کہہ کے، کرہی لیگا مرا مُوا کیا

مطلب:۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے زندگی اُس وقت کامیاب ہو سکتی ہے، جب انسان کے اندر عشق (تب وتاب) کا جذبہ کارفرما ہو۔ لہٰذا اے مسلمان!

تو اپنے فرزندوں کو ایسی تعلیم دے جس سے اُن کے دل میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ کتابیں اور کالج تو محض افسون و افسانہ یعنی بیکار اور مہمل چیزیں ہیں۔ ان کتابوں سے دفتروں کے لئے کلرک تو پیدا ہو سکتے ہیں وہ مجاہدین پیدا نہیں ہو سکتے جو اسلام کی سربلندی کے لئے میدانِ جنگ میں سرفروشی کے جوہر دکھا سکیں اور خاک و خون میں نہا سکیں :

بنیادی تصور: ۔ کتابی علم سے عشقِ رسول صلعم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا :

پہلی رباعی بر ۱۳۹

مطلب: ۔ اُس علم سے جو آسائشِ تن تو مہیا کر سکے لیکن دل میں سوز و گداز پیدا نہ کر سکے، پاکیزہ سیرت (نگاہ) بدرجہا بہتر ہے، لیکن پاکیزہ سیرت سے بھی بہتر وہ دل ہے جو دونوں جہان سے بے نیاز ہو، اور یہ کیفیت صرف جذبۂ عشق کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے :

بنیادی تصور: ۔ دلِ بے نیاز، یعنی وہ دل جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت جلوہ گر ہو، علم اور نگاہ دونوں سے برتر ہے بلکہ کائنات میں کوئی شئے اِس سے زیادہ قیمتی نہیں ہے :

دوسری رباعی بر ۱۳۹

مطلب: ۔ جس مسلمان کے سینہ میں دل بیدار نہ ہو، یعنی عشقِ رسولؐ کا جذبہ کارفرما نہ ہو، اللہ تعالیٰ اُس مسلمان سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا اور نہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کو راضی کر سکتا ہے۔ چونکہ اسکولوں اور کالجوں (مکتب) کی تعلیم سے یہ رنگ مسلمانوں میں پیدا نہیں ہو سکتا، اسلئے میں ان درسگاہوں سے

کوئی واسطہ یا تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ ان سے نفور ہوں۔
بنیادی تصوّر یہ ہے:۔ گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مُردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

پہلی رباعی بر صہ ۱۴

مطلب:۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ اندھا آدمی اُس انکھیارے سے بدرجہا بہتر ہے، جو غلط بین ہے یعنی نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی سمجھتا ہے بالفاظِ دگر جو بینا ہے لیکن نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نیز میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ نادان اور جاہل دیندار، عقلمند اور دانا بیدین سے بہتر ہے ؛

بنیادی تصوّر:۔ بزرگی کا معیار تقویٰ ہے نہ کہ عقل اور کالجوں میں علم سکھایا جاتا ہے نہ کہ تقویٰ ؛

دوسری رباعی بر صہ ۱۴

مطلب:۔ اُس عقل سے انسان کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جو اُسے ماہر فلکیات تو بنا دے لیکن اس کے اندر تقویٰ اور دینداری پیدا نہ کر سکے؟ ایسے شخص کی مثال، اُس بادل کے ٹکڑے کی سی ہے جو ہوا کے جھونکوں سے فضا میں آوارہ پھر رہا ہو، اور کوئی منزلِ مقصود نہ رکھتا ہو؛

بنیادی تصوّر:۔ جو علم یا عقل، انسان کو اُس کی منزلِ مقصود تک نہ پہنچا سکے، بالکل بے سود ہے، اور کالجوں میں صرف علم پڑھایا جاتا ہے۔ مقصدِ حیات سے آگاہ نہیں کیا جاتا ؛

پہلی رباعی بر ۱۴۱

مطلب :۔ انسان کا اصلی زیور ادب ہے، نادان اور دانا دونوں اسکے محتاج ہیں۔ مبارک ہے وہ انسان جس میں ادب کی صفت پائی جائے۔ اسلئے میں اُس نوجوان کو دوست نہیں رکھتا جو علم وعقل کے اعتبار سے تو اونچے مقام پر ہو لیکن ادب کے اعتبار سے نیچے درجہ میں ہو۔

ادب کے لغوی معنیٰ ہیں ہر شئی کے اندازہ کی نگہداشت کرنا۔ اقبال کی اصطلاح میں ادب سے مراد ہے شریعتِ اسلامیہ کی پابندی کرنا چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں :۔

دیں ؟ سراپا سوختن اندر طلب
انتہایش عشق و آغازش ادب

دین اسلام کیا ہے ؟ یہ خدا سے ملنے کی لگن کا نام ہے۔ اس کی ابتدا ادب ہے اور انتہا عشق ہے۔ پس ادب یا قوانین شرعیہ کی پابندی کرنا مسلمان کا پہلا فرض ہے اور افسوس ہے کہ کالجوں میں سب کچھ سکھایا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی فن نہیں سکھایا جاتا تو وہ "ادب" ہے :۔

بنیادی تصوّر :۔ ادب یعنی شریعتِ اسلامیہ کا احترام کرنا دین کا پہلا سبق ہے اور دینداری کی اولین شرط ہے :۔

دوسری رباعی بر ۱۴۱

مطلب :۔ کالجوں کے پروفیسروں سے خطاب کرتے ہیں کہ تم کالج کے طلبہ سے نا اُمید مت ہو۔ اگر وہ ذہین نہیں ہیں تو کوئی پرواہ نہیں ہے تم یہ بتاؤ کہ

تم نے اُن کے سینہ میں دل بھی پیدا کیا ہے یا نہیں؟ یعنی تم نے اُنہیں عشق رسولؐ کا جذبہ ہے تو سب کچھ ہے اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور بھی ہے:

پہلی رباعی نمبر ۱۴۲

مطلب: والدین اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کو دین اور دانش دونوں [illegible] سکھاؤ" تاکہ وہ دنیا میں نام پیدا کر سکیں (ان کا نگین چاند اور ستاروں کی طرح چمک سکے) اور اگر تم انہیں آرٹ کے علاوہ سائنس کی تعلیم بھی دو تو بلاشبہ وہ دُنیا میں معجزے دکھا سکیں گے یعنی حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکیں گے۔

ہنر سے سائنس بھی مراد ہو سکتا ہے اور مختلف قسم کے فنون بھی، مثلاً ہوائی جہاز بنانا، انجن بنانا، آلات مختلف بنانا، وغیرہ وغیرہ۔

بنیادی تصور: - دین و دانش کے ساتھ ساتھ ہنر سیکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اسی لئے اقبال نے ہنر کو "ید بیضا" سے تعبیر کیا ہے:

دوسری رباعی نمبر ۱۴۲

مطلب: - مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ اس مغربی نظام تعلیم نے مسلمان نوجوان (مُرغِ چمن) کو عشق رسولؐ سے بیگانہ کر دیا۔ تم اس کالج کی تعلیم اور اس سرکاری عقل پر کیا ناز کرتے ہو جس کا نتیجہ یہ برآمد ہُوا ہے کہ دین بھی ہاتھ سے گیا اور دُنیا بھی نہ ملی۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے:

بنیادی تصور۔ چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے جس کی شرح یہ ہے:-

درس دریا سے بامعنی وابستگی و گر نوجوان کے سینہ میں "دل" یعنی عشق رسولؐ کا

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضہ سے اُمت بیچاری کے دیں بھی گیا دُنیا بھی گئی

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۴۳

مطلب:۔ خدا جزائے خیر دے اُس مردِ مومن کو، جس کی صحبت سے میرے دل کی کلی شگفتہ ہو گئی، اُس نے کالج کے نوجوان کو یہ دعا دی کہ اے اللہ! یہ نوجوان روٹی کے لئے کسی کی غلامی نہ کرے:

بنیادی تصور۔ چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے کہ دُنیا حاصل کرنے کے لئے ضمیر فروشی مت کرو:

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۴۳

مطلب:۔ جو شخص، توحیدِ الٰہی پر عامل ہو جاتا ہے وہ کالجوں اور پروفیسروں کی غیر اسلامی تعلیمات کے پھندے سے نکل جاتا ہے۔ اے مسلمان نوجوان اُس دینِ اور اس عقل کے حصول کی کوشش مت کر جو تجھ کو آنکھ، دل اور ہاتھ سے محروم کر دے:

بنیادی تصور:۔ اقبال کی رائے میں کالجوں کی تعلیم سے انسان، پاکیزگیٔ سیرت، جذبۂ عشق اور قوتِ بازو (شمشیر زنی) تینوں خوبیوں سے محروم ہو جاتا ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۴۴

مطلب:۔ اگر آپ یہ دیکھیں کہ کسی رہزن نے کسی قافلہ کو لوٹ لیا اور اہلِ قافلہ کو قتل کر دیا تو یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کیسے قتل کر دیا۔

کیونکہ کسی ملک میں ایک قافلہ کا لُٹ جانا، کوئی غیر معمولی واقعہ تو نہیں ہوتا جو اُسے چنداں اہمیت دی جائے قافلے عموماً لٹتے ہی رہتے ہیں اور رہزن لوگوں کو قتل کرتے ہی رہتے ہیں، رہزن سے زیادہ خطرناک وہ "علم" ہے جو آپ کالجوں میں حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ رہزن تو صرف چند آدمیوں کو قتل کرتا ہے لیکن یہ علم تو پوری قوم کو قتل کر سکتا ہے۔ لہٰذا آپ رہزنوں کا قلع قمع کرنے سے پہلے اُس نصابِ تعلیم کا خاتمہ کیجئے جو آپ کی قوم کو تباہ کر رہا ہے:

بنیادی تصوّر:۔ علومِ جدیدہ، جن کی بنیاد الحاد اور مادیت پر ہے، قوم کے حق میں رہزنوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک ہیں۔ ڈاکو تو چند افراد کو قتل کرتا ہے لیکن یہ علوم تو پوری قوم کو ہلاکت کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ اسی حقیقت کو اکبر الٰہ آبادی نے اس طرح واضح کیا ہے:۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

دوسری رباعی بر ۱۴۲

حلِ لغات:۔ خوش گِل = خوبصورت: رنگین کلاہے۔ خوش لباس: بنگاہِ او بچۂ شیراں الخ جس کی شخصیت میں بہادری کا جوہر موجود ہو: مکتب سے کالج مراد ہے: علمِ میشی یعنی وہ علم جو انسان کے اندر غلامی یا مسکینی کی روح پیدا کر دے۔ اقبال کے فلسفہ میں علم کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) علم میشی یا گوسفندی، جو انسان کو محکومی کی طرف راغب کر دے۔

(۲) علم شیری، جو انسان میں حکمرانی کا جذبہ پیدا کر دے: میسّر نا بدش الخ یعنی کالج کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسلمان جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حکمرانی

کے لئے پیدا کیا تھا، ڈگری حاصل کرنے کے بعد، نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے۔

نوٹ:۔ راقم الحروف اپنے روزمرہ مشاہدہ کی بنا پر یہ بات بلاخوف تردید لکھ سکتا ہے کہ آج تعلیم یافتہ آدمی کو سو روپے ماہوار کی ملازمت بمشکل ملتی ہے، لیکن ایک جاہل آدمی موسمی پھل بیچ کر ڈیڑھ سو روپے ماہوار بآسانی کما سکتا ہے۔ جس کو شک ہو، کسی "ریہڑی والے" سے دریافت کر لے۔

اتنی بات اور لکھ دوں کہ یہ موازنہ جاہل اور انگریزی داں میں کیا ہے۔ اگر تعلیم یافتہ سے عربی داں مراد لی جائے تو صورتِ حال یہ ہے کہ میرے محلہ کی مسجد کے امام کی تنخواہ بیس روپے ماہوار ہے اور چنگی کے محکمہ میں جنگی کو ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ ۱۲-

پہلی رباعی ص ۱۲۵

مطلب:۔ ایک اونٹ کے بچہ نے جنگل میں اپنے باپ سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا۔ باپ نے (جو تجربہ کار تھا) جواب دیا، کہ اے بیٹے، چند سے صبر کر! جب تو بڑا ہو کر، بار اٹھائیگا اور تیرا پاؤں پھسلے گا تو اُس وقت تو اپنے آپ کو بھی دیکھ لیگا اور خدا کو بھی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جب انسان زندگی کے مسائل اور اس کی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور انتہائی کوشش کے باوجود کبھی کبھی اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس وقت اُسے باطنی طور پر احساس ہوتا ہے کہ ضرور مجھ سے بالاتر کوئی قوت اس کائنات میں موجود ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی حقیقت کو اس شعر میں واضح کیا ہے:۔

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبر معلوم ہوا یہ کہ خدا بھی ہے کوئی چیز

اکبرؔ اور اقبالؔ دونوں کی تعلیم کا ماخذ حضرت علیؓ کا یہ قول ہے :۔
عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ یعنی میں نے اپنے پختہ ارادوں کے ٹوٹ جانے سے اپنے رب کو پہچانا ؛

بنیادی تصوّر :۔ اس رباعی کے لکھنے سے اقبالؔ کا مقصد اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح کرنا ہے کہ صحیح یا حقیقی تعلیم وہ ہے جو ایک مسلمان کے دل میں یہ یقین پیدا کردے کہ یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے دستِ قدرت میں ہے اور جب تک اس کی توفیق شاملِ حال نہ ہو کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی عالم کیوں نہ ہو زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے وُہ علم جو سارے علوم کی بنیاد ہے۔ اگر یہ علم حاصل ہوگیا تو یوں سمجھو کہ سارے علوم حاصل ہوگئے :۔

اسی حقیقت کو اکبرؔ الہ آبادی مرحوم نے یوں بیان کیا ہے :۔

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مل گیا اُسے جسے اللہ مل گیا

نوٹ :۔ اس جگہ اس حقیقت کا اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں نے اقبالؔ کا مطالعہ کرنے سے پہلے اکبرؔ الہ آبادی کے کلام معجز نظام کا مطالعہ نہ کرلیا ہوتا تو بلاشبہ میں اقبالؔ کو جو تھوڑا بہت سمجھ سکا ہوں یہ بھی ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے میں اپنی قوم کے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ وُہ بھی اکبرؔ کے کلام کا مطالعہ کریں لیکن موجودہ حالات کے پیشِ نظر ہمت نہیں پڑتی ۱۲

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۴۵

مطلب :۔ اگر باز یا شاہین ردّی کے ٹکڑے کے لئے، کوٹھوں کوٹھوں مارا پھرے تو اُسے شکاری پرندوں کی دُنیا میں کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اُس پرندہ کا شکار کرنے سے جس میں مٹھی بھر پر ہوں، یہ بہتر ہے کہ تو اپنے گھونسلہ میں بھوکا مر جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مرد مسلمان، روٹی کے لئے ایک "صاحب" کے دروازہ کا طواف کرنے کے بعد دوسرے کے دروازہ کا طواف شروع کردے اور اسی طواف میں عمر عزیز بسر کردے تو بلاشبہ اُسے مومنوں کی نگاہ میں کوئی عزت حاصل نہیں ہوسکتی۔ ضمیر فروشی کرکے، پیٹ پالنے سے تو یہ بدرجہا بہتر ہے کہ آدمی اپنے گھر میں بحالتِ فقر و فاقہ زندگی بسر کرے:

بنیادی تصور:۔ مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۴۶

مطلب:۔ ایک باز نے دوسرے باز سے کہا کہ تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کی کوشش کر۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو تیز نگاہ دی ہے یہ دراصل ہمارے حق میں "تازیانہ" ہے یعنی ہمیں اپنا رزق اپنی کوشش سے حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر جاندار کا رزق، خالق کائنات کے ذمہ ہے، لیکن اُس نے ہمیں تلاشِ رزق کا جذبہ اسلئے عطا کیا ہے کہ "پر کھولنے" یعنی جدوجہد (سعئ پیہم) کے لئے تحریک ہوسکے۔ اگر بغیر جدوجہد ہر شخص کو رزق مل جایا کرتا تو کچھ دنوں کے بعد ہاتھ پاؤں سب بیکار رہ جاتے اور تخلیق کا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔

بنیادی تصور:۔ اللہ تعالیٰ نے انسان حیوان اور طیور تمام جانداروں کی تخلیق اس نہج پر کی ہے کہ حصولِ رزق کے لئے جدوجہد لازمی ہے:

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۴۶

مطلب:۔ ایک نہنگ نے اپنے بچہ سے کیسی عمدہ بات کہی کہ ہمارے

مذہب میں ساحل کی تلاش یا ساحل پر زندگی بسر کرنی، یہ دونوں باتیں حرام ہیں۔ اس لئے تو ساحل سے اجتناب کر اور ہمیشہ موجوں سے کشتی لڑ اور اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ سارا سمندر ہمارا وطن ہے یعنی ایک مسلمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ آرام طلبی راحت پسندی اور عافیت کوشی ہمارے دین میں حرام ہے، اس لئے تو اس طرزِ حیات سے اجتناب کر اور دنیاوی مشکلات کا مقابلہ کر۔ اور اس حقیقت کو یاد رکھ کہ ساری دُنیا ہمارا وطن ہے۔ اگر تو ایک خطہ میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو کسی دوسرے خطہ میں چلا جا۔ بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے۔

پہلی رباعی ۱۴۷ بہ

مطلب:۔ اگر نہنگ اور دریا کے تلازمہ سے قطع نظر کر لیا جائے تو رباعی کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان نوجوان! تو دُنیا میں نہیں ہے، بلکہ یہ دُنیا تجھ میں ہے یعنی تو دُنیا کا غلام یا پابند نہیں ہے بلکہ یہ دُنیا تیری غلام اور پابند ہے، اور خدا تعالیٰ نے تجھ میں یہ طاقت ودیعت فرمادی ہے۔ کہ تو مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ان پر غالب آسکتا ہے۔ آگاہ ہو جا! کہ اگر تو دُنیا کی مشکلات سے گریز کر کے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش کریگا تو یہی دُنیا جو تیری غلام ہے یعنی تیرے فایدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے، تیرے حق میں وبال یا باعثِ ہلاکت بن جائے گی۔

اس شعر کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کا سمندر اگر تلاطم سے آسودہ ہو جائے یعنی اگر دُنیا میں مصائب اور مشکلات کا وجود باقی نہ رہے تو یہی دُنیا انسان کے حق میں موت کا پیغام بن جائے گی، کیونکہ جب جدوجہد ختم ہو جائیگی

تو انسانی ترقی بھی ختم ہو جائے گی۔

بنیادی تصور:۔ اس رباعی میں اقبال نے تنازع للبقاء کے قانون کی اہمیت واضح کی ہے:

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۴۷

مطلب:۔ اے مسلمان! میں نے ان رباعیات میں شاعری نہیں کی ہے، بلکہ تجھے صاف لفظوں میں عشق رسولؐ کا پیغام دیا ہے اور سلسلہ میں میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے۔ بلکہ بزرگان دین اور سلف صالحین نے جو حقائق و معارف بیان کئے ہیں، ان کو میں نے شاعرانہ انداز میں یعنی دلکش پیرایہ میں بیان کر دیا ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۴۸

حل لغات:۔ بخود باز آ۔ اپنی خودی کی تربیت کی طرف متوجہ ہو۔ اپنی اصلاح کی فکر کر۔ دامان دلے گیر۔ اور ترتیب خودی یا اصلاح نفس کی صورت یہ ہے کہ کسی مرشد کامل کی صحبت اختیار کر۔ درون سینۂ خود الخ اپنی خودی کی تربیت کو مقصودِ حیات بنا۔ بدہ ایں کشت را الخ یعنی خودی کی تربیت تجھے خود ہی کرنی ہوگی، اس مصرعہ کا ماخذ یہ آیت ہے:۔

لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط کوئی شخص، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا یعنی یہ ناممکن ہے کہ زید خود تو کچھ نہ کرے، بکر یا خالد اس کی خودی کو مستحکم کر دے۔ مرشد بھی اپنے مرید کی تربیت نہیں کر سکتا وہ صرف راستہ یا طریقہ بتا سکتا ہے۔ جدوجہد مرید ہی کو کرنی ہوگی جس طرح طبیب، نسخہ لکھ دیتا ہے۔

دوا پینا اور پرہیز کرنا یہ دو کام مریض ہی کو کرنے پڑتے ہیں، اسی طرح مرشد طریقہ بتا دیتا ہے، اوامر کی اطاعت کرنا اور نواہی سے بچنا یہ دو کام مرید ہی کو کرنے پڑتے ہیں اور جس طرح دُنیا کے تمام دوسرے معاملات میں انسان اپنی ہمّت اور اپنے اختیار سے کام لیتا ہے اور ان دو خدا داد طاقتوں کی بدولت کامیابی حاصل کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح استحکامِ خودی (اصلاحِ نفس) میں انسان کو اپنی ہمّت اور اپنے اختیار سے کام لینا لازمی ہے۔ استحکامِ خودی کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالمؐ نے بھی صحابہ کرام رضؓ کو انہی دو باتوں کی تلقین فرمائی تھی۔ اسی لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ فشاندم دانہ من، تو حاصلے گیر۔ یعنی اے مسلمان! استحکامِ خودی کا طریقہ میں نے تجھے بتا دیا۔ اب اس پر گامزن ہونا یہ تیرا فرض ہے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور تیسرے مصرعہ میں مذکور ہے کہ مرشد کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی کھیتی کو اپنے خون سے سیراب کر!۔

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۴۸

مطلب:۔ اے مسلمان! اس حقیقت کو ذہن نشین کر کہ حرم (خانۂ کعبہ) دراصل پتھر اور چونے کی عمارت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ تیرے قلب و نظر کے لئے یعنی ان دونوں قوتوں کے استحکام کے لئے ایک روحانی مرکز ہے۔ اور جب ہم حرم کا طواف کرتے ہیں تو کسی عمارت کا طواف نہیں کرتے بلکہ اپنے ہی مرکزِ حیات کا طواف کرتے ہیں:

نکتہ:۔ قلبِ مومن خود بجائے حرم ہے بلکہ حرم سے بھی برتر ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل شعر اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے:۔

کعبہ بتگاہِ خلیلِ آذر است
دل گذرگاہِ جلیلِ اکبر است

پس جب ایک مومن، کعبہ کا طواف کرتا ہے تو دراصل وہ کسی غیر کا طواف نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ہی قلب کا طواف کرتا ہے جو خانۂ کعبہ کی شکل میں متمثل ہو گیا ہے۔ بالفاظِ دگر، کعبہ، قلبِ مومن کی خارجی شکل ہے: میان ما و بیت اللہ، یعنی ہم میں اور بیت اللہ میں ایک ایسا مخفی رابطہ ہے کہ اسکی حقیقت کا جبریلِ امین کو بھی علم نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومن کے قلب سے اسقدر نزدیک ہے کہ قلبِ مومن اور ذاتِ باری کے درمیان کسی واسطہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اپنے بندے سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ انسان سے اقرب شئی خود اس کی جان ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ ہم اس سے بھی زیادہ قریب ہیں تو پھر بندے اور خدا کے درمیان دوسرے کی گنجائش کہاں باقی ہے:

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ قلبِ مومن اور بیت اللہ میں ناقابلِ بیان یگانگت اور یکرنگی پائی جاتی ہے۔ اور مومن کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اس قرب کو دل کی آنکھ سے دیکھ سکے اور اس کا حق الیقین پیدا کر سکے اور یہی استحکامِ خودی کی غایت ہے اور یہی اقبال کا سارا فلسفہ ہے:

حصۂ چہارم

حضورِ عالمِ انسانی

عنوان بر صفحہ ۱۴۹

تمہید:۔ علامہ مرحوم نے جاوید نامہ کے اس شعر کو اس حصہ کا عنوان بنایا ہے، جو اپنی بلاغت، معنویت اور موزونیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس حصہ کی تمام تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

حل لغات:۔ آدمیت۔ لغوی معنی ہیں آدمی ہونے کی حالت یا کیفیت لیکن یہاں شرافت، تہذیب، انسانیت یا بھلمانسیت مراد ہے ÷ احترام بمعنی عزت کرنا ÷ آدمی۔ یہاں اس لفظ سے نوع انسانی مراد ہے ÷ **آدمیت الخ** یعنی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر آدمی کا احترام کیا جائے ÷ جو شخص اپنے ہم جنسوں کا احترام نہیں کرتا وہ آدمیت سے بے بہرہ ہے ÷ **باخبر شو الخ** یعنی اے مخاطب اگر تو آدمیت (شرافت) کے دائرہ میں داخل ہونا چاہتا ہے اگر تو تہذیب اور شرافت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو "آدمی" کے مرتبہ یا مقام سے آگاہی حاصل کرنا تیرا اولین فرض ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس شعر میں ہمیں مجد و شرف انسانی سے آگاہ کیا ہے۔ وہ جیسا کہ سب جانتے ہیں، قرآن حکیم کے مبلغ اور مفسر ہیں اور اس کتاب مقدس

نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اور اس کو یہ شرف اسلئے حاصل ہوا کہ وہ خلیفۃ اللہ یعنی اللہ کا نائب ہے۔ کلام پاک میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن سے انسان کی فضیلت اور بزرگی ثابت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے عقل و فہم عطا فرمائی جو اس کے علاوہ اور کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ اور یہ اس لئے کہ وہ ساری کائنات کو مسخر کر سکے۔ کیونکہ جب تک وہ ایسا نہ کرے، مقام خلافت آلٰہیہ پر فائز نہیں ہو سکتا۔

بنیادی تصوّر:۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ اس میں آدمیت ہو یعنی شرافت، اور یہ صفت منحصر ہے اس بات پر کہ انسان اپنے ہم جنسوں کا احترام کرے، کسی انسان کو حقیر یا ذلیل نہ سمجھے ⁂

پہلی رباعی بر ص ۱۵۱

حلِ لغات:۔ بیا ساقی۔ یہاں ساقی سے ذاتِ ایزدی مراد ہے ⁂ بیار۔ یعنی عطا کن ⁂ آں کہنہ مے۔ اس سے فیضانِ سماوی بھی مراد ہو سکتا ہے اور جذبۂ عشق بھی اور تعلیماتِ اسلامی بھی ⁂ فرودیں یعنی موسم بہار اور "دی" یعنی موسم خزاں ⁂ جوان فرودیں الخ موسم خزاں کو موسم بہار میں تبدیل کر دے یعنی تباہ شدہ انسانیت پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے یا انسانیت کے اُجڑے ہوئے باغ میں پھر بہار آجائے ⁂ نوائے دہ۔ ایسی شاعری کی توفیق عطا کو یا میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کر دے ⁂ از فیض دم خویشم۔ کہ اس کی بدولت ⁂ چو مشعل بر فروزم الخ انسانوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑکا دوں ⁂

مطلب:۔ اے خدا! مجھے اپنی محبت کی ایسی شراب پلا دے کہ اس کی بدولت میرے دل میں یا میری شاعری میں ایسی تاثیر پیدا ہو جائے کہ میں ساری

دنیا کو محبت کا پیغام دے سکوں:

بنیادی تصور:۔ اقبال نے اس رباعی میں ہمیں بنی آدم سے بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب محبت کرنے کا درس دیا ہے اور ان کی رائے میں اس محبت کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ ساری دنیا کو اسلام کے پیغام سے روشناس کیا جائے چنانچہ آیندہ رباعی میں اسی تصور کی وضاحت کی ہے:

پہلی رباعی برصفحہ ۱۵۲

حل لغات: بیکے:۔ یہاں اس لفظ کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ اس جگہ بطور تحریص و ترغیب مستعمل ہے: **از حجرۂ خلوت الخ** یعنی گوشہ نشینی ترک کر دے: **بردل آ** کا فاعل، انسان ہے جو محذوف ہے: **بباد صبحگاہی الخ** یعنی فطرت کا مطالعہ کر کے اپنی نگاہ میں یا اپنے دل میں وسعت پیدا کر۔ مراد یہ ہے کہ فطرت اپنے انعامات کی تقسیم میں کسی قسم کی تخصیص مدنظر نہیں رکھتی مثلاً سورج ساری دنیا پر چمکتا ہے: **خروش** سے جذبۂ محبت یا ہمدردی بنی نوع آدم مراد ہے: **این مقام رنگ و بو** سے یہ ساری کائنات مراد ہے: **نالۂ مرغے**۔ مرغ سے یہاں مرغِ چمن یعنی بلبل مراد ہے:

مطلب:۔ اے انسان! حجرہ سے باہر نکل! قوانین فطرت کا مطالعہ کر کے اپنے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا کر اور ساری دنیا کو محبت کا پیغام دے:

دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کم از کم اتنا ہنگامہ تو برپا کر دے یا جذباتِ محبت میں اتنا اضافہ تو کر دے جتنا موسم بہار میں بلبل کے نغموں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے:

دوسری رباعی برصلا۱۵۲

حل لغات:۔ زمانہ فتنہ ہا الخ یعنی اس دُنیا کا دستور یہ ہے کہ اس میں نت نئے فتنے (حادثات) رو نما ہوتے رہتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد ختم ہو جاتے ہیں: خساں را در بغل الخ اور اس دُنیا میں بہت سے ذلیل اور کمینہ خصلت آدمی برسرِ عروج آجاتے ہیں (مثلاً بچہ سقہ) لیکن کچھ دنوں کے بعد زمانہ خود انہیں مٹا دیتا ہے: **دو صد بغداد** سے بہت سی اقوام یا سلطنتیں مراد ہیں: چنگیزی اد۔ اس زمانہ کی ظالمانہ روش مراد ہے: **گور تیرہ بختاں۔** بدقسمت آدمیوں کی قبروں کی طرح: کرد بمعنی مٹا دیا: **بگذشت** بمعنی پلٹا کھا گیا:

مطلب:۔ اے انسان! زمانہ کی مہربانی یا سرد مہری سے کوئی اثر قبول مت کر۔ زمانہ (دُنیا) کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اُس نے بہت سے ذلیل انسانوں کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا اور پھر خود ہی ان کا نام و نشان مٹا دیا۔ اُس نے سینکڑوں قوموں کو آسمان پر چڑھا دیا اور کچھ عرصہ کے بعد ان کا نام صفحہ ہستی سے اس طرح مٹا دیا جیسے کسی تیرہ بخت کی قبر کچھ دنوں کے بعد مٹ جاتی ہے:

بنیادی تصور:۔ انسان کو زمانہ کی نیرنگی سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ ہر حال میں اپنا فرض منصبی ادا کرنا چاہیئے:

پہلی رباعی برصلا۱۵۳

حل لغات:۔ بسا کس اندوہِ فردا الخ یعنی دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جو آئندہ مصائب کے تصور میں رہتے ہیں اور اس تصور سے انکی قوتِ عمل اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ زمانہ حال میں کوئی کام نہیں کرتے اسلئے

زمانہ آئندہ (فردا) میں انہیں کوئی ثمرہ یا نتیجہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مطلب ہے دوسرے مصرعہ کا یعنی جب ایک شخص نے زمانہ گذشتہ میں کوئی کام ہی نہیں کیا تو زمانہ آئندہ میں ثمرہ کیا ملیگا؟ آج وہ شخص پھل کھا سکتا ہے۔ یا کھا رہا ہے جس نے کل (زمانہ گذشتہ) درخت لگایا تھا:

خناک مرداں۔خوش قسمت لوگ:۔ درداماں امروز۔یعنی موجودہ وقت میں:

ہزاراں تازہ تر الخ بہت سے کام انجام دیئے:

مطلب واضح ہے کہ آج ۱۹۵۲ء میں وہی فرد یا قوم سربلند ہے جس نے اس سربلندی کے لئے کل یعنی ۱۹۰۲ء میں کوشش اور محنت کی تھی۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو آج سرگرم عمل ہیں۔کیونکہ ان کی قوم آئندہ زمانہ میں ان کی اس محنت کا پھل کھا سکے گی:

بنیادی تصور:۔ اقبال نے بنی آدم کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اس قانون قدرت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اگر فردا (زمانہ آئندہ میں عروج) کے متمنی ہو تو "امروز" یعنی موجودہ وقت کی قدر کرو، اور اُسے "چخ یا گپ" میں ضائع مت کرو:

نوٹ:۔ واضح ہو کہ مردانہ مکان یا مردانہ نشست گاہ میں بیٹھ کر نخواہ مہمل دکیک اور سوقیانہ گفتگو میں وقت ضائع کرنا اور اس قسم کی مخرب اخلاق گفتگو کے دوران میں حقہ، چاء، پان، بیڑی، سگرٹ کا استعمال کرنا، مسلمانوں کا محبوب ترین مشغلہ حیات ہے۔ دلّی والے اس کو "چخ لڑانا" کہتے ہیں اور لاہور والے اسی کو "گپیں مارنا" کہتے ہیں۔ الفاظ مختلف ہیں لیکن مقصد یکساں ہے۔اب چونکہ مکانوں کی قلت ہے، اسلئے یہ فریضہ "بیکری" اور "ٹی ہاؤس" میں انجام دیا جاتا ہے جو تضیع اوقات اور تضیع زر، دونوں کا۔

"ماڈرن" اور فیشن ایبل طریقہ ہے۔ جو لوگ ان مقامات میں نہیں جا سکتے، وہ تکیوں، دائروں اور درگاہوں میں بیٹھ کر اس اہم قومی فرض کو انجام دے لیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں چائے اور کافی کے بجائے بھنگ اور چرس کا دَور چلتا ہے۔ بلاشبہ مسلمان قوم کی دانشمندی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اُس نے حضرت شیخ ہجویری المُلقب بہ داتا گنج بخشؒ اور حضرت میاں میرؒ کی درگاہوں (آرام گاہوں) کو بھنگ اور چرس نوشی کا مرکز بنایا ہے تاکہ اُن بزرگوں کی برکت سے "رُوحانیت" کی منازل بہت جلد طے ہو سکیں ۱۲

دوسری رباعی نمبر ۱۵۳

حل لغات:۔ چو بلبل نالہ الخ یعنی اے انسان! تو اسلئے آہ و نالہ نہیں کرتا کہ تیرے جسم میں جانِ بیدار نہیں ہے مراد اس سے یہ ہے کہ تو اس لئے بنی آدم کی خدمت نہیں کرتا کہ تیرے دل میں ان کی محبت کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ درین گلشن کہ الخ اس دنیا میں گلچینی جائز ہے، لیکن تو کانٹوں کے ڈر سے پھول توڑنے کی ہمت ہی نہیں کرتا۔ مراد یہ ہے کہ اے انسان! تو اس دُنیا میں سربلندی حاصل کر سکتا ہے لیکن تو مشکلات سے گھبراتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے:

بنیادی تصوّر:۔ گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گُل کے جویا ہیں اُنہیں کیا خار کا کھٹکا

نوٹ:۔ اگرچہ اقبالؔ نے ان رباعیات میں انسان کو مخاطب بنایا ہے لیکن مسلمان قوم بدرجۂ اولیٰ مخاطب ہے کیونکہ اس وقت صفحۂ ہستی پر اس سے زیادہ آرام طلب اور عیش پسند کوئی قوم موجود نہیں ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۵۴

حل لغات :۔ بیا۔ یہاں اس لفظ کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ تحریص وترغیب مراد ہے:۔ بر خویشتن پیچیدن۔ یہ اقبال کی اصطلاح ہے۔ اور ع بخود پیچیدگاں در دل اسیر اند کے ضمن میں اس کی تشریح لکھ چکا ہوں۔ مراد ہے خودی کی حفاظت تربیت اور پرورش کرنا یا اُسے مرتبہ کمال تک پہنچانا:۔ بناخن سینہ کا دیدن الخ یعنی مسلکِ عشق اختیار کرنا اور اس راہ میں مجاہدات کرنا:۔ اگر خواہی خدارا فاش بینی الخ یعنی اے انسان! اگر تو خدا کو دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی خودی کو دیکھ لے۔ دونوں ایک ہی ہیں، یعنی خودی عینِ خدا ہے اور خدا عینِ خودی ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ دو ہوں تو فرق ہو، جب دوسرا موجود ہی نہیں تو دوئی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور جب دوئی نہیں تو فرق (تمیز یا امتیاز) کیسے ہو سکتا ہے؟ لا موجود الا اللہ کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی دوسری ہستی موجود نہیں ہے یا اسی حقیقت کو حضرت اقبال نے پیام مشرق میں یوں بیان کیا ہے :۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی — کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

یعنی اے انسان! تو کسے ڈھونڈ رہا ہے اور کیوں مفت پریشان ہو رہا ہے؛ اگر تو غور و فکر سے کام لے (اسی کو اصطلاح میں مراقبہ یا دھیان کہتے ہیں) تو یہ حقیقت تجھ پر منکشف ہو جائے گی کہ وہ پوشیدہ نہیں ہے بلکہ تو پوشیدہ ہے، یعنی اُس کا جلوہ تو ہر شئی میں ظاہر ہو رہا ہے وہ تو ہر پتی اور ہر پھول میں نمایاں ہے۔ وہ تو ہر جگہ عیاں ہے۔ ہاں تو بیشک

پوشیدہ ہے، یعنی زیرِ نقاب ہے، وہ اس طرح کہ تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہے۔ تو اپنے کو "غیر" سمجھتا ہے یا بالفاظِ دگر موجود سمجھتا ہے۔ بس یہی تیری سب سے بڑی غلطی ہے کہ تو اس کو بھی موجود سمجھتا ہے اور اپنے کو بھی۔ اس طرح دوئی پیدا کر دیتا ہے اور ہزاروں فتنوں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اے نادان! دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو تجربہ کرکے دیکھ لے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ تلاش شروع کر دے۔

(۱) اگر تو اپنی تلاش کریگا تو اُس کو پائیگا۔ یعنی تیری خودی عین خدا ہے۔ اگر تو اُس کی تلاش کرے گا تو اپنے کو پائیگا۔ یعنی خدا، عین خودی ہے نتیجہ دونوں صورتوں میں واحد ہے۔ یعنی لَا مَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ۔

دوسری رباعی نمبر ۱۵۴

حلِ لغات:۔ گلہ از سختیِ ایام الخ یعنی اے انسان! زمانہ یا تقدیر کا گلہ کرنا دراصل خود فریبی کی ایک دلپذیر صورت ہے۔

دگر ہیچ کہ سختی ناکشیدہ الخ یاد رکھ کہ جو شخص دنیا کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کرتا وہ کبھی اپنی خودی کو مستحکم نہیں کر سکتا۔ آبِ جوئبار۔ چشمہ کا پانی۔ کم عیار بمعنی ناقص یا خام۔ اگر بر سنگ غلطد الخ یعنی جس طرح چشمہ کا پانی جب پتھروں سے ٹکراتا ہے تو حسین معلوم ہوتا ہے اسی طرح مردِ مومن (مسلم) جب مصائب سے دوچار ہوتا ہے۔ تو اس کی خودی میں حسن و جمال پیدا ہو جاتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ مصائب کا مقابلہ کرنے ہی سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔

پہلی رباعی بر ص۱۵۵

حل لغات:۔ کبوتر۔ یہاں کبوتر سے انسان (مُسلم) مراد ہے ‪:‬
چہ خوش گفت یعنی کس قدر قیمتی نصیحت کی! ‪:‬ خوئے حریری مراد ہے
عیش پسندی اور آرام طلبی ‪:‬ اگر "یا ھُو" زنی الخ یعنی اگر تو عشق الٰہی اختیار کرلے۔
کلہ را از سرِ شاہیں الخ تو دنیا کی زبردست اقوام پر غالب آسکیگا ‪:‬
مطلب واضح ہے کہ مسلمان بلاشبہ زبان سے اللّٰہ اکبر! کہتا ہے لیکن دل
سے نہیں کہتا۔ اگر وہ "مستیٔ شوق" سے مغلوب ہو کر اللّٰہ اکبر کا نعرہ سرزد کرے
تو بڑے بڑے فراعنہ اس کے سامنے سرنگوں ہو جائیں اور یہی بنیادی تصوّ
بھی ہے کہ "یا ھُو" زبان سے مت کہو بلکہ دل سے کہو تو اس کا اثر ظاہر ہوگا ‪:‬
نوٹ:۔ چونکہ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کبوتر "یا ھُو" کا ورد کرتے ہیں
اس لئے اقبال نے اس نکتہ کو کبوتر کی زبان سے ادا کیا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے
کہ کوئی عیش پسند قوم دُنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی ‪:‬

دوسری رباعی بر ص۱۵۵

حل لغات:۔ فتادی از مقام الخ یعنی تو اپنے بلند مقام سے نیچے
گر گیا ‪:‬ مقامِ کبریائی سے لغوی مفہوم مراد نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو دوسرے
کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن بندہ چونکہ خلیفۃ اللّٰہ ہے اس لئے ظلی طور پر
اس میں بھی کبریائی کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی سطوت و حکومت۔ اس
ہبوط کی وجہ دوسرے مصرعہ میں بیان کر دی ہے ‪:‬ حضور دوں نہاداں الخ
تو کمینہ اور ذلیل فطرت انسانوں کی غلامی کر رہا ہے ‪:‬ تو شاہینی۔ اے انسان!

تو اپنی اصل اور تخلیق کے اعتبار سے بیشک شاہین (خلیفۃ اللہ) ہے؛ ولیکن خویشتن را الخ یعنی جب تک تو اپنی فطرت (اسلام) کے اقتضاء پر عمل نہیں کریگا یا جب تک تو اپنے ضمیر کی اطاعت نہیں کریگا، اس وقت تک تیری خودی مستحکم نہیں ہوسکتی اور حصولِ مقامِ کبریائی (جیسا کہ سب جانتے ہیں) استحکام خودی پر موقوف و منحصر ہے؛

بنیادی تصور:۔ اس رباعی کے چوتھے مصرعہ میں پوشیدہ ہے۔ پوشیدہ اس لئے کہا کہ مصرعہ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ "جب تک تو اپنے جال میں نہ پھنس جائے" اور اس عبارت سے بنیادی تصور واضح نہیں ہو سکتا۔ در اصل اقبال نے اس شعر میں فلسفۂ اسلام کا ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ جس کی تشریح انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مسلمان اس وقت بنتا ہے جب شریعت کی پابندی اُس کی طبیعت ثانیہ بن جائے، یعنی وہ اپنی طبیعت کو اس طرح اطاعت کے سانچہ میں ڈھال دے کہ جب وہ شریعت کے کسی حکم پر عمل کرے تو اُسے یہ محسوس ہو کہ یہ حکم" میری طبیعت کا اقتضاء ہے۔ کسی غیر نے مجھ پر خارجاً عاید نہیں کیا ہے؛

پہلی رباعی بر ص۱۵۶

حل لغات:۔ خوشا روزیکہ الخ یعنی وہ دن بہت مبارک ہوگا جب تو اپنی خودی کی معرفت حاصل کریگا۔ کیونکہ یہی معرفت اُس فقر کا دوسرا نام ہے جس کی بدولت انسان، کائنات پر حکمران ہوجاتا ہے؛ حیاتِ جاوداں اندر الخ اس مقام عالیہ اور مرتبۂ عظمیٰ تک پہنچنے کی پہلی منزل یقین ہے، یعنی یقین انسان

کی تمام روحانی ترقیات کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی یقین سے انسان میں شانِ فقر پیدا ہوتی ہے اور اس کا ثمرہ "حیاتِ جاوداں" ہے۔ یعنی ہمیشگی کی زندگی؛ یقین کو قرآن حکیم کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ حیاتِ جاوداں کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے؛ مومن جب مرکر دوبارہ زندہ ہوگا تو اس کے لئے غیر محدود ترقی کا دروازہ کھل جائے گا؛ تخمین یعنی اٹکل؛ ظن بمعنی گمان یا شک؛ اقبال نے تخمین وظن کو اس جگہ یقین کی ضد کے معنی میں استعمال کیا ہے؛ رہِ تخمین وظن گیری الخ یعنی اگر تو اللہ تعالیٰ اور اسکے پاک کلام پر ایمان نہیں لائے گا۔ بلکہ اپنے قیاس یا گمان پر زندگی بسر کریگا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جب تو مرکر دوبارہ زندہ ہوگا تو ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی، یعنی تیری وہ زندگی حقیقی معنیٰ میں زندگی نہیں ہوگی روحانی اعتبار سے جب تو اس دنیا میں وفات پائے گا تو ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیگا۔ یہاں "بمیری" کا مطلب محض مرجانا نہیں ہے کیونکہ موت تو مومن اور کافر دونوں کو آئے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوگا تو روحانی اعتبار سے ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گا؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کی روحانی ترقی یقین پر موقوف ہے؛

دوسری رباعی نمبر ۱۵۶

حلِ لغات:۔ تو ہم مثلِ من از خود در حجابی۔ اس مصرعہ میں اقبال نے "تو" اور "من" دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ان سے خاص افراد مراد نہیں ہیں۔ بلکہ انسانوں کی دو قسمیں مراد ہیں جن کی تصریح دوسرے شعر میں ہے؛ از خود در حجابی، یعنی میں بھی اپنی خودی سے ناواقف ہوں اور تو بھی خودی سے ناواقفیت

کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اور مجھے، خودی کی مخفی صلاحیتوں کا علم نہیں ہے، یہ علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے یا یوں سمجھو کہ جب یہ علم حاصل ہو جاتا ہے، اس وقت شانِ فقر پیدا ہوتی ہے: اس علم کا دوسرا نام شانِ فقر ہے: خنک روزے کہ خود را بازیابی۔ اس مصرعہ کا مطلب ہے۔ ع خوشا روزے کہ خود را باز گیری۔ بازیافتن اور باز گرفتن دونوں کا ایک ہی مطلب ہے یعنی اپنی خودی سے آگاہی حاصل کرنا یا معرفتِ ذات حاصل کرنا: ترا کافر کند الخ یعنی بعض لوگوں کے حق میں، اندیشۂ رزق یا فکرِ معاش سدِ راہ بن جاتی ہے یعنی فکر معاش، اُن کے اور معرفتِ ذات کے مابین روک بن جاتی ہے: ترا کافر کند الخ یعنی علم کتابی یا فلسفہ، بعض لوگوں کے اور معرفتِ ذات کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ اس لئے اپنی خودی سے آگاہ نہیں ہو سکتے کہ وہ ساری عمر فکرِ معاش میں گرفتار رہتے ہیں۔ اور بعض لوگ اس لئے اپنی خودی کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے کہ کتابی علم (فلسفہ) اُن کے اندر ایسے شکوک پیدا کر دیتا ہے جو ساری عمر دماغ سے نہیں نکل سکتے:

بنیادی تصور یہ ہے کہ فکر معاش اور علم کتابی، بندہ اور خدا کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرُ۔ یعنی علم سب سے بڑا حجاب ہے:

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۵۷

حل لغات: ۔ چہ خوش گفت۔ بہت عمدہ نصیحت کی: کُرّہ بمعنی بچہ شتر: خنک بمعنی خوش نصیب: کہ داند کار خود را یعنی وہ شخص جو اپنے

فرائضِ منصبی سے آگاہ ہو۔ بگیر از ما یعنی ہم سے سیکھ لے ؛

بنیادی تصور جو تھے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی مبارک ہے وہ انسان جو اپنے فرائض سے آگاہ ہو اور بوجھ خود اُٹھائے۔ کیونکہ قانون قدرت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ اقبالؔ نے اس رباعی میں انسان کو اعتماد علی النفس کی تعلیم دی ہے ؛

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۵۷ اور پہلی رباعی بر صفحہ ۱۵۸

حل لغات:۔ دانائے افرنگ سے حکمائے یورپ مراد ہیں ؛ بسیار نسفتہ الخ یعنی حکمائے مغرب نے اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا ہے کہ کائنات اور انسان کی حقیقت کیا ہے ؟ دو حرفے سے ایک اہم نکتہ مراد ہے ؛ پیر مردے از الخ جو مجھ سے حکمائے مشرق نے بیان کیا یا جو میں نے اُن کی تصانیف میں پڑھا ہے ؛ اے کشتۂ نامحرمے چند یعنی اے وہ شخص جس کو اُن حکما نے گمراہ کر دیا جو خود حقیقت سے نابلد ہیں ؛ خریدی از پئے یک دل الخ یعنی تو نے اپنے دل کو متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا لیا جس کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ؛ ز تا دیلات مُلّایاں نکوتر الخ یعنی بہت سے مُلّاؤں کے درس میں شریک ہونے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ انسان کسی ایک مرد کامل کی صحبت میں کچھ دیر کے لئے بیٹھے اور اپنی اصلاح کرے ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ مُلّاؤں کی صحبت میں دس سال تک بیٹھنے سے، کسی مرشد کامل کی صحبت میں دس دن بیٹھنا انسان کے حق میں زیادہ مفید ہے ؛

دوسری رباعی بر ۱۵۸

حل لغات: - وجود است این کہ بینی یا نمود است؟ یعنی جو کچھ نظر آتا ہے یہ وجود ہے یا نمود؟ یعنی یہ کائنات حقیقی ہے یا غیر حقیقی؟ اس مصرعہ میں لفظ "نمود" کو اقبال نے "وجود" کی ضد کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ وجود کا معنی ہے وہ شئی جو فی الحقیقت خارج میں موجود ہو اور نمود کا معنی ہے وہ شئی جو صرف نظر آئے۔ لیکن خارجی وجود نہ رکھتی ہو۔ حکیم ماچہ مشکلہا الخ۔ اس مصرعہ میں طنز ہے اس لئے لفظی معنی مراد نہیں ہو سکتے بلکہ برعکس آں، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکماء نے اپنی بحثوں سے ہمارے لئے مشکلات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کتابے بر فن الخ یعنی ان علماء کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے غواصی (غیرا کی) پر کتاب تو لکھدی لیکن خود کبھی دریا میں غواصی نہیں کی۔ مطلب یہ ہے کہ حکماء اور فلاسفہ اپنی ساری عمر خدا اور کائنات سے متعلق بحثوں میں تو ضائع کر دیتے ہیں لیکن اپنی معرفت حاصل نہیں کرتے غواصی کے فن پر وہ شخص کتاب لکھ سکتا ہے جس نے خود اس فن کو حاصل کیا ہو۔ اسی طرح خدا اور کائنات پر وہ شخص گفتگو کر سکتا ہے جس نے پہلے اپنی معرفت حاصل کر لی ہو۔ یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے۔

پہلی رباعی بر ۱۵۹

مطلب: - اے انسان! زندگی بہت مختصر ہے اور تو اس بات کا ہم نہیں رہ سکتا کہ ہمیشہ تیرے حالات یکساں رہیں گے۔ اس لئے تو اپنے تیشہ کی ضرب سے کوہ بیستوں کو پارہ پارہ کر دے اور اپنا قیمتی وقت ان

دُور از کارِ بحثوں میں ضائع مت کر کہ چنگاری تیرے تیشہ سے نکلی یا پتھر سے؟

بنیادی تصوّر:- اقبال نے ہمیں یہ نصیحت کی ہے کہ جہاد، فلسفہ سے بہتر ہے، کیونکہ فلسفہ ہمیں حقیقت کا علم عطا نہیں کر سکتا، اس لئے ساری عمر فلسفیانہ بحثوں میں ضائع ہو جائے گی اور کامیابی کے لئے عمل (جہاد) شرط ہے نہ کہ بحث۔ مثلاً ایک آقا دو آدمیوں کو اس امر پر متعیّن کرتا ہے کہ فلاں ٹیلہ کو کھود کر پھینک دو۔ پہلا آدمی تو مسلسل پتھر توڑ رہا ہے لیکن دوسرا آدمی یہ سوچ رہا ہے کہ شرر کس چیز سے نکلا؟ تیشہ سے یا پتھر سے؟ ظاہر ہے کہ وہ شخص ساری عمر اسی مسئلہ کے حل کرنے میں گذار دیگا۔ نتیجہ یہ نکلے گا، کہ پہلا آدمی تو اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب ہو جائیگا (آقا اس سے خوش ہو جائیگا) اور دوسرا آدمی یقیناً ناکام رہیگا:

نکتہ:- اقبال نے "شرر از تیشہ خیزد یا ز سنگ است" کے پردہ میں فلسفہ کے ایک اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی فعل کا ظہور انسان سے ہوتا ہے یا خدا سے؟ یا الفاظ دگر فاعلِ حقیقی کون ہے؟ اس باب میں بہت اختلافِ آراء ہے جس کی تفصیل اس شرح میں درج نہیں کر سکتا:

دوسری رباعی بر ۱۵۹

حل لغات:- منہ از کف چراغ الخ یعنی طریقِ عشق پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ: بدست آور مقام الخ یعنی دُنیائے عشق میں اپنا مقام پیدا کر: مشو در چار سوئے الخ یعنی کائنات کی غلامی اختیار مت کر یا غیراللہ کو مقصود مت بنا یا کسی دنیاوی طاقت سے مغلوب مت ہو جا: بخود باز آ یعنی اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہنچا یا اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر:

بشکن چار سو را یعنی اس کائنات کو اپنا غلام بنا لے یا مسخر کر لے یا کائنات حقیقت سے آگاہ ہو جا کہ وہ تیری خادم ہے اور تو اس کا مخدوم ہے بشکن یعنی مسخر کن ؛

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے کہ اگر تو اپنی خودی کی معرفت حاصل کریگا تو یہ کائنات تیری غلام ہو جائے گی، تو اس پر حکمران ہو جائیگا؛

پہلی رباعی بر صنہ ۱۶۰

حل لغات:- دل دریا یعنی یہ کائنات ؛ سکون بیگانہ از تست یعنی اس دنیا میں جس قدر ہنگامہ برپا ہے یہ سب تیرے ہی دم قدم کی برکت ہے ؛ بہ جیبش گوہر ایک دانہ الخ یعنی اس کائنات میں جس قدر خوبیاں پوشیدہ ہیں وہ تیری ہی جد وجہد کی بدولت بروئے کار آسکتی ہیں ؛ تو اے موج یعنی اے انسان ! اضطراب خود نگہدار یعنی اپنی جد وجہد کو برقرار رکھ ؛ کہ دریا را الخ یعنی اس کائنات کی ساری رونق اور ساری خوبی تیرے ہی دم سے ہے ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے فائدے کے لئے لاکھوں نعماء مخفی کر دی ہیں، اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ جد وجہد کر کے ان نعماء کو حاصل کرے۔ خود بھی مستفید ہو اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے ؛

دوسری رباعی بر صنہ ۱۶۰

حل لغات:- دو گیتی را بخود الخ یعنی دنیا اور عقبیٰ میں کامیابی حاصل

کرنے کے لئے انسان کو خود کوشش کرنی لازم ہے: نبا ید از حضورِ خود دلا غ
یعنی اپنی خودی کی تربیت سے کسی وقت غافل مت ہو: بنو ید دوش ہیں الخ
یعنی تیری موجودہ حالت نتیجہ ہے تیرے سابقہ اعمال کا مثلاً اگر تو آج ذلیل و
خوار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے کل (زمانہ گذشتہ) ترقی یا عزت حاصل
کرنے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی تھی: ز دوش امروز را الخ یعنی اے انسان!
تو اس حقیقت کو ہمیشہ مدنظر رکھ کہ کوئی شخص اپنے امروز کو اپنے دوش سے جدا
نہیں کر سکتا۔ یعنی انسان کی موجودہ زندگی، سابقہ زندگی کا لازمی نتیجہ ہوتی
ہے۔ مثلاً جو شخص جوانی کا زمانہ، غفلت یا عیاشی میں ضائع کر دیتا ہے۔ وہ
بڑھاپے میں کبھی سُکھی نہیں رہ سکتا:

پہلی رباعی بر ۱۶۱

مطلب:۔ بظاہر اقبال گل ولالہ سے خطاب کرتے ہیں کہ تو نے اپنے حسین چہرہ سے نقاب اتار کر اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کر دیا۔ میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ جب تو شاخ پر آگا، اس وقت لوگوں نے تجھے "لالہ" کے نام سے پکارنا شروع کیا، لیکن جب تو شاخ کے اندر تھا، اس وقت تیری کیا کیفیت تھی اور تو کیا تھا؟ پھول یا بوٹا؟:

بنیادی تصور واضح ہو کہ اس مشکل رباعی میں اقبال نے وحدتِ شہود کی تعلیم دی ہے۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود، فلسفۂ تصوف کی مشہور اصطلاحیں ہیں: اول الذکر کا مفہوم یہ ہے کہ وجود حقیقی، جو مستقل، قائم بالذات اور خارجی ہے، صرف ایک ہے۔ اس ذاتِ واحد کے علاوہ اور کوئی بالمعنی اس معنی میں موجود نہیں ہے۔ جس قدر موجودات ہم کو نظر آتے ہیں۔

یہ سب اُسی وجودِ واحد کے اظلال و آثار و عکوس ہیں۔ ان کی اپنی کوئی مستقل یا قائم بالذات ہستی نہیں ہے۔

وحدتِ شہود کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جس قدر موجودات ہیں سب اُسی ذاتِ واحد کے مظاہر و آثار ہیں۔ ہر شئے میں وہی جلوہ گر ہے، وہی ظاہر ہو رہا ہے ؎

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے
(بانگِ درا)

خلاصۂ کلام این کہ:-

(۱) کائنات میں صرف ایک کو موجود یقین کرنا = وحدتِ وجود یا ہمہ اوست ہے۔
(۲) کائنات کے مختلف مظاہر میں صرف ایک دیکھنا = وحدتِ شہود یا ہمہ اندراوست ہے۔

اسی نظریۂ ہمہ اندراوست کو بعض صوفیاء ہمہ ازدست یا ہمہ بااوست سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب لالہ، شاخِ لالہ سے برآمد ہوتا ہے تو اُسے لفظ "لالہ" سے موسوم کر دیتے ہیں لیکن ظہور سے قبل جب وہ گل، شاخ کے اندر پنہاں ہوتا ہے تو اُس میں اور شاخ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بلکہ شاخ و گل دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح زید یا بکر جب بطنِ مادر سے ظاہر ہوتا ہے تو اُسے زید یا بکر کہنے لگتے ہیں۔ قبل تخلیق اُس میں اور خالق میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ درحقیقت تمام مخلوقات خالق کائنات ہی سے برآمد ہوتی ہیں۔ جب خارج میں ان کا ظہور ہوا تو تعینات پیدا ہو گئے۔ ورنہ قبل ظہور ہمہ مخلوقات، ذاتِ خالق ہی میں پوشیدہ اور آرمیدہ تھیں اور ان میں اور خالق میں

کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اسی حقیقت کو اقبال نے گل اور شاخ کی مثال سے واضح کیا ہے کہ ظہور سے قبل گل کہاں تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ شاخ میں تھا۔ اسی طرح ظہور سے قبل کائنات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ذاتِ واحد میں تھی۔ اس نکتہ کو اصطلاح میں "ہمہ اندر اوست" کہتے ہیں ؎

نوٹ:۔ محقق دوانی (ملا جلال الدین صاحبِ اخلاق جلالی) نے بھی اپنی بلند پایہ فلسفیانہ تصنیف "انموذج العلوم" میں یہی تعبیر اختیار کی ہے اور راقم الحروف کی رائے میں اقبال، محقق دوانی اور شیخ اکبر ہر سہ اصحاب نے اس باب میں حکیم فلاطینس (plotinus) بانی فلسفۂ اشراق کا اتباع کیا ہے۔ جس نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات اسی طرح خدا سے صادر ہوئی جس طرح شعاعِ آفتاب، آفتاب سے صادر ہوتی ہے یعنی جس طرح شعاع، آفتاب سے نکلی ہے۔ اسی طرح یہ دنیا بھی خدا ہی سے نکلی ہے۔ ہم سب خدا ہی میں رہتے ہیں اور انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر چلے جائیں گے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کا یہی مطلب ہے ؎

دوسری رباعی بر ص ۱۶۱

مطلب:۔ اے انسان! جو شخص حقیقی معنی میں "مرد" ہوتا ہے یعنی صاحبِ ہمت و حوصلہ، وہ دنیا کی تکالیف سے متاثر نہیں ہوا کرتا۔ اور رنج یا غم یا درد کی بناء پر، اس کی آنکھ سے آنسو نہیں نکلا کرتے وہ تمام مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ لیکن اگر تم کبھی اُسے روتے ہوئے دیکھو تو (اپنے اوپر قیاس مت کرو) سمجھ لو کہ اس کے رونے کا باعث "سوزِ مستی" ہے ؎

بنیادی تصور۔ بزدل آدمی، مصائب میں روتا ہے لیکن مردِ یعنی خوش عقیدہ انسان صرف محبتِ الٰہی میں رو سکتا ہے۔ اُس کی آنکھ سے آنسو اگر نکل سکتا ہے تو فراقِ محبوب میں۔

پہلی رباعی پر صفحہ ۱۶۲

مطلب:۔ اے انسان! یہ مت گمان کر کہ مردِ کامل پر جو امتحان میں کامیاب ہو چکا ہے۔ موت (فنائے کلی) وارد ہو سکتی ہے، بیشک بنا عدہ قانون فطرت دہ زیر آسمان ایک دفعہ تو ضرور مرے گا، لیکن یہ موت، پیغام فنا نہیں ہے۔

ع مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں

یعنی عاشق طبعی اعتبار سے ایک مرتبہ مرتا تو ضرور ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔

پس اے انسان! صرف یہی ایک موت ہے۔ جو تیری شان کے مطابق ہے یعنی اس طرح زندگی بسر کر اور اپنی خودی کو اس قدر مستحکم کرلے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے۔

ہو اگر خود نگر و خودگر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

ورنہ مرنے کے لئے یعنی فنا ہو جانے کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے مرنے کی سینکڑوں صورتیں ہیں، جس صورت کو اختیار کرلے، مرجائے گا۔

بنیادی تصور:۔ ہمیشہ زندہ رہنا یا بقائے دوام حاصل کرنا، یہ مشکل ہے۔ مرنا (فنا ہو جانا)، تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ مثلاً ساری عمر "ٹھیلے" بیٹھے رہو۔ انشاءاللہ کسی زحمت یا کوشش کے بغیر خود بخود مرجاؤ گے، یعنی موت کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤ گے۔

دوسری رباعی بر ۱۶۲

حل لغات:۔ اگر خاک تو الخ یعنی اگر تجھ میں زندہ رہنے اور ابدی زندگی حاصل کرنے کی تڑپ نہیں ہے ؛ بشاخ تو ہم از الخ تو خارجی اسباب تجھے حقیقی زندگی یا حیاتِ ابدی عطا نہیں کر سکتے۔ یا اگر تو خود اپنی خودی کو مستحکم کرنے کے لئے جدوجہد نہ کرے تو مرشد (نیسان) کی توجہ کبھی تجھے مومن نہیں بنا سکتی ؛ ز غم آزاد شو الخ اس لئے میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو زر، زن، زمین، ان غموم سہ گانہ سے دل کو پاک کر لے اور اپنی پوری توجہ، خودی (دم) کے استحکام پر مبذول کر دے۔ جب تو اپنی خودی کو مستحکم کرے گا تو تجھے معلوم ہو گا کہ مردِ مومن کے سینہ میں کسی قسم کا غم راہ نہیں پا سکتا۔ غم ہوتا ہی ہے، اُن لوگوں کے سینہ میں جو خام اور ناقص ہوتے ہیں ؛ پُردم اقبال کی اصطلاح ہے۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ اُفتاد (ضرب کلیم)

یعنی پُردم وہ شخص ہے جس نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا ہو ؛ سینۂ پُردم کنایہ ہے، مردِ مومن کی شخصیت سے اور غم کنایہ ہے دُنیاوی خواہشات آرزوؤں اور تمناؤں سے جن کے عدمِ حصول کا لازمی نتیجہ "غم" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد انسان مجموعۂ غم بن جاتا ہے۔ اقبال کی رائے میں اس غم کے ازالہ کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کی معرفت حاصل کر لے ؛

نوٹ:۔ راقم الحروف نے ایک صوفی سے یہ نکتہ سُنا تھا کہ دُنیا کی نوعیت

یہ ہے کہ تم جس قدر اس کی آرزو کرو گے اسی قدر تمہارے قدموں میں آئے گی۔ میں نے خود تو اس کا تجربہ نہیں کیا لیکن جب بزرگانِ دین کی زندگیوں کا مطالعہ کیا تو اس قول کی صداقت بالکل عیاں ہوگئی۔ مثلاً میں ہر وقت "جاگیر" کی آرزو میں رہتا ہوں۔ اس لئے کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آتی لیکن حضرت قطب صاحبؒ اس سے سخت متنفر تھے۔ اس لئے یہ "قحبہ" ہر وقت اُن کے سامنے دست بستہ کھڑی رہتی تھی۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار! ؛

پہلی رباعی بر ص۱۶۳

مطلب:۔ ہم اپنی حماقت کی بنا پر پہلے غمِ روزگار خریدتے ہیں پھر اس ایک غم سے بہت سے غم پیدا ہوتے ہیں اور ان غموم کی وجہ سے ہماری زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔ ان ہموم و غموم کے ازالہ کے لئے ہم دُنیا کے قاعدہ کے مطابق اُن لوگوں سے طالبِ امداد ہوتے ہیں جو ہماری طرح اور ہم سے بھی زیادہ گرفتارِ بلا ہوتے ہیں اور انہیں ہم سے کوئی حقیقی ہمدردی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ہم اپنی زندگی کی قدر قیمت کا صحیح احساس پیدا کرلیں تو ہم اپنی آئندہ زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں ؛

بنیادی تصور:۔ اگر انسان اپنے موجودہ وقت کی قدر کرنا سیکھ جائے تو وہ آئندہ زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے ؛

دوسری رباعی بر ص۱۶۳

حل لغات:۔ کہ دل با خویشتن بست۔ یعنی جس نے اپنی خودی کو مستحکم کرلیا ؛ ایمن از شکست۔ یعنی وہ شخص دُنیا میں کسی دشمن سے خواہ وہ بڑا

ہو یا چھوٹا، خوف نہیں کھا سکتا؛ شست کے لغوی معنی ہیں حلقۂ دام اُسی مناسبت سے مچھلی کے کانٹے کو شست کہنے لگے۔ پھر نشانہ باندھنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا؛ نگہ را جلوۂ مستی الخ یعنی دُنیا کے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل اور ہاتھ کو غلطی (گناہ) سے محفوظ رکھے؛

بنیادی تصور:۔ چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی بُرائی کا خیال دل میں نہ لاؤ اور کسی کو ایذا مت پہنچاؤ؛

پہلی رباعی پر[۱۶۴]

حل لغات:۔ خاکِ نژند۔ لغوی معنی ہیں ذلیل و خوار مٹی، مراد ہے دُنیا؛ غمِ شیریں۔ وُہ غم جو تکلیف دِہ ہونے کے باوجود انسان کی نظر میں محبوب ہو؛

مطلب:۔ اس رباعی میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ غم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک غمِ تلخ، جس کی اصل، یہ ذلیل دُنیا ہے، یعنی اس کے حصول کی آرزو سے جو غم لاحق ہوتا ہے وہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوسرا غمِ شیریں، جس کی بنیاد، افکار بلند ہوتے ہیں۔ مثلاً قوم کی ترقی کی آرزو۔ اس آرزو سے جو غم لاحق ہوتا ہے تکلیف دہ تو وہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن وُہ تکلیف انسان کو بہت مرغوب ہوتی ہے۔ اور عقلمند آدمی وُہ ہے جو غمِ تلخ کے بجائے غمِ شیریں اختیار کرے؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان غمِ شیریں میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی بسر کرے اور خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دُنیا میں غم کی دو قسمیں ہیں (۱) غم نان (۲) غمِ ملت، دانشمند وہ ہے جو غمِ ملت میں اپنی زندگی بسر کرے؛

دوسری رباعی بر ۱۶۴

حل لغات:۔ خدائے راچنیں کرد۔ یعنی تقدیر کی شکایت مت کرو۔ کہ شستن می تواں از دامنش گرد۔ دامنش میں "ش" کا مرجع "خدا" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا پر اعتراض مت کرو۔ کیونکہ یہ اعتراض جو تم اس پر اپنی نادانی کی وجہ سے عائد کر رہے ہو، بآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔ از دامن گرد شستن محاورہ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں الزام دُور کرنا ۔ قمارے می برد الخ بزدل آدمی بہادر آدمی پر غالب آجاتا ہے۔ قمار بردن محاورہ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں بازی جیت لینا یا دوسرے کو شکست دینا۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ تقدیر کی شکایت مت کرو۔ کیونکہ تقدیر بدل سکتی ہے۔ یعنی اگر تم اپنے آپ کو بدل لو (اپنے اندر انقلاب پیدا کرلو) تو خدا تمہاری تقدیر بھی بدل دیگا۔ خدا پر الزام مت لگاؤ کہ اُس نے تمہیں تباہ کردیا۔ اُس نے تمہیں تباہ نہیں کیا۔ اگر تم غور سے دیکھو تو معلوم ہوجائیگا۔ کہ تمہارے بُرے اعمال نے تمہیں تباہ کیا۔ خدا تو غفور اور رحیم ہے وہ کسی کو تباہ نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے فرض سے غافل ہو۔ تمہارا فرض یہ نہیں کہ خدا کو موردِ الزام بناؤ بلکہ اُٹھو اور اگر ہمت ہے تو اس ظالمانہ نظام کو بدل دو۔ جس میں ایک ذلیل نامرد، اپنی عیاری، خوشامد، رشوت، اور ضمیر فروشی کی بدولت ایک شریف آدمی پر غالب آجاتا ہے اور یہی اس بے نظیر رباعی کا بنیادی تصور ہے۔

پہلی رباعی بر ۱۶۵

مطلب:۔ اے انسان! کینہ، بغض اور حسد کو اپنے دل سے نکال دے،

غور کرا ہر شخص اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ دھواں اس کے گھر سے باہر نکل جائے۔ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کا گھر دھوئیں سے اَٹ جائے، یہ کینہ دراصل دھواں ہے۔ اگر تو اس کو اپنے اندر رہنے دیگا تو تیرا سینہ بالکل سیاہ ہو جائے گا۔

دوسروں کے خلاف اپنے دل میں کینہ رکھنے کے بجائے تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کر اور کسی غیر کو اپنے دل پر حکومت مت کرنے دے، کیونکہ اگر تو ایسا کریگا تو تیرا دل بالکل تباہ اور برباد ہو جائے گا۔ یعنی تیری زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا:

بنیادی تصور یہ ہے کہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے خیال کو جگہ مت دے۔ جب اللہ تیرا مقصود زندگی ہو جائیگا۔ تو نہ کسی کا تصور دل میں آئیگا اور نہ کسی کے خلاف تیرے دل میں کینہ پیدا ہو سکیگا۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اس رباعی میں جو بلند اخلاقی تعلیم دی ہے اگر انسان اس پر عمل کرے تو یہ دنیا اس کے حق میں جنت کا نمونہ بن جائے:

دوسری رباعی پر ۱۶۵ ص

مطلب:۔ مردِ مومن کی صفت بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی پاکیزگی طبع کی بدولت بُرائی کو نیکی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ اپنی جدوجہد کی بدولت خار کو گُل بنا سکتا ہے۔ شب کی تاریکی کو سحر کے نور میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اور اس کی شخصیت، دونوں جہان کے لئے سرمایۂ افتخار ہوتی ہے۔ وہ اُس ستارہ کی مانند ہوتا ہے جو سارے عالم کو منور کر دے۔ اُس کی توصیف کے لئے ایک دفتر درکار ہے میں اس رباعی میں اس کی تفصیل کیونکر بیان کر سکتا ہوں؟ اس کی سب سے

بڑی شناخت یہ ہے کہ جب اس کی موت کا وقت آتا ہے تو وہ عام آدمیوں کی طرح مطلق ہراساں یا مضطرب نہیں ہوتا بلکہ اس وقت اس کے لبوں پر تبسم نمودار ہو جاتا ہے ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ مردِ حق چونکہ اپنی ساری عمر حق پرستی میں بسر کرتا ہے اس لئے جب دنیا سے رخصت کا وقت آتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، کہ اب عنقریب مجھے بارگاہِ ایزدی سے حق پرستی کا صلہ ملنے والا ہے، اس کے برعکس دنیا پرست خوفزدہ ہو جاتا ہے ۱۲

پہلی رباعی پر ۱۶۶

مطلب:۔ بادِ صبحدم سے ذاتِ شاعر مراد ہے ؛ شبنم سے اسلام مراد ہے ؛ صحبتِ گل سے امراء کی زندگی مراد ہے ؛ گیاہ سے غریبوں کا طبقہ مراد ہے ؛ مطلب یہ ہے کہ اسلام نے مجھ سے کہا کہ اے اقبال! مجھے تجھ سے مہربانی کی توقع ہے۔ چونکہ دولتمندوں کی طرزِ زندگی مجھے پسند نہیں ہے، ان کی صحبت میں رہ کر میں بالکل افسردہ ہو گیا۔ یعنی انہوں نے اپنے غیر اسلامی طرزِ عمل سے میری شکل مسخ کر دی اور مجھے دنیا میں بدنام کر دیا۔ اس لئے اب تو مجھے غریبوں میں پہنچا دے تو یہ تیرا مجھ پر بڑا احسان ہوگا ؛

بنیادی تصور:۔ اقبال نے اس تصور کو اپنی ہر تصنیف میں پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ :۔

امراء نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے (بانگِ درا)

منعماں از بخیل و عیش دوست غافل از مغز اند و اندر بند پوست
قوت فرماں روا معبود او در زیان دین و ایماں سود او

اسی لئے جناب مسیح نے یہ فرمایا کہ "اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گذر جانا آسان ہے، لیکن دولتمندوں کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا دشوار ہے"

دوسری رباعی بر ص ۱۶۶

مطلب:۔ دل کی دُنیا اس قدر وسیع اور عریض ہے کہ انسان اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ گویا وہ ایسا سمندر ہے جس کی نہ تھاہ ہے نہ حد ہے اور اس کی موجوں کی عظمت سے بڑے بڑے نہنگ خوفزدہ ہیں یعنی بڑے بڑے علماء اور حکماء تاثراتِ قلبی کا انداز مُعیّن کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ بعض اوقات، دانا آدمی دل کے ہاتھوں نادان بن جاتا ہے۔ اور یہی دل بعض اوقات بدکاروں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے انہیں نکوکاروں کی جماعت میں داخل کر دیتا ہے۔ دل کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ایک ایسے سیلاب کا تصوّر کرو، جو بہت سے یا سینکڑوں عظیم الشان صحراؤں کو محیط ہو جائے تو آسمان اُس سیلاب کے ایک بلبلہ کی برابر بھی نہیں ہے۔

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ دل کی دُنیا اس قدر وسیع ہے کہ یہ خارجی دنیا اس کے سامنے اتنی حقیقت بھی نہیں رکھتی جس قدر سیلاب کے سامنے بلبلہ کی ہوتی ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ یہ ساری کائنات دل کے ایک گوشہ میں سما سکتی ہے اور دل میں ایسے ایسے لاکھوں گوشے موجود ہیں۔

اقبال نے ص ۱۶۶ سے لیکر ص ۱۷۱ تک جو رباعیات لکھی ہیں ان میں "دل" کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ دل سے جیسا کہ میں قبل ازیں لکھ چکا ہوں،

وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں ہے جو انسان اور حیوان دونوں کے سینہ میں دھڑکتا رہتا ہے۔ بلکہ وہ لطیفۂ روحانی مراد ہے جس میں اللہ میاں رہتے ہیں۔ ساری دُنیا کے صوفی یہی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں کہ دل خانۂ خدا ہے تمام مذہبی کتابیں یہی تلقین کرتی ہیں کہ خدا تمہارے دل میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا دل کوئی مادی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ایک مخفی روحانی قوت ہے جس کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے کا نتیجہ (ثمرہ) یہ نکلتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیتا ہے یہ دیکھنا ہی مقصودِ حیات ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہی دین کی غایت ہے۔ یہی اقبال کا فلسفہ ہے، یہی استحکام خودی کا مفہوم ہے۔ اور یہی زندگی کا کمال ہے: چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

برمقام خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
آدمی دید است باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است
گفت، دین عارفاں؟ گفتم کہ دید گفت، دین عامیاں؟ گفتم شنید
چناں با ذات حق خلوت گزینی ترا او بیند و اورا تو بینی

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش رستن از بند جہات است

نوٹ:۔ میرا خیال ہے کہ ان چند اشعار سے ناظرین کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ اقبال کے سارے فلسفہ کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اپنے دل کو اس لائق بناؤ کہ اللہ تعالیٰ اُس میں نزول اجلال فرما سکے: تاکہ تم اُسے دیکھ سکو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ قوم کے ڈاکٹر، ڈائریکٹر، کمانڈر، عہدہ دار، بڑے بڑے یگانۂ روزگار، دن رات کلام اقبال کا "پوسٹ مارٹم" کرتے رہتے ہیں۔ اقبال اکاڈمی قائم کرتے ہیں، ریسرچ کراتے ہیں، مضمون لکھاتے ہیں، یوم اقبال

"منائے" ہیں، دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں مختصر یہ کہ سبھی کچھ کرتے ہیں لیکن "دیدار" کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے باجہ بھی ہو، آتش بازی بھی ہو، ہاتھی گھوڑے بھی ہوں، موٹریں بھی ہوں، رقص و سرود کا سامان بھی ہو۔ غرضکہ سب کچھ ہو لیکن "دولہا" نہ ہو:

پہلی رباعی پر[۱۶۷]

حل لغات: - دلِ ما آتش الخ شاعر نے دل کو آگ سے اور جسم کو اُس آگ کے دھوئیں سے تشبیہہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل یا روح، اصل ہے اور جسم یا تن اس کی فرع ہے یعنی جسم کا وجود، دل پر منحصر ہے، بلکہ یہ جسم دل ہی کا خارجی مظہر ہے، جس طرح دھواں، آگ کا مظہر ہوتا ہے۔

اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ مادہ کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ روح ہی کی شکل کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ ضربِ کلیم میں لکھتے ہیں:-

ارتباطِ حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی پیراہن سے ہے

تپیدن دمبدم ساز الخ یعنی اگر اضطرابِ مسلسل کی کیفیت زائل ہو جائے تو دل فنا ہو جائے گا۔ یہ تپیدن دمبدم ہی گویا دل کی زندگی کا باعث ہے۔ اضطراب یا تپید سے مراد ہے وہ جدوجہد جو عاشق اپنے معشوق کو حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے یا اُس سے ملنے کی آرزو جو ہر وقت عاشق کو مضطرب رکھتی ہے؛ اقبال کی رائے میں یہی تپیدن دمبدم عاشق کی زندگی کا راز ہے؛ بذکر نیم شب الخ ہاں آدھی رات گذر جانے کے بعد جب عاشق اس کی یاد میں محو ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اُسے جمعیت حاصل ہو جاتی ہے؛ جمعیت: تصوف کی اصطلاح ہے

یعنی دل کا ایک حالت پر قائم ہو جانا :۔ واضح ہو کہ "من" بہت چنچل ہے اس لئے بڑی مشکل سے قابو میں آتا ہے :: جو سیمابے کہ پندد چوب عود شش ،عود شش میں "شش" کا مرجع "سیماب" ہے یعنی ذکر نیم شبی ، دل کو تھوڑی دیر کیلئے اسی طرح ساکن یا قائم کر دیتا ہے جس طرح چوبِ عود ، سیماب کو تھوڑی دیر کے لئے قائم کر دیتی ہے۔ سیماب بستن (تھوسوں) کی اصطلاح میں چوب عود کے ذریعہ سے سیماب کو قائم کر دینے کا نام ہے۔ چوبِ عود کو ہندی میں کھنگری بوٹی کہتے ہیں جو ہمالیہ کی ترائی میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے عارضی طور پر پارہ "قائم النار" ہو جاتا ہے :: سیماب بستن یعنی قائم النار کردن۔ تاکہ اُڑ نہ جائے ::

مطلب تو شاید واضح ہو گیا ہو گا۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ ::

(۱) تپید دم بدم ہی پر عاشق کی زندگی کا انحصار ہے۔ اگر تپش زائل ہو جائے تو لامحالہ عشق ختم ہو جائے گا اور جب یہ ہو گا تو عاشق بھی فنا ہو جائے گا ::

(۲) لیکن تپید پیہم یا اضطرابِ مسلسل کیلئے توانائی (Energy انرجی) بھی تو ضروری ہے۔ یہ طاقت "جمعیت خاطر" سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ نعمت ، ذکر سے مل سکتی ہے۔ جب عاشق پچھلے پہر ، انتہائی ذوق و شوق کے عالم میں اُسے یاد کرتا ہے یعنی اس کے "دھیان" میں محو ہو جاتا ہے تو وہ تھوڑی کے لئے "درشن" دیتا ہے۔ اس دیدار سے سالک میں دوسرے دن تڑپنے کی توانائی پیدا ہو جاتی ہے ::

نوٹ :۔ اس جھلک دکھانے کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر مشرق ، ابتدائی مراحل میں بے محابا سامنے آ جائے تو عاشق ، دیدار کی تاب نہیں لا سکتا۔ لیکن جب خودی پختہ ہو جاتی ہے تو پھر آمنے سامنے بیٹھ کر راز و نیاز ہو سکتا ہے :: ؎

مدہوشی زہوش رفت بیک جلوۂ صفات　　　تو عین ذات می نگری ، در تبسمی

دوسری رباعی بر صہ ۱۶۷

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ چونکہ "مردِ خود نگہدار" عارف یا درویش ہوتا ہے یعنی علائق دنیوی سے پاک اور ساز و سامانِ دنیوی سے بے نیاز، اس لئے زمانہ خود اس کے پروگرام کی تکمیل کا انتظام کرتا ہے۔ یعنی درویش اہل زمانہ کو حکم دیتا ہے کہ فلاں کام کو انجام دو، وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اسی حالت کا نام تصوف کی اصطلاح میں "فقر" ہے اور اسی کو دنیا والے سلطانی کہتے ہیں۔ لیکن یہ حالت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تو اپنے دل کی اسی طرح نگہبانی کرے جس طرح دریا اپنے موتی کی نگہبانی کرتا ہے۔ یعنی تو بھی اپنی خودی کی پرورش کر۔ یہاں دل سے خودی مراد ہے:

بنیادی تصور یہ ہے کہ فقر اور سلطانی ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور اس حقیقت کا حصول، خودی کی تربیت (نگہداشت) پر موقوف ہے:

پہلی رباعی بر صہ ۱۶۸

مطلب:۔ اگر انسان کے اندر محبت کا جذبہ نہ ہوتا (یہاں دل سے عشق مراد ہے) تو انسان، نہ خودی کی طاقت سے آگاہ ہو سکتا تھا، نہ فطرت کی غلامی سے آزاد ہو سکتا تھا اور نہ عقل کی گرفت سے رہا ہو سکتا تھا:

بنیادی تصور یہ ہے کہ دل، انسان کو عقل کی غلامی سے آزاد کر سکتا ہے بلکہ عقل خود عاشق کی غلام بن جاتی ہے:

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

دوسری رباعی بر صـ ۱۶۸

مطلب:۔ تو غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ "دل" بھی دیگر مخلوقات کی طرح کوئی مادی شئی ہے۔ "گو فنائے طلسمِ کاف و نون" سے اشارہ ہے اس طرف کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو نیست سے ہست کرنا چاہتا ہے تو "کُن" (کاف اور نون) کہہ دیتا ہے یعنی ہو جا۔ پس وہ شئی فوراً موجود ہو جاتی ہے۔

اقبالؔ صاف لفظوں میں اعلان کر رہے ہیں کہ دل (خودی) نہ مادی شئی ہے اور نہ مخلوق ہے۔ کیونکہ وہ عالمِ خلق سے نہیں ہے بلکہ عالمِ امر سے ہے۔ چنانچہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ہُ اس پر شاہدِ عادل ہے "کہہ دے کہ روح تو میرے رب کے امر سے ہے"۔ آدمؑ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی روح تو پھونکی تھی جیسا کہ "وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ" (حق تعالیٰ دمید در روئے (آدمؑ) روحِ خود را (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ) سے صاف عیاں ہے: دل ما گرچہ اندر الخ۔ یہ سچ ہے کہ یہ روح (دل) ہمارے سینہ کے اندر ہے (اسی لئے صوفیاء اِسے "انائے مقیّد" کہتے ہیں) لیکن نہ تو یہ اس عالمِ مادی سے تعلق رکھتی ہے اور نہ اِس عالم کی ہے اور نہ اِس عالم میں ہے۔ یہ ہماری گرفت اور رسائی، ہمارے حواس اور ادراک سب سے بالاتر اور بیروں تر ہے:

بنیادی تصور:۔ اقبالؔ، انائے مقید (نفسِ ناطقہ یا روح یا خودی یا دل یا آتما) کا بھید ہم پر آشکارا کر رہے ہیں کہ یہ جوہر، یہ نقطۂ نوری، یہ الغوب جسے عرفِ عام میں دل کہتے ہیں، جو خاطرِ غدا ہے، یہ نہ مادی ہے، نہ مخلوق ہے اور نہ اس کائنات کے قوانین کا پابند ہے۔ اگر اس کی حقیقت سے کچھ آگاہ ہونا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ تو دوسرا ہے، لیکن اس بات سے کچھ اندازہ ہو سکیگا کہ یہ "آتما"

یہ انائے مقید یوں کہنے کو تو جسم کے اندر ہے لیکن دراصل اور بلحاظِ اصل، جسم کی تو حقیقت ہی کیا ہے، اس دنیا کے اندر بھی نہیں ہے۔

اقبالؔ نے یہ مصرع نہیں کہا ہے "ولیکن از جہانِ ما بردن است" ذاتِ مطلق کا راز فاش کر دیا ہے کہ یہ تو درحقیقت وہی معشوق ہے جو تعینات کے پردوں میں پوشیدہ ہوگیا ہے۔ اور وہی "انائے مطلق" ہے۔ جس نے انسان میں "انائے مقید" کا لباس زیبِ تن کر لیا ہے:۔

پردہ کو تعین کے درِ دل سے ہٹا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا (دردؔ)

پہلی رباعی بر صہ ۱۶۹

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ دراصل یہ ساری کائنات، دل کی پرستار، اسکے سامنے دست بستہ حاضر ہے۔ صاحبِ دل کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔ کیا کوئی شخص حضرات خواجہ غریب نواز اجمیریؒ، گنج شکر اجودھنیؒ، محبوب الٰہی دہلویؒ، قطب جمالی ہانسویؒ، مخدوم صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی فرمانروائی سے انکار کرسکتا ہے؟ دنیاوی بادشاہوں کی بادشاہی تو اُن کی وفات کے ساتھ ختم ہوگئی۔ لیکن ان بادشاہوں کی بادشاہی تو آج بھی بدستور قائم ہے۔ آج بھی اُن بادشاہوں کا آستانہ عاشقوں کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا ہے، اور آج بھی ان بادشاہوں کا فیض جاری ہے ؛ کشادِ ہر گرہ از زاری الخ یعنی دل میں یہ قوت ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہو جائے تو ہر مشکل حل ہو جاتی ہے ؛ پیامے دہ زمین ہندوستاں را الخ یعنی اے مخاطب! ہندوستان کے باشندوں کو میری طرف سے یہ مژدہ سُنادے کہ اگر وہ انگریزوں

کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں تو اپنے دل کو بیدار کرلیں:

بنیادی تصور:۔ اقبال ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، کہ جب تک دل بیدار نہ ہو، آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔چنانچہ دیکھ لو، یوں کہنے کو تو ہم، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو "آزاد" ہوگئے۔ لیکن دراصل بدستور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں:

دوسری رباعی نمبر ۱۶۹

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ افراد کو اگر کشتِ یزداں قرار دیا جائے تو "دل" اس کا حاصل ہے؛ اور زندگی کو اگر عروس قرار دیا جائے تو دل اس کے لئے بمنزلہ محمل ہے۔ کشتِ یزداں سے خدا کا فعل تخلیق مراد ہے۔ یعنی خدا نے یہ کائنات اس مقصد سے پیدا کی ہے یا تخلیق کائنات کی غایت یہ ہے کہ بنی آدم اپنے دل کی تربیت کر کے اُسے مرتبۂ کمال تک پہنچائیں، تاکہ زندگی کی دلہن اس میں قیام پذیر ہوسکے، یعنی حقیقی زندگی کا حصول، دل کی صحیح تربیت پر موقوف ہے، جو شخص اپنے دل کی تربیت نہیں کرتا وہ حقیقی زندگی سے محروم رہیگا: غبار راہ شد الخ یعنی جو شخص دانائے اسرار ہے وہ اپنے آپ کو خدا کی طلب میں فنا کردیتا ہے۔ یعنی اگر انسان اپنے دل کو خدا کی آرزو میں فنا کردے تو وُہ کامیاب ہوجائیگا۔ دانائے اسرار سے وُہ شخص مراد ہے جو حقیقت سے آگاہ ہوگیا ہو، جس پر راز کائنات منکشف ہوگیا ہو۔ لیکن یہ خیال مت کیجو کہ یہ مقام، عقل کی بدولت حاصل ہوسکتا ہے، ہرگز نہیں۔ صرف دل ہی وُہ جوہر ہے جو اسرارِ کائنات سے آگاہ ہوسکتا ہے:

بنیادی تصور یہ ہے کہ صاحبِ دل اپنی ہستی کو خدا کی محبت میں فنا کر کے حیاتِ جاوید حاصل کرلیتا ہے اور صاحبِ عقل اس نعمت سے محروم رہ جاتا ہے:

پہلی رباعی بر صنہ۱۷

حل لغات:۔ جوئندہ۔ اس کا فاعل دل ہے، جو یہاں محذوف ہے اور دل سے اس جگہ صاحبِ دل یا عاشق مراد ہے۔ حُسنِ غریبے سے معشوقِ حقیقی مراد ہے یعنی حق تعالیٰ۔ خیل بمعنی لشکر یا فوج۔ بے نصیبے یعنی اپنی دولت سے خود کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔

مطلب:۔ اس رباعی میں اقبال نے عاشق کی زندگی کے دو مشہور پہلو واضح کئے ہیں۔ یعنی کبھی تو یہ دل، حُسنِ مطلق (حق تعالیٰ) کی تلاش میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور جب اُسے اپنے اندر پا لیتا ہے تو منبر پر چڑھ کر اس حقیقت کا اعلان کر دیتا ہے۔ لیکن اس اعلان کی پاداش میں دُنیا والے اُسے مصلوب کر دیتے ہیں اور کبھی یہ دل، اُس کی محبت میں سربکف ہو کر، میدانِ جہاد میں آجاتا ہے اور باطل کو شکست دیتا ہے لیکن اس کامیابی سے خود کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔

بنیادی تصوّر:۔ عاشقِ صادق جو کچھ کرتا ہے، معشوق کی خوشنودی کیلئے کرتا ہے، ذاتی فائدہ مدنظر نہیں رکھتا۔ اس رباعی کے پہلے شعر میں حسین ابنِ منصور حلاج کی طرف اشارہ ہے، جنہوں نے صلیب کو منبر بنا کر عاشقی کی دُنیا میں مختصر ترین لیکن مشہور ترین خطبہ دیا جو صرف دو لفظوں پر مشتمل تھا اور قیامت تک یاد رہے گا۔

دوسرے شعر میں سلطانِ عادل، بطلِ اسلام مجاہدِ ملّت نورالدین زنگی کی طرف اشارہ ہے۔ جو ۵۴۱ھ سے ۵۶۹ھ تک یعنی تادمِ وفات، جہاد میں مشغول رہا۔ اُس نے بلا مبالغہ سینکڑوں معرکے سر کئے، اور ہر میدان سے مظفر و منصور واپس آیا۔ لیکن ان تمام فتوحات سے اُس نے اپنے لئے اُس خاک کے علاوہ اور کوئی چیز حاصل

نہیں کی، جو جہاد فی سبیل اللہ کے وقت، اُس کے مبارک چہرہ پر جم جاتی تھی، چنانچہ میدان جنگ سے واپس آکر وہ اس خاک کو ایک رومال میں جمع کر لیتا تھا اور مرتے وقت اُس نے یہ وصیت کی تھی کہ جب مجھے قبر میں اُتارا جائے اور کفن سرکایا جائے تو یہ خاک میرے چہرے پر مل دی جائے:

نوٹ:- کاش! میری زندگی میں بھی کوئی نورالدین پیدا ہو جاتا تو میں بھی اُس کے گھوڑے کی رکاب تھام کر اپنے لئے سرمایۂ سعادت بہم پہنچا لیتا۔ آج سبھی کچھ موجود ہے، نہیں ہے تو ذکرِ جہاد ۱۲:

دوسری رباعی ص۱۷۱

مطلب:- یہ رباعی اقبال نے وحدۃ الوجود کے رنگ میں لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ دل کی دُنیا، اُس مادی دُنیا سے بالکل مختلف ہے۔ اُس میں نہ رنگ و بو ہے، نہ پستی و بلندی ہے نہ کاخ و کو ہے، نہ زمین و آسمان ہے نہ چارسو ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس عالم میں "اللہ ھُو" کے سوا اور کچھ نہیں ہے:

بنیادی تصور:- یہ ہے کہ جب سالک کے دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ لَا مَوجُودَ اِلَّا اللّٰه۔ یعنی اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے:

پہلی رباعی ص۱۷۱

مطلب:- انسان، حواس خمسہ سے مادی اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے بعد عقل ان مشاہدات کو اپنے وضع کردہ پیمانہ سے ناپنا چاہتی ہے لیکن وہ بھی ناقص ہے اور اس کے پیمانے بھی ناقص ہیں۔ اس لئے ساری عمر پیمائش

ہی میں بسر ہو جاتی ہے، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یعنی صحیح اور یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

عقل کے مقابلہ میں دل کی صفت یہ ہے کہ وہ نہ حواس خمسہ کا محتاج ہے نہ آلات و وسائل (استنباط و استخراج و استدلال وغیرہ) کا دستِ نگر ہے، بلکہ وہ ایک نگاہ سے اس ساری کائنات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے:

بنیادی تصور یہ ہے کہ صاحبِ عقل تو اس کائنات کی وسعت میں گم ہو جاتا ہے، لیکن صاحبِ دل کی کیفیت بالکل جداگانہ ہے۔ یہ ساری کائنات اس کے دل کی وسعت میں گم ہو جاتی ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:-

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

دوسری رباعی بر ۱۷۱

مطلب:- اے مخاطب! محبت (جس کا مرکز دل ہے) کوئی مادی شئے نہیں ہے۔ بلکہ معشوق کی نگاہ کی تاثیر کا دوسرا نام ہے۔ اگر مزید وضاحت درکار ہو تو یوں سمجھو کہ محبت نگاہِ معشوق کا ایک تیر ہے جو دل کو زخمی کر دیتا ہے لیکن یہ زخم ایسا ہے کہ اسمیں لذت پنہاں ہوتی ہے۔

پس اگر تو کسی کے دل کو زخمی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اگر کسی کو اپنا دیوانہ بنانا چاہتا ہے، تو ترکش پھینک دے کیونکہ "دل" ترکش کے تیر سے زخمی نہیں ہو سکتا، اس کے لئے نگاہ کا تیر درکار ہے۔ یہ نگاہ صحبتِ مرشد سے پیدا ہو سکتی ہے اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے:

پہلی رباعی نمبر ۱۷۲

تمہید :- یہ ارمغان حجاز کی مشکل ترین رباعیوں میں سے ہے۔ اس میں نہ کوئی لفظ مشکل ہے نہ کوئی ترکیب مشکل ہے اس کے باوجود اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ ہر مصرع میں فلسفۂ تصوف کے ایک مغلق مسئلہ کو نظم کیا گیا ہے، اور انداز بیان بہت بلیغ ہے۔ پہلے مصرع میں خودی کی حقیقت واضح کی ہے۔

دوسرے مصرع میں اس کی رسائی کی ماہیت بیان کی ہے۔

تیسرے مصرع میں اس کی جدائی کی کیفیت درج کی ہے۔

چوتھے مصرع میں اس کے وصال کی نوعیت ظاہر کی ہے۔

ذیل میں ہر مصرع کا مطلب جداگانہ پیش کرتا ہوں :-

مطلب :- خودی روشن ز نور کبریائی الخ یعنی خودی کوئی مادی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا چراغ خدا ہی کے نور سے روشن ہوا ہے۔ اقبال نے خودی کو "روشن" کہکر یہ ثابت کیا ہے کہ خودی بھی نور ہے اور یہی اس کی ماہیت ہے، لیکن یہ نور اپنے وجود میں، خدا کا محتاج ہے۔ خدا نہ ہوتا، تو خودی بھی نہ ہوتی۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ خدا، نور مطلق ہے، خودی نور مقید ہے خدا کا نور اصلی ہے۔ خودی کا نور یا خودی، خدا کا ظل ہے۔ اقبال نے خودی کو ہر جگہ نور ہی سے تعبیر کیا ہے، مثلاً

درون سینۂ آدم چہ نور است
چہ نور است اینکہ غیب او حضور است

رسائی ہائے او از نارسائی الخ یعنی خودی کی بقاء کا راز یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے

محبوب کی ذات کا ادراکِ کامل حاصل نہ کر سکے۔ یہ نکتہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اس قول سے ماخوذ ہے "اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ"۔ یعنی خودی کے ادراک کا کمال یہ ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرے کہ میں ذاتِ باری کی کنہ کا ادراک کرنے سے عاجز ہوں۔ یعنی اس کی رسائی کی معراج یہی ہے کہ وہ کبھی اُس ذات تک رسائی حاصل نہ کر سکے، اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

تو نہ شناسی ہنوز، شوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

حیاتِ ابدی یہ ہے کہ خودی ہمیشہ رسائی حاصل کرتی رہے لیکن کبھی رسائی حاصل نہ ہو سکے، یہی ہیگل کی تصوریت کا خلاصہ ہے: جدائی از مقاماتِ وصالش۔ وصل بمعنی قطرہ کا سمندر میں مل جانا، خودی کے حق میں وصل نہیں ہے (یہ تو موت ہے) بلکہ جدائی ہی اس کے حق میں وصل ہے۔ یہ خیال، شیخ اکبرؒ کے اس مقولہ سے ماخوذ ہے:۔ وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ۔ خواہ عبد کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے کبھی رب نہیں ہو سکتا اور رب خواہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ کرے، عبد نہیں ہو سکتا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ۔

اگر وصل ہو جائے تو خالق اور مخلوق یا عبد اور معبود دونوں ایک سا ہو جائیں گے۔ اگر ہجر ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جائیں گے۔ اور ابن عربیؒ کے فلسفہ کی رو سے یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں، اس لیے یہی ایک صورت ممکن ہے کہ ہجر میں وصل کا رنگ قائم رہے۔ اور وصل میں ہجر کا۔ اگر قطرہ سمندر میں مل جائے تو قطرہ کا وجود کہاں باقی رہیگا؟ اسی لئے اقبال نے یہ کہا ہے:۔

بہ بحرش گم شدن انجام مانیست | اگر اورا تو در گیری فنا نیست

وصالش از مقامات جدائی الخ یعنی جس طرح جدائی، وصل کی ایک خاص صورت کا نام ہے۔ اسی طرح وصل بھی، جدائی ہی کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ یعنی خودی، خدا سے جدا رہ کر اُسے اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتی ہے (لیکن کبھی جذب نہ کر سکے) بس یہ کوشش ہی اُس کے حق میں وصل کا حکم رکھتی ہے۔ دگو ہیچ

خودی چوں پختہ گردد لازوال است
فراق عاشقاں عین وصال است

بنیادی تصور یہ ہے کہ خودی، خدا کے نور سے ہے اور اس کی غایت تخلیق یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہے لیکن کبھی کامیاب نہ ہو سکے اور اسی کوشش میں اس کا وصل مضمر ہے۔ ہجر میں وصل کا رنگ پیدا ہو اور وصل میں ہجر کی لذت محسوس ہو۔ اگر وصل ہو جائیگا تو قصہ ہی ختم ہو جائیگا۔

دوسری رباعی برصفحہ ۱۷۱

مطلب: جب ایک قوم گفتگو کی منزل سے آگے بڑھتی ہے یعنی جب وہ کافی قیل و قال کے بعد اپنے لئے ایک نصب العین قرار دے لیتی ہے تو اس کے افراد کے قلوب میں اُس کے حصول کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ یہ آرزو، خودی کی روح رواں ہے، اس کے حق میں اکسیر ہے، بس یوں سمجھو کہ آرزو (تڑپ) خودی کو شمشیر بنا دیتی ہے۔ اس کی دھار (دم) اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ وہ ہر شئی کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ یعنی جب خودی عشق (آرزو) سے مستحکم ہو جاتی ہے تو وہ اس عالم رنگ و بُو کو مسخر کر لیتی ہے اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے۔

پہلی رباعی بر صد۱۷۲

مطلب:۔خودی کو وجود حق تعالیٰ سے وجود حاصل ہوا ہے۔یعنی خودی کا وجود، ذاتی یا مستقبل بالذات نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود کے لئے خدا کی محتاج ہے۔یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں حق تعالیٰ، واجب الوجود ہے اور خودی ممکن الوجود ہے۔اور خودی کو خدا ہی کی بدولت نمود حاصل ہوا ہے۔یعنی اگر وہ کائنات میں ظاہر ہوتی ہے، تو محض حق تعالیٰ کے ظاہر کرنے سے۔ورنہ بذات خود اس میں کوئی قدرت نہیں ہے یہ مصرع اس آیت کی تفسیر ہے **لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه**۔
بلا شبہ اگر خدا نہ ہوتا تو خودی بھی نہ ہوتی اور یہی اس رباعی کا بنیادی تصور ہے:

دوسری رباعی بر صد۱۷۳

مطلب:۔جب خودی جسم کی قید میں آتی ہے تو سو جاتی ہے یعنی مقاصد اعلیٰ اور حقائق کبریٰ سے غافل ہو جاتی ہے۔کچھ عرصہ کے بعد، جب اُسے ہوش آتا ہے یا جب اُسے شعور ذاتی حاصل ہوتا ہے تو بیدار ہو جاتی ہے۔اگر اس کا شعورِ ذات، مادّیات میں گرفتار ہو جائے یعنی اگر وہ لذات دنیوی کو مقصودِ حیات بنالے تو مر جاتی ہے۔اور اگر اعلیٰ مقاصد کو مطمح نظر بنالے تو زندہ رہتی ہے اور ترقی کرتی ہے:

بنیادی تصور:۔خودی ایک روحانی لطیفہ ہے جسم کے ساتھ وابستہ ہو کر برائے چندے اپنی حقیقت سے غافل ہو جاتی ہے۔لیکن جب بچہ، جوان ہوتا ہے اور "میں" کہنے لگتا ہے تو پھر دو صورتیں ہیں، اگر دُنیا کا عاشق ہو گیا تو خودی مر جاتی ہے اگر دین کا دیوانہ ہو گیا تو زندہ رہتی ہے:

پہلی رباعی بند ۱۷۲

مطلب :- اقبال کے مذہب میں خودی کے واصل باللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے وصال کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں فراق کی شان موجود رہتی ہے، چنانچہ گلشن راز جدید میں وہ اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:-

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی
ترا او بیند و او را تو بینی

یعنی خدا اور خودی دونوں اپنی اپنی جگہ قائم اور موجود رہتے ہیں۔ یعنی اقبال کی رائے میں وصال کا معنیٰ یہ ہے کہ خودی، خدا کے ساتھ خلوت اختیار کرے، بالفاظِ دگر اقبال اُس وصل کے قائل نہیں ہیں جس کی تعلیم شری شنکراچاریہ نے دی ہے۔ گویا وصال کا مطلب ہے۔ دیدارِ ذات یا بالفاظ قرآن حکیم لِقاءِ رب جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهِ الخ یعنی جس کو اپنے رب کے دیدار یا اُس سے ملاقات کی آرزو ہو اُسے لازم ہے کہ عمل صالح بجا لائے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبال اس باب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متبع ہیں، جن کی تعلیم یہ ہے کہ ذی ظل اور ظل دونوں موجود ہیں۔

لیکن یہ عقدہ یعنی یہ بات کہ فراق کے باوجود وصال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے عقل کی مدد سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے "نظر" کی ضرورت ہے اور یہ نظر جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، مرشد کامل کی صحبت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی کوئی شخص اس وصال کی حقیقت لفظوں کے ذریعہ سے کسی غیر واصل کو نہیں سمجھا سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو جس نے اپنی

عمر بیں کبھی ثمرِ بہشت نہیں چکھا، اس آم کے ذائقہ سے آگاہ کرنا چاہے تو الفاظ کی مدد سے اس کے ذہن بیں اس کے ذائقہ کا احساس پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی صورت بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اُسے وہ آم کھلادے۔ پھر وہ بغیر سمجھائے سمجھ جائے گا۔ ع ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

اگرچہ خودی، خدا ہی کی آغوش سے نکلی ہے لیکن خودی، خدا نہیں ہے۔ آبِ گہر کا منبع بلا شبہ آبِ بحر ہی ہے (آبِ بحر کے علاوہ پانی کا اور کہیں تو وجود ہی نہیں ہے) لیکن اس کے باوجود آبِ بحر، آبِ گہر نہیں ہے۔ دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ آبِ بحر، مطلق ہے اور آبِ گہر مقید ہے۔ اسی لئے تصوف کی اصطلاح بیں ان کو انائے مطلق اور انائے مقید کہتے ہیں:

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بابسلہ ہے عین دریا میں مگر نسدیدہ ہے

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۷۲

مطلب: کہتے ہیں کہ میرا وجودِ ظاہری، اُسی کے وجودِ حقیقی کا پرتو ہے۔ اگر اس کا در نہ ہوتا تو میری خاک کہاں سے آتی؟ اور مجھ میں جس قدر صفات ہیں یہ سب اُسی کی صفات کا عکس ہیں۔ نہ میں اپنی حقیقت سے آگاہ ہوں اور نہ اس کی حقیقت کا عارف ہوں۔ یعنی میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور وہ کیا ہے لیکن اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ میں اس میں ہوں کیونکہ نہ اُس کے علاوہ کسی کا وجود ہے اور نہ اُس سے باہر کسی کا وجود ہے:

بنیادی تصور: اس رباعی میں اقبال نے "ہمہ اندر اوست" کی تعلیم دی ہے جسے ہندوستان میں شری رامانوج اچاریہ نے اپنے خاص انداز میں پیش کیا تھا۔

اور میرے روحانی مرشد حضرت خواجہ نصیر الدین الملقب بچراغ دہلیؒ نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے :۔

اے زاہد ظاہر بیں! از قرب چہ مے پرسی
او در من و من در وے چوں بُو بگلاب اندر

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۷۵

مطلب :۔ کہتے ہیں کہ اس بات کا تو تجھے یقین ہے کہ ایک دن ضرور ایسا آئیگا، جب بندوں کے نامہائے اعمال تولے جائیں گے لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ قیامت کا وہ دن نہ مجھے سازگار ہوگا نہ اُسے۔

مجھے تو اس لئے سازگار نہ ہوگا کہ میں اپنے گناہوں کی وجہ سے شرمسار ہونگا۔ اور اسے اس لئے سازگار نہ ہوگا کہ میرا اپنا تو کوئی مستقل وجود ہی نہیں ہے، پس جس کا وجود ہی نہ ہو، اس میں اختیار کی صفت کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جو کچھ میں نے کیا وہ اُسی کے حکم سے کیا۔ فاعل حقیقی تو وہی ہے۔ میں اگر اپنے کو گنہ گار کہتا ہوں تو یہ محض ازراہِ ادب ہے۔

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است (حافظ)

روزِ حساب پیش ہو جب مرا دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر (اقبالؒ)

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۷۵

مطلب :۔ شہر روم میں پوپ نے مجھ سے کہا کہ میں تجھے ایک نکتہ سمجھاتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ ہر قوم (اپنی موت دنیاہی) کا سامان خود ہی مہیا کرتی ہے مثلاً مسلمانوں کو تقدیر نے تباہ کیا اور یورپ کو تدبیر نے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کا باعث تقدیر کا غلط عقیدہ ہے جو ان میں عدمِ تدبیر کی بناء پر رائج ہو گیا۔ یعنی اُنہوں نے اپنے آپ کو مجبور محض یقین کر لیا اور اس لئے اسباب خارجی اور وسائل مادی سے یکسر بے نیاز ہو گئے۔ یورپین اقوام کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو مختارِ مطلق یقین کر لیا اور خدا سے بالکل بیگانہ ہو گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ مجبور محض ہے نہ مختار مطلق ہے بلکہ مجبور بھی ہے اور مختار بھی ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

چنیں فرمودۂ سلطان بدر است
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است

پہلی رباعی برص ۱۷۶

حل لغات:۔ جبہ بے نم چشم آں الخ یعنی جو شخص مٹی سے پیدا ہوتا ہے یعنی مادیات میں گرفتار رہتا ہے، اس کی آنکھ میں نمی نہیں ہوتی، یعنی اس میں غیرت کا جذبہ نہیں ہوتا: چو جانِ او بگیرم الخ جب میں اس کی روح قبض کرتا ہوں تو مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ جس کو تو نے اپنا خلیفہ بنایا تھا، وہ اس قدر بے غیرت اور ذلت آمیز زندگی بسر کرتا رہا اور اُس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ خدا نے مجھے کیا بنایا تھا اور میں کیا بن گیا! : ولے از مردن الخ لیکن اے خدا! افسوس ہے اُس بے غیرت انسان پر کہ اُسے مرتے وقت یا مرنے سے کوئی شرم نہیں آتی:

بنیادی تصوریہ ہے کہ اقبال کے فلسفہ کی رو سے جو شخص اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرتا وہ جب مرتا ہے تو بالکل مرجاتا ہے۔ پھر زندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے کیونکہ یہ ارمغان کی شرح ہے نہ کہ فلسفۂ اقبال کی شرح۔ اس جگہ اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک مرتبہ علامہ مرحوم نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے فرمایا تھا کہ "ہر خودی پر سکرات موت کا عالم طاری ہوتا ہے"۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے لیکن اس کشمکش کے نتیجہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب روح اس جسم خاکی سے اپنا تعلق قطع کرتی ہے تو اُسے زبردست دھچکا (Shock) لگتا ہے اور اس کی حالت کچھ دیر کے لئے ایسی ہو جاتی ہے جیسے کسی شخص کا سر دیوار سے ٹکرا جائے تو وہ کچھ دیر کے لئے بیہوش ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ تصادم بہت شدید ہو تو پھر کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ یعنی مرجاتا ہے۔ اسی طرح جس شخص نے زندگی میں اپنی خودی کو اس یقینی تصادم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار (مستحکم) نہیں کیا۔ وہ شخص مرکر زندہ نہیں ہوگا۔ "مرکر زندہ ہونا" یہ اقبال کی اصطلاح ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص جب مرکر زندہ ہوگا تو اس میں آیندہ زندگی میں ترقی کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوگی اس کی الغو (خودی) میں اور ایک حیوان مطلق کی خودی میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ پس اس کا شمار حیوانات میں ہو جائے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حیاتِ ابدی حاصل کرنے کے لئے ہر شخص کو بطور خود جدوجہد کرنی لازم ہے، مرنے کے بعد حیاتِ ابدی بیشک ملے گی مگر انہی لوگوں کو جنہوں نے اپنے اندر اس کی صلاحیت پیدا کرلی ہوگی۔

دوسری رباعی بر صفحہ ۱۶

مطلب:۔ یہ بہت بلیغ رباعی ہے اور افسوس ہے کہ ہم کماحقہٗ اس کی

تفصیل نہیں کرسکتا۔ عزرائیلؑ (فرشتہ موت) خدا سے کہتا ہے کہ اے خدا! تو اس نادان مخلوق (انسان) پر نگاہ کرم فرما اور اس کو ثبات (دوام واستحکام) عطا کر کیونکہ تو نے اُسے کائنات میں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور خلافت کے مرتبہ پر فائز کیا ہے، کائنات کی حکومت اُسے عطا کی ہے۔ وہ موت کی ذلت اسلئے برداشت کرلیتا ہے کہ حیات (ابدی) کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ بنی آدم کی عظیم انسانی اکثریت، بلکہ راقم الحروف کے مشاہدہ کی رُو سے ۹۹ ۳/۴ فیصدی، مرگِ دوام کی ذلت اس لئے بخوشی گوارا کرلیتی ہے کہ اُسے حیاتِ ابدی حاصل کرنے کے قانون (ناموس) سے آگاہی نہیں ہے۔

عام طور سے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دیگر نعماء کی طرح حیاتِ ابدی بھی "فی سبیل اللہ" حاصل ہو جائے گی۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں، ہوا، پانی اور روشنی مفت ملتی ہے۔ اسی طرح اُس دُنیا میں حیاتِ جاودانی بھی مفت مل جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ محکمہ حیاتِ ابدی کے کنٹرولر کو "کورٹ فیس لگا کر" ایک درخواست دینی ہوگی۔ اور معمولی سا "نذرانہ" وصول کر کے، حیاتِ ابدی سائل کے نام "الاٹ" کر دے گا۔

اقبال اسی خوشنما لیکن غلط عقیدہ کی تردید کرتے ہیں کہ مسلمان، قانونِ حصولِ حیاتِ ابدی سے بالکل بے خبر ہیں۔ حیاتِ ابدی اسے اور صرف اُسے ملیگی جو اِسکے حصول کے لئے کوشش کریگا۔

نوٹ:۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بطلِ حریت سلطان فتح علی خاں المعروف بہ سلطان ٹیپو شہید ۱۷۹۹ء میں یوں یکہ و تنہا، شمشیر بکف، باطل کے مقابلہ کے لئے نہ نکلتا اور خاک و خون میں غلطاں ہو کر نظام علیخاں کو رقصِ بسمل کا تماشا نہ دکھاتا۔ بلکہ وہ بھی نظام مذکور کی طرح دلزلی کو اپنا معبود تسلیم کرلیتا اور ساری عمر عیش و

عشرت میں بسر کرتا اور آج اس کی اولاد بھی میسور کے راج پرمکھ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوتی۔

لیکن سلطانِ شہید اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ حیاتِ ابدی صرف اُسے مل سکتی ہے جو اس کے حصول کے لئے جد و جہد (جہاد) کرے۔ نیز یہ کہ اسلام نے اسی لئے جہاد کو فرض قرار دیا ہے تاکہ ہر مسلمان اس کے ذریعہ سے حیاتِ ابدی حاصل کر سکے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پہلی رباعی برص ۱۷۷

مطلب:۔ اقبال ابلیس سے کہتے ہیں کہ تو کب تک اس دنیا کے جھگڑوں میں پھنسا رہے گا؟ میں حیران ہوں کہ تجھے اس دنیا سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے: یہ دنیا تو ہرگز اس لائق نہیں کہ کوئی سمجھدار آدمی اس سے وابستگی پیدا کرے مجھے تو یہ دنیا بالکل پسند نہیں آتی۔ کیونکہ اس کی ہر خوشی کا انجام غم ہے:

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے کہ اس دنیا میں کسی کو راحت نصیب نہیں ہوتی۔ ہر مسرت میں رنج کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے:

دوسری رباعی برص ۱۷۷

مطلب:۔ جب خدا نے یہ دنیا پیدا کی تو بالکل سنسان اور بے رونق تھی۔ اس میں کسی قسم کا ہنگامہ نہیں تھا۔ جب خدا کو یہ منظور ہوا کہ اس میں ہنگامہ برپا ہو تو اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے اندر دوسری صفات کے علاوہ غضب کی

صفت بھی ودیعت کی۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوتے تو ابلیس بھی نہ ہوتا کیونکہ وہ ہماری ہی صفتِ غضب (آتش) سے پیدا ہوا ہے۔

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے کہ ابلیس دراصل ہماری ہی آتشِ غضب کا خارجی مظہر ہے۔

پہلی رباعی بر ص۱۷۸

مطلب :۔ اقبالؔ ابلیس سے کہتے ہیں کہ جب انسان، خدا کی آغوش میں تھا تو اپنے وجود سے آگاہ نہ تھا (اُسے شعورِ ذاتی حاصل نہ تھا) لیکن جب جدائی ہوگئی یعنی انسان، خدا سے جُدا ہو کر دُنیا میں آیا تو جذبۂ عشق (شوق) نے اُسے دانا بینا، روشن بصر بلکہ جوئندہ تر کر دیا۔ یعنی وہ اپنی اصل سے وابستہ ہونے کے لئے بیقرار ہو گیا۔

اے ابلیس! میں تیرے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے اندر تو خودی کا احساس اس جدائی ہی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔

بنیادی تصور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے کہ جب انسان، عالمِ آب و گِل میں آیا یعنی اس کا آنا جسم میں مقیّد ہوا تو اسکے اندر خودی کا شعور پیدا ہوا۔

دوسری رباعی بر ص۱۷۸

مطلب :۔ ابلیس سے کہتے ہیں کہ بیشک تو بہت پیچ و تاب کھا رہا ہے کہ تجھے خدا نے رجیم، کا فر اور طاغوت قرار دیکر اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ لیکن میں بھی اسی حال میں ہوں۔ کیونکہ جب خدا نے مجھے دُنیا میں بھیجا۔ تو میرے دل میں ایک کانٹا چبھو دیا۔

رحیم بمعنی مرحوم جیسے قتیل بمعنی مقتول۔ یعنی راندۂ درگاہ ۞ کافر بمعنی منکر یا نافرمان ۞ طاغوت بمعنی حد سے تجاوز کرنے والا ۞ ازاں غبارے۔ غبار کنایہ ہے جذبۂ عشق سے جو انسان کو بےچین کئے رہتا ہے۔
بنیادی تصور یہ ہے کہ ابلیس اور انسان دونوں اپنی اپنی جگہ پیچ و تاب میں مبتلا ہیں ۞

پہلی رباعی بر صہ ۱۷۹

مطلب:۔ ابلیس سے کہتے ہیں کہ تو میری حالت سے بخوبی واقف ہے یعنی تو ہر حال میں خطا کار ہے اس سے اگر ایک نیکی سرزد ہوتی ہے تو سو گناہ صادر ہوتے ہیں۔ تو نے واقعی بڑی ہمت کی کہ ایک سجدہ نہ کر کے ہمارے سارے گناہ اپنے ذمہ لے لئے ۞
بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان، پیدائشی طور پر کمزور اور ناقص ہے، گناہ تو خود کرتا ہے اور نام شیطان کا لیتا ہے کہ اس نے مجھ سے گناہ کرا دیئے۔
کشتِ خراب کنایہ ہے ماہیّتِ انسانی سے اور انسان کی ماہیّت عدم ہے اس لئے انسان صفاتِ عدمیہ کا مالک ہے اور صفاتِ عدمیہ خیر و خوبی سے معرّا ہیں ۞

دوسری رباعی بر صہ ۱۷۹

مطلب:۔ ابلیس سے کہتے ہیں کہ آ ! مردانہ طریق پر دنیا میں زندگی بسر کریں اور اس دنیا میں بغض و حسد کی جگہ سوز و گداز کا رنگ پیدا کریں۔ اور اُن صلاحیتوں کی بدولت جو ہمیں حاصل ہیں اس دنیا کو بہشتِ بریں کا نمونہ بنا دیں۔

نرد باختن۔ جوا کھیلنا؛ بافسونِ ہنر۔ ذاتی قابلیت کی بدولت؛ برگِ کاہ۔ ش میں "ش" کا مرجع "جہان" ہے۔ برگِ کاہ کنایہ ہے دُنیا کی معمولی یا ادنیٰ چیزوں سے؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر انسان، ابلیس کو مسلمان بنالے تو اس دُنیا کو بہشت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہاں ابلیس سے وہ ابلیس مراد ہے، جو خود انسان کے اندر پوشیدہ ہے۔ اگر انسان، قرآن مجید کے احکام کی اطاعت کرنے لگے تو اس کا ابلیس بھی مسلمان ہو جائے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

اس شعر سے ثابت ہوا کہ اقبال کی رائے میں، ابلیس اندر ہے باہر نہیں ہے؛

پہلی رباعی بر ص ۱۸۰

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ عصر حاضر کی خرابیاں ہر شخص کے سامنے ہیں اور اس قدر شدید ہیں کہ ساری کائنات اُن کی وجہ سے شرمندہ ہے، یعنی عصر حاضر اس عالم کے لئے باعث ننگ ہے۔ اے انسان! اندریں حالات، اگر تو ذوقِ نگاہ یعنی شانِ فقر پیدا کرلے تو عصر حاضر کے تمام شیاطین تیرے فرمانبردار بن سکتے ہیں؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ عصر حاضر کی خرابیوں کا ازالہ صرف شانِ فقر سے ممکن ہے وہی شخص اس زمانہ میں اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے، جو "ذوقِ نگاہ" پیدا کرلے؛

دوسری رباعی بر ص ۱۸۰

مطلب:۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ فسق اور فجور فحاشی

اور عریانی کی گرم بازاری ہے۔ ہر قدم پر معصیت اور بدکاری فیشن کے لباس میں جلوہ گر ہے۔ مغربی تہذیب کا مقصد یہ ہے کہ انسان پاکیزگی اور نکوکاری (دل) سے بالکل بیگانہ ہو جائے۔ چنانچہ اس تہذیب نے اپنی دکانوں کو گراں قیمت گناہوں سے آراستہ کر رکھا ہے اور قیمتی سے قیمتی گناہ، کوڑیوں کے مول فروخت ہو رہا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تہذیب مغرب کے یہ سوداگر بڑے ارزاں فروش ہیں۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ عصر حاضر نے گناہوں کو اس قدر ارزاں کر دیا ہے کہ آج آپ چند کوڑیاں خرچ کر کے بڑے سے بڑا گناہ خرید سکتے ہیں۔

نوٹ:۔ یہ رباعی ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی۔ آج کسی گناہ کے لئے آپ کو ایک کوڑی (دلپسیز) خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بڑے شہروں میں یہ نعمت بالکل مفت مل سکتی ہے۔ صرف تھوڑی سی "ہمت مردانہ" کی ضرورت ہے ۱۲

پہلی رباعی بر ص۱۸۱

حل لغات:۔ چہ شیطانے میں چہ کلمۂ تحقیر ہے، یعنی عصر حاضر کے شیاطین نہایت ذلیل و خوار ہیں ÷ خرامش وازگوں۔ لغوی معنی اوندھی چال مراد ہی بدنصیبی یا گمراہی ÷ افسوں بمعنی دھوکہ یا فریب ÷

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ ماڈرن قسم کے شیاطین دراصل نہایت گھٹیا درجہ کے "لوگ" ہیں، ان شیاطین میں وہ طاقت اور ہمت نہیں ہے، جو پہلے زمانہ کے شیاطین میں پائی جاتی تھی۔ وہ شیاطین اپنی طاقت سے انسانوں کو مغلوب کرتے تھے۔ لیکن عصر جدید کے شیاطین "جادو منتر" سے کام لیتے ہیں۔ میں تو اس شیطان کو بالکل مردہ اور بے جان شیطان تصور کرتا ہوں جو اس زمانہ کے ضعیف بلکہ زار و زبون انسانوں کو جو پہلے ہی سے زخمی ہیں، اپنا شکار بناتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ چونکہ عصر حاضر سراسر دھوکہ اور فریب پر مبنی ہے، اسلئے

اس زمانہ کے شیاطین بھی طاقت کے بجائے دھوکہ اور فریب سے کام لیتے ہیں واضح ہو کہ اس رباعی میں "شیاطین" سے "ابلیس خاکی" مراد ہے، یعنی انسان۔

دوسری رباعی بر ص۱۸۱

مطلب:- اے انسان! تو عصر حاضر کے شیاطین کے طرز عمل کو غور سے دیکھ! ان کی شراب میں زہر ملا ہوا ہے یہ لوگ دراصل اپنے بھائیوں کی روح کے قاتل ہیں۔ لیکن انسانوں کو احساس نہیں ہوتا کہ یہ ہمیں قتل کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم اس حلقۂ دام کو تو دیکھ سکتے ہیں جو بالکل ظاہر ہے لیکن ہم اس دام کو نہیں دیکھ سکتے جو دانہ کے اندر پوشیدہ ہے:

بنیادی نکتہ بونہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انگریز ہم سے یہ کہیں کہ مثلاً بائبل کا مطالعہ کرو یا اتوار کے دن گرجہ میں جا کر عبادت میں شرکت کرو، یا کرسمس کا تہوار مناؤ تو ہم ضرور صدائے احتجاج بلند کریں گے۔ کیونکہ یہ "حلقۂ دام" واضح طور پر ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر وہی انگریز، غیر اسلامی نظام و نصاب تعلیم ہمارے لئے مدون اور مقرر فرما دیتے ہیں تو ہم بڑی خوشی سے اس کو قبول کر کے اپنی آئندہ نسلوں کا خاتمہ "بالخیر" کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ نصاب کی کتابوں میں جو غیر اسلامی تصورات مذکور ہیں وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔

پہلی رباعی بر ص۱۸۲

مطلب:- چونکہ انسان نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا ہے اس لئے اب ترقی اور عروج کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ ابلیس کا مقابلہ کر کے اپنی خودی کو مستحکم کرے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اگر تیرا ابلیس "خاکی نژاد"

ہے، تو خودی تو کیا مستحکم ہوگی، گناہ میں بھی لذت نہیں آئے گی ۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ ابلیس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) خاکی (جو ہمارے ہم جنس ہیں) اور (۲) ناری جو اصلی اور حقیقی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ خودی اُس وقت مستحکم ہوگی جب تم اُس ابلیس کو مغلوب کر دگے جو خود تمہارے اندر پوشیدہ ہے ۔

دوسری رباعی بر ص ۱۸۲

مطلب :- کہتے ہیں کہ اس دور (عصرِ حاضر) کے ابلیسوں کی غلامی مت کرو۔ یہ تو خود ہی بہت ذلیل و حقیر ہیں۔ اُن کے "غمزے" صرف کمین اور ذلیل قسم کے انسانوں ہی کو پسند آسکتے ہیں۔ شریف الطبع انسانوں کو تو اُسی ابلیس کا مقابلہ کرنا لازم ہے جس نے خدا سے دو بدو گفتگو کی تھی اور اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے شیاطین کی غلامی کرنا انسانیت کی توہین ہے۔ انسان کے شایانِ شان وہ ابلیس ہے جو خدا کے سامنے بھی اپنی بات پر اڑا رہا ۔

پہلی رباعی بر ص ۱۸۳

حلِ لغات :- حریف بمعنی مد مقابل ۔ مردِ تمام۔ مردِ مومن ۔ آں آتش نسب کنایہ ہے، ابلیس کے ناری ہونے سے یعنی اس کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے ۔ خاکی کنایہ ہے انسان سے ۔ سزاوارِ تیغِ او ہست اس کے شکار کے لائق ہے ۔ صیدِ لاغر کنایہ ہے گنہ گار انسان سے جس کی سیرت خام ہو ۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اے انسان! اُس ابلیس کا مقابلہ کر جو آتشیں ہے، بہت نامور اور والا مقام (بلند مرتبہ) ہے۔ وہ کمزور کا شکار نہیں کرتا ، ہمیشہ اس شخص پر حملہ کرتا ہے جس میں ایمان کی طاقت پائی جائے ، کافر تو پہلے ہی سے اس کے غلام ہیں ۱۲ ؛

دوسری رباعی بر ۱۸۳

حل لغات :- دوں نہاداں یعنی ذلیل طبع یا کمینہ فطرت لوگ ؛ نوزادہ ابلیساں کنایہ ہے عصرِ حاضر کے شیاطین سے جو مکرو فریب سے اپنا کام چلاتے ہیں ؛ نسازد ، ساختن بمعنی دوستی کرنا ، موافقت کرنا رابطہ پیدا کرنا یا صحبت اختیار کرنا ؛ گنہ گار کنایہ ہے انسان سے ؛ غیور وہ شخص جس میں غیرت اور شرافت کا مادہ ہو ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ اگرچہ زمانہ کے پست فطرت لوگ اس نکتہ کو سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن میں بیان کئے دیتا ہوں تاکہ فرضِ منصبی ادا کر سکوں ؛

وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ انسان جس میں غیرت اور شرافت کا مادہ ہے ، خواہ وہ کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو ، عصرِ حاضر کے ان ذلیل شیاطین سے کبھی دوستی نہیں کریگا ۔ اور نہ ان کی صحبت میں بیٹھنا پسند کریگا ؛

نوٹ :- چونکہ عصرِ حاضر کے شیاطین ہر شہر اور ہر سوسائیٹی میں پائے جاتے ہیں اور اپنے اعمالِ زشت کی وجہ سے ہر جگہ مشہور و معروف ہیں ، اس لئے میں نے اُن کے تذکرہ سے دانستہ احتراز کیا ہے ۔ بس اتنی صراحت کافی ہے کہ یہ شیاطین عورتوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور مردوں میں بھی ۱۲ ؛

بابِ پنجم

بیارانِ طریق

یعنی

(ہم مشربوں سے خطاب)

تمہید:۔ اس باب میں اقبالؔ نے اپنے عقیدتمندوں، مدّاحوں، ہمخیالوں اور دستوں سے خطاب کیا ہے: اور

(۱) اُن کو اپنے حقیقی منصب اور مقام سے آگاہ کیا ہے۔

(۲) اُن کو اپنے افکارِ خصوصی کی تبلیغ کی ہے۔

(۳) اُن سے درخواست کی ہے کہ میرے پیغام کی اشاعت کرو۔

(۴) اُن کو وصیّت کی ہے کہ فرنگی کی غلامی ہرگز نہ کرنا۔

(۵) اُن کو فقر (عاشقی) کی حقیقت اور اہمیّت سے خبردار کیا ہے۔

(۶) اُن سے سرد مہری، تغافل شعاری اور کم توجہی کی شکایت کی ہے۔

(۷) اپنی تنہائی اور بے نصیبی کے احساس کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

(۸) اُن کو عشقِ رسولؐ کا درس دیا ہے۔

(۹) مومن اور اس کی نماز کی قدر و قیمت واضح کی ہے۔

(۱۰) آخر میں جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین کی ہے اور اسی رباعی پر یہ نادر الوجود حصّہ کتاب ختم ہو جاتا ہے۔

نوٹ:۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ حالات کے پیشِ نظر تو یہ حصّہ "صدا بصحرا" کا مصداق معلوم ہوتا ہے لیکن مرحوم کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد (میری رائے میں ۱۹۸۰ء تک) میری قوم کے نوجوان ضرور میرے پیغام پر عمل کریں گے۔ اس لئے انہوں نے رخصت ہونے سے پہلے اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا۔

پہلی رباعی بر ۱۸۵

تمہید:۔ اس رباعی میں مرحوم نے حسبِ معمول، اس باب کا خلاصہ چار مصرعوں میں بیان کر دیا ہے اور اس رباعی کا خلاصہ پہلے مصرعہ کے پہلے لفظ میں مضمر ہے۔ یعنی یہ رباعی اس آخری حصّہ کی جان ہے اور لفظ "بیا" اس رباعی کی جان ہے۔ یعنی اقبال اپنے عقیدت مندوں، ہم نواؤں، ہمخیالوں، ہم مشربوں اور دوستوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ! ہم سب ملکر اس اُمت کے بگڑے ہوئے کاموں کو سنواریں۔ آؤ! ہم سب اپنی زندگی کو خدمتِ قوم کیلئے وقف کر دیں۔ آؤ! ہم سچے مسلمانوں کی طرح اس دُنیا میں زندگی بسر کریں۔ آؤ! ہم اسلام کی سربلندی کے لئے کچھ کوشش کریں۔ آؤ! ہر مسجد میں، مسلمانوں کے ہر اجتماع میں، ہر محفل میلاد شریف میں، ہر جلسۂ میلادالنبیؐ میں، ہر تقریب میں، یوم آزادی پر، یوم ولادت قائداعظم پر، یوم وفاتِ قائداعظم پر، یونیورسٹی کے ہال میں، باغ جناح میں، اسمبلی ہال کے سامنے، پلازا اور ریگل کے احاطہ میں، آرٹ کونسل کے جلسہ میں، گول باغ کی سرکاری تقاریب میں، ہوٹل میٹروپول میں، جہانگیر پارک میں، گلِ رعنا کلب میں، پرانی نمائش

میں، احتفال العلماء کی شاندار صحبتوں میں، غرضیکہ ہر اجتماع میں، مسلمانوں کو ان کی زبوں حالی مفلسی، جہالت، حماقت، توہم پرستی، فضول خرچی، اور غیر اسلامی زندگی سے ایسے انداز میں آگاہ کریں کہ مُلا بھی اس داستان غم کو سُن کر تڑپ اُٹھے اور اس کے سینہ میں بھی خدمتِ قوم کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ یعنی پتھر میں بھی جونک لگ جائے۔

نوٹ:۔ اس رباعی کا چوتھا مصرعہ اس لائق ہے کہ اُسے کم از کم دو سَو مرتبہ پڑھا جائے تاکہ اس کا مفہوم بخوبی ذہن نشین ہو سکے ؁

پہلی رباعی نمبر ۱۸۷

حلِ لغات:۔ قلندر۔ لغوی معنی ہیں کندۂ ناتراشیدہ۔ اصطلاحی معنی ہیں وہ شخص جس نے تمام دنیاوی علائق سے کنارہ کش ہو کر، صرف اللہ تعالےٰ کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیا ہو۔ اقبال نے اس لفظ کو اپنی تصانیف میں مومن کامل کے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی وہ شخص جس میں شانِ فقر بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہو۔ یعنی اقبال کا آئیڈیل مومن ؁ جُرّہ باز۔ یعنی سفید رنگ کا باز جو بہت کمیاب ہوتا ہے اور بازوں میں سب سے اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ اقبال نے جُرّہ باز کی ترکیب اس لئے استعمال کی ہے کہ "جُرّہ" بہادر آدمی کو بھی کہتے ہیں ؁ بال یعنی بازو ؁ بہ بالِ او سبک گردد الخ یعنی اس کی ہمت کے سامنے پہاڑ کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے ؁ فضائے نیلگوں کنایہ ہے کائنات سے ؁ نخچیر گاہ یعنی شکارگاہ ؁ نمیگردد بگرد الخ یعنی وہ ماہ یا ستارہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

ع کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اپنے اندر قلندری

کی شان پیدا کردو۔

پہلی رباعی برص ۱۸۸

حل لغات :۔ زجا نم نغمۂ الخ اللہ ھو کنایہ ہے اس حقیقت سے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی موجود نہیں ہے یعنی موجود الا اللہ ریخت یعنی سرزد ہوا۔ چو گرد از رخت ہستی الخ اس کی نثر یوں ہوگی "چار سو از رخت ہستیٔ من، چو گرد، ریخت۔ یعنی زمان و مکان (کائنات) کا تصور میرے ذہن سے اس طرح دور ہوگیا جس طرح کپڑے جھاڑنے سے گرد دور ہو جاتی ہے۔ بگیر از دست من ساز ے الخ یہ بہت بلیغ شعر ہے۔ اس میں اقبال نے موسیقی کا تلازمہ باندھا ہے اور اس کے پردہ میں اپنا پیغام، یارانِ طریق، کو دیا ہے۔ ساز سے وجود مقیّد یا ذاتِ شاعر مراد ہے۔ تار سے شعورِ ذات یا دل شاعر مراد ہے۔ سوزِ زخمہ سے اللہ ھو کی ضرب مراد ہے جو دل پر لگائی۔ زخمہ بمعنی مضراب جس سے تاروں پر ضرب لگاتے ہیں۔ بگیر از دست من سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ میں نے تمہیں عشق میں فنا ہو جانے کا جو پیغام دیا ہے اب یہ پیغام (امانت) تم مجھ سے لو اور اسے دنیا میں پھیلاؤ۔

مطلب :۔ یہ ارمغان کی مشکل ترین رباعیوں میں سے ہے۔ جو بات اس میں بیان کی گئی ہے وہ "حال" سے تعلق رکھتی ہے اس لئے "قال" میں نہیں آسکتی تاہم لفظوں کے ذریعہ سے جس قدر سمجھایا جا سکتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب میں نے صدق دل سے اللہ ھو، کہا یعنی جب میں مقامِ فنا، کلّی پر فائز ہوا تو یہ ساری کائنات فنا ہوگئی۔ غیر اللہ کا وجود مطلق باقی نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر اللہ کا وجود نہیں ہے لیکن جب تک کوئی شخص مقامِ فنا تک نہ پہنچے یہ حقیقت اس پر

منکشف نہیں ہوسکتی۔ اقبال اس رباعی میں اسی مقام سے گفتگو کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب تک مخاطب بھی اسی مقام پر نہ ہو وہ متکلم کے مفہوم کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

فی الجملہ جب میں اس مقام پر پہنچا تو یہ ساری کائنات فنا ہوگئی۔ صرف اللہ باقی رہ گیا۔ اب اقبال یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ جب غیر اللہ کا وجود، فنا ہوگیا تو میں کب باقی رہا؟ میں بھی فنا ہوگیا۔ دوسرے شعر میں شاعر نے اپنی حقیقت بیان کی ہے کہ ذرا میری ہستی کے ساز کو سنبھالنا! بالفاظِ دگر۔

ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کیونکہ جو مضراب میں نے اپنی ہستی کے تاروں پر لگائی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سارے تار ٹوٹ گئے۔ یعنی میری ہستی کا ساز ہی ختم ہوگیا۔

بنیادی تصور:۔ اس رباعی میں اقبال نے وحدۃ الوجود کی تعبیر شیخ اکبرؒ کے انداز میں پیش کی ہے۔ اور میں نے مقدمہ میں اس امر کی صراحت کردی ہے کہ اگرچہ اقبال حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کے متبع ہیں لیکن کبھی کبھی وہ شیخ اکبرؒ کی زبان بھی بولنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ رباعی اسکی بہترین مثال ہے۔

شیخ اکبرؒ کی رائے میں یہ کائنات محض وہم و خیال ہے جب سالک مقام فنا پر فائز ہوتا ہے تو اُس پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ جس طرح ہاتھ کی گردش رُک جائے تو وہ دائرہ آتشیں جو گردش کی بدولت پیدا ہوگیا تھا، معدوم ہوجاتا ہے اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ چنانچہ عارف جامیؒ نے اس رباعی میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:۔

ہمسایہ و ہم نشیں و ہمرہ، ہمہ اوست   در دلقِ گدا و اطلسِ شہ، ہمہ اوست

درانجمن فرق و نہاں خانۂ جمع   باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

اسی ہمہ اوست کو کبھی کبھی ہمہ اندر اوست سے بھی تعبیر کر دیتے ہیں۔

ہستی کہ بود ذاتِ خداوندِ عزیز
اشیاء ہمہ در وے اند و وے در ہمہ نیز (جامیؒ)

لیک غیر از خدائے عزّ و جلال
نیست موجود نزدِ اہلِ کمال (عطارؒ)

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ بر طاقِ عدم داریم ما (بیدل)

دوسری رباعی نمبر ۱۸۸

مطلب:۔ جس طرح آنسو، ایک عاشق کے جذباتِ قلبی کا خارجی مظہر ہے اسی طرح میں فطرت کا وہ گراں قدر سرمایہ ہوں جو اس کے دل سے نکل کر اس کی آنکھ تک آیا۔ یعنی فطرت نے ہزاروں سال جدوجہد کی تب میرا وجود ظاہر ہوا۔ اگر کسی کو میری چمک دمک دیکھنی ہو تو فطرت کی آنکھ کی طرف دیکھے یعنی انسان فطرت کی آنکھ کا تارہ ہے، بہت قیمتی شئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی تابناکی مژگانِ فطرت پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی حقیقت فطرت کی دوسری مخلوقات میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔ بالفاظِ دگر میں ادنیٰ درجہ کی چیز نہیں ہوں کہ برگِ کاہ میں نظر آجاؤں۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ فطرت سے اللہ کی قوتِ تخلیق مراد ہے اور انسان اللہ تعالیٰ سے الگ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسی کی صفتِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ اس لئے وہ بلحاظِ وجودِ خویش، خدا کے ساتھ ہے اور خدا اس کے ساتھ ہے۔

اور خدا اس کے ساتھ ہے۔ خدا سے جدا ہو کر انسان کا کوئی ذاتی یا مستقل وجود نہیں ہے

پہلی رباعی بر ۱۸۹

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ منطق ایک ناقص فن ہے، کیونکہ اس کی دلیلوں سے دل کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں مرشد رومیؒ یا عارف جامیؒ کا کلام مشکل مقامات کو کھول سکتا ہے یعنی وہ عقل کے بجائے وجدان کو رہنما بناتے ہیں اور اس کی بدولت دل مطمئن ہو جاتا ہے ؎

بنیادی تصور:۔ انسان عقل کی مدد سے کائنات کے کسی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اُسے لازم ہے کہ عشق کو اپنا رہنما بنائے ؎

نوٹ:۔ اس جگہ اُس شبہ کا ازالہ ضروری ہے جو پہلے مصرعہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں بجا طور پر پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ارسطو سے لیکر ہیگل اور جوزف تک سارے فلاسفہ، منطق کو ضروری قرار دیتے چلے آئے ہیں، اور ہر قدم پر منطقی مجنوں مثلاً قیاس، استقراء اور تمثیل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اقبال کہتے ہیں کہ منطق سے مجھ بوئے خامی آتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال منطق کی افادیت اور اہمیت کے منکر نہیں ہیں۔ چنانچہ اپنی مایۂ ناز تصنیف موسومہ "مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں اُنہوں نے ہر جگہ منطقی استدلال سے کام لیا ہے۔ نیز وہ خود بڑے منطقی تھے، اُن کی ساری عمر منطق اور فلسفہ ہی کے مطالعہ میں بسر ہوئی۔ لیکن اُنہوں نے اپنی تصانیف میں منطق کی تنقیص اس لئے کی ہے کہ یہ فن نہ انسان کو اللہ سے ملا سکتا ہے اور نہ یقین کی دولت عطا کر سکتا ہے

خلاصۂ کلام یہ کہ منطق بہت مفید اور کارآمد علم ہے لیکن صرف ایک محدود دائرہ میں۔ اقبال یہ کہتے ہیں کہ منطق پڑھو اور اس سے کام بھی لو لیکن

اُسے حقیقت رسی کا ذریعہ مت سمجھو جیسا کہ مناطقہ اور فلاسفہ عموماً سمجھتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اس شعر میں اُسی حقیقت کو واضح کیا ہے :۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ کوئی شخص منطق سے نہ خدا کو ثابت کر سکتا ہے اور نہ اس کی ہستی کا یقین دل میں پیدا کر سکتا ہے ۱۲ ؛

دوسری رباعی پر ۱۸۹

حل لغات :۔ بیا۔ مسلکِ عشق اختیار کرنے کی دعوت ہے ؛ از من بگیر یعنی عاشقی کا طریقہ مجھ سے سیکھ لے ؛ آں دیر سالہ لغوی معنی ہیں پرانی شراب اور شراب کی خوبی اُس کی کہنگی پر موقوف ہے۔ کنایہ ہے پیامِ عشق یا درسِ محبّت سے ؛ کہ بخشد روح یعنی یہ شرابِ محبّت زندگی پیدا کر دے گی ؛ خاکِ پیالہ کنایہ ہے قلبِ عاشق سے ؛ اگر آبش دہی الخ آبش میں "ش" کا مرجع لالہ ہے جو دوسرے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی اگر تو لالہ کو سیراب کرے ؛ از شیشۂ من۔ شیشہ مرادی معنی شراب کا کنٹر۔ کنایہ ہے تعلیماتِ اقبال سے ؛ شاخِ لالہ سے ملّتِ اسلامیہ کا فرد مراد ہے ؛ مطلب یہ ہے کہ آؤ! میری صحبت میں بیٹھو اور مجھ سے حقائق و معارف اسلام سیکھ لو اور پھر اُن کی نشر و اشاعت کرو۔ میرے کنٹر میں وہ شراب ہے جو تمہارے دل کو زندہ کر دیگی، اور اگر تم ملّتِ اسلامیہ کو میرے پیغام سے آگاہ کر دو گے تو لالہ کی شاخ جو عموماً ایک فٹ کی ہوتی ہے چھ فٹ کی ہو جائے گی، یعنی قوم کا ہر فرد اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے حقیقی مقام کو حاصل کر سکیگا ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ افراد قوم کی صحیح دماغی نشو ونما میرے کلام کے مطالعہ پر منحصر ہے ؛

پہلی رباعی برصنہ ۱۹

حل لغات :- بدست من ہماں دیرینہ چنگ است یعنی میرا پیغام کوئی نیا پیغام نہیں ہے۔ وہی پُرانا پیغام ہے جو تیرہ سو سال ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو دیا تھا بدرونش نالہ ہائے الخ میرے ساز میں نہایت دلکش نغمے پوشیدہ ہیں یعنی اسلامی تعلیمات نہایت دلپذیر ہیں ؛ ولے بنوازمش با ناخن الخ لیکن میں اس ساز کو شیر کے ناخن سے بجا رہا ہوں یعنی قوم کو عیش پسندی کے بجائے جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دے رہا ہوں ؛ کہ اوراتار از الخ کیونکہ اسلامی ساز کے تار "روده" کے نہیں ہیں بلکہ شیر کی رگوں سے بنائے گئے ہیں۔ یعنی اسلامی تعلیمات مسلمان کو جہاد کی دعوت دیتی ہیں ؛ بنیادی تصور یہ ہے کہ اسلام انسان سے جفاکشی اور مردانگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ دین سراپا عمل جہاد اور ایثار کا مجموعہ ہے اس میں ہر قدم پر مشکلات ہیں اور وہی شخص مسلمان بن سکتا ہے جو سربکف رہ سکے ؛

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دوسری رباعی برصنہ ۱۹

حل لغات :- یزدانِ این عصر سے دشمن اسلام عناصر مراد ہیں، مثلاً اشتراکیت، ملوکیت اور سرمایہ داری کے حامی + نہ فہرم دم کہ گیرم الخ یعنی

مسلمان کسی عورت (فانی محبوب) کا طالب نہیں ہے جو وہ تمہارے کہنے سے
تیشہ ہاتھ میں لے کر، پہاڑ کاٹنے کے لئے تیار ہو جائیگا۔ یعنی کسی مادی فائدہ کے
لئے تمہاری اطاعت کریگا: زخارے کو غلط درسینہ الخ خارا کنایہ ہے۔
عشق رسول سے: غلط کنایہ ہے موجزنی یا ہنگامہ آفرینی سے: بیستون:
اس پہاڑ کا نام ہے جسے فرہاد نے کاٹا تھا۔ دل صد بیستون کنایہ ہے مختلف
اور متعدد مصائب و مشکلات سے۔ شکستن لغوی معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا
یہاں مراد ہے مشکلات پر غالب آنا:

بنیادی تصور:۔ اقبال نے اس رباعی میں آئیڈیل مسلمان کی ذہنیت کا
نقشہ کھینچا ہے، کہ جب وہ پیدا ہوگا تو دشمنانِ اسلام سے اسطرح خطاب کریگا!!

پہلی رباعی بر صفحہ ۱۹۱

مطلب:۔ اقبال اپنے ہم مشرب لوگوں سے (جو فی الحال مریخ میں رہتے
ہیں) خطاب کرتے ہیں کہ دوستو! میرے پاس نہ جاگیر ہے نہ مال و دولت:
نہ عہدہ ہے نہ سامانِ عیش و عشرت۔ بس لے دے کے "نگاہ" ہے، یعنی عشق
رسولؐ۔ نگاہ کا مفہوم قبل ازیں کئی جگہ واضح کر چکا ہوں۔ اقبال کے پیغام کا
خلاصہ یہی ہے کہ اے مسلمان! "نگاہ پیدا کر" اسلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان
میں نگاہ پیدا ہو جائے۔ نگاہ سے وہی روحانی طاقت مراد ہے جو عشق رسولؐ
سے پیدا ہوتی ہے۔ بچشم کو یاراں الخ اور میری نگاہ میں دولتمندوں کی جاگیروں
خطابوں، عہدوں اور بنک بیلنس کی کوئی وقعت نہیں ہے، کیونکہ یہ سب
چیزیں نہیں رہ جائیں گی۔ زمین گیرانیکہ یعنی میری بات پر یقین کرو: زاغ و چمہ
سے گدھ مراد ہیں جو پاسیوں کے سرگشت (قبرستان) کے ارد گرد اس لگاتے

بیٹھے رہتے ہیں ؛ واضح ہو کہ پارسی لوگ اپنے مُردوں کو قبرستان میں رکھ دیتے ہیں اور گِدھ تھوڑی دیر میں ان کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں کہ صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں ؛ انداں بازے کہ دست آموز الخ یعنی مرگھٹ کے گِدھ جو مُردار کھاتے ہیں اُن بازوں سے بہتر ہیں جو بادشاہوں یا نوابوں کے ہاتھ پر بیٹھتے ہیں ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ دوسروں کی غلامی سے مُردار کھانا بہتر ہے ۔ بیشک مُردار کھانا بہت بُری بات ہے ۔ لیکن غیر کی غلامی کرنا اس سے بھی بدتر ہے ؛

دوسری رباعی پر ۱۹۱

مطلب ؛۔ کہتے ہیں کہ میں نے دُنیا میں کسی سے قطع تعلق نہیں کیا یعنی ترکِ علائق تو بیشک کیا ہے لیکن ترکِ آدمیت نہیں کیا ۔ یعنی نہ رشتہ داروں سے قطع تعلق کیا نہ دوستوں سے ۔ لیکن ان سے دل نہیں لگایا ۔ اُن کو مقصودِ حیات نہیں بنایا ۔ میں نے اپنا نشیمن کسی غیر کی شاخ پر نہیں بنایا ۔ میں نے کسی غیر سے توقع نہیں باندھی ، میں نے اپنی ہی قوتِ بازو پر بھروسہ کیا اور مجھے اس بات کے اعلان میں بہت خوشی ہے کہ میں نے اس دُنیا میں بہت عزت کی زندگی بسر کی ؛

بنیادی تصور ؛۔ انسان کو چاہیئے کہ اس دُنیا میں سب سے ملے ، سب سے تعلقات رکھے لیکن توقعات کسی سے نہ باندھے ، صرف اپنی ذات پر بھروسہ کرے نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شخص کو کبھی مایوسی یا ملال لاحق حال نہ ہوگا ؛

پہلی رباعی پر ۱۹۲

حل لغات ؛۔ دریں گلشن کنایہ ہے اس دُنیا سے جس میں ہر طرف محمل ساتھی

اور ریشم کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ آب وجاہ سے دُنیاوی ثروت، عزت اور شہرت مراد ہے۔ قبا اور کلاہ سے وہی دولت عہدہ اور سامانِ عیش مراد ہے۔ اس کی وجہ اگلے شعر میں بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ "نعمات" کیسے حاصل ہو سکتی تھیں، مجھ کو تو انگریزوں اور اُن کے مشیرانِ خصوصی یعنی صوفی اور مُلّانے قوم اور وطن دونوں کا بدخواہ قرار دیا۔ اور اس "نوازش" کی وجہ یہ تھی کہ میں نے نرگس کو نگاہ عطا کر دی۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ انگریز صرف اُس شخص کو عہدہ، خطاب اور جاگیر عطا کیا کرتا تھا جو اپنی مِلّت سے غداری کرتا تھا۔ اور ان دین لوگوں کو اس کی غلامی کا سبق پڑھاتا رہتا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے چونکہ اپنی قوم کو انگریزوں کی اسلام دشمنی سے آگاہ کر دیا۔ اندھوں کو بینائی عطا کر دی، اور یہ ان کی نگاہ میں نا قابلِ معافی جرم تھا۔ اس لئے مجھے قبا نے نہ کلاہ ہے۔

۱۹۳

دوسری رباعی

مطلب: کہتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت قوم میں بہت سے دانشمند اصحاب موجود ہیں جو بڑے بڑے علمی نکات بیان کرتے رہتے ہیں لیکن میرے سوا اور کوئی شخص نہیں ہے جس نے دیکھے تو خار لیکن حال بیان کر دیا چمن کا۔ یعنی اگرچہ میں نے مسلمانوں کو بہت زبون حالت میں پایا لیکن اُن کو مایوسی کے دریا میں غرق ہونے سے بچا لیا۔ کیونکہ میں نے انہیں اُن کے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کیا۔ اور ترقی کی راہیں سمجھائیں۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت مسلمان بمنزلہ "خار" ہیں لیکن اُن کے اسلاف اس دُنیا میں بہت شاندار زندگی بسر کر چکے ہیں اور اگر مسلمان کوشش کریں تو اُن کے اُجڑے ہوئے چمن میں پھر بہار آ سکتی ہے۔ "احوالِ چمن گفت" سے ماضی

کے شاندار کارناموں کی داستان بھی مراد ہو سکتی ہے اور مستقبل قریب میں ملّتِ اسلامیہ کے عروج کی پیشین گوئی بھی:

پہلی رباعی بر ص ۱۹۳

مطلب:- اپنے دوستوں سے اپنا کارنامہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ میں اُستادِ فن ہونے کا مدّعی نہیں ہوں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میری سخنوری سے شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ شاعری میرے لئے ذریعۂ افتخار نہیں ہے بلکہ میری ذات، شاعری کے لئے موجبِ صد فخر و مباہات ہے یعنی میرے کلام سے شاعری کو مقامِ رفیع حاصل ہو گیا اور میری شاعری میں جو "سوز و سرور" کا رنگ پایا جاتا ہے اس کی بدولت بوڑھوں کے اندر جوانوں کا ولولہ پیدا ہو گیا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ میں نے شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا ہے:

دوسری رباعی بر ص ۱۹۳

مطلب:- کہتے ہیں کہ مجھ کو محض شاعر مت سمجھ لینا یعنی میرے کلام کا مطالعہ اس حیثیت سے مت کرو کہ یہ کسی بلند پایہ شاعر کا کلام ہے اور اس میں حسبِ معمول ہجر (آہ و فغاں) کی داستان قلم بند کی گئی ہے بلکہ میں نے شاعری کے پردہ میں وہ پیغام دیا ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو دوبارہ دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتے ہیں: آشیاں کنایہ ہے پیغام سے اور کلید باغ کنایہ ہے عزت اور سربلندی کے حصول کے طریقہ سے مرغِ صبح خواں کنایہ ہے غزل گو شاعر سے:

بنیادی تصور یہ ہے کہ میں نے شاعری کے پردہ میں سربلندی کا طریقہ سکھایا ہے:

پہلی رباعی نمبر ۱۹۴

مطلب :- یاران طریق سے کہتے ہیں کہ میری نگاہ میں دنیا کی حقیقت رہگزر سے زیادہ نہیں ہے۔ نہ اس دنیا کو ثبات ہے اور نہ اس کے متعلقات کو۔

صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں رہبر تو بہت ہیں لیکن ہم سفر کوئی نہیں ہے، یعنی بظاہر صدہا آدمی مجھ سے ملتے ہیں اور مجھ سے رسم و راہ رکھتے ہیں، لیکن حقیقی معنی میں رفاقت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں نے "خویش و پیوند" سے اس لئے تعلقات منقطع کر لئے کہ تجربہ سے یہ معلوم ہُوا کہ اس دنیا میں اپنوں سے بڑھ کر بیگانہ اور کوئی نہیں ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اس دنیا میں سچا دوست یا رفیق نایاب ہے ؛

دوسری رباعی نمبر ۱۹۴

مطلب :- اے طالب! اگرچہ تو عاجز و ناتوان ہے اور صدہا مشکلات میں محصور ہے اس کے باوجود ہمّت سے کام لے اور مردانہ وار زندگی بسر کر۔ اپنی خودی کو مستحکم کر تاکہ دنیا میں تیری قدر و قیمت میں اضافہ ہوسکے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ میرے کلام کا مطالعہ کر، میرا کلام اگرچہ ہنگامہ آفریں ہے لیکن اگر تو اپنی خودی کی تربیت پر آمادہ ہوجائے تو ہنگاموں کے باوجود تو اس طرح پرسکون زندگی بسر کرسکتا ہے جس طرح موتی اگرچہ ہر وقت طوفان میں رہتا ہے لیکن صدف کے اندر آسودہ رہتا ہے، طوفان اُسے پریشان نہیں کرسکتے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ جو شخص اپنی خودی کی تربیت میں مشغول ہوجاتا ہے دنیا کے طوفان اس کے سکونِ قلب کو زائل نہیں کرسکتے ؛

پہلی رباعی برص ۱۹۵

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں دُنیا میں رہتا ہوں، لیکن اس سے وابستگی پیدا نہیں کی۔ اگرچہ اسی دُنیا سے اپنی قوتِ لایموت حاصل کرتا ہوں لیکن اس کو یا دُنیاوی زندگی کو مقصدِ حیات نہیں سمجھتا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال نے اس رباعی میں مومنانہ طرزِ حیات کا طریق ہمیں بتایا ہے کہ مومن اسی دُنیا میں رہتا ہے۔ اسی سے اپنا رزق بھی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کو اپنا مقصدِ زندگی نہیں بناتا۔ منزل میں رہتا ہے، لیکن اُس سے دل نہیں لگاتا۔

دوسری رباعی برص ۱۹۵

مطلب:۔ اے مخاطب اگر تو اپنے دل کو زندہ کرنا چاہتا ہے تو کسی مردِ مومن کی صحبت اختیار کر، لیکن یہ نکتہ تیری سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک تو کسی مردِ مومن کی صحبت اختیار نہ کرے یعنی "علم بعد از عمل می آید" اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی طبیب کسی مریض سے یہ کہے کہ چالیس روز تک دواء المسک کے استعمال سے ضعف قلب دُور ہو جائے گا۔ تو جب تک وہ مریض فرمودۂ طبیب پر عمل نہ کرے، نہ اس کے مرض کا ازالہ ہو سکتا ہے اور نہ طبیب کا یہ قول سمجھ میں آسکتا ہے کہ دواء المسک سے ضعف دور ہو سکتا ہے، مومن بھی مشکلات میں گرفتار ہوتا ہے، اُس پر بھی مصائب نازل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ کیونکہ مومن کا غم بھی مومن کی طرح خوددار ہوتا ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ مومن کبھی دورِ فلک کا شکوہ نہیں کرتا۔ بلکہ مسلسل جدوجہد کی بدولت مشکلات پر غالب آجاتا ہے۔

پہلی رباعی نمبر ۱۹۶

حل لغات:۔ نگاہے آفریں یعنی اے مسلمان! معرفتِ نفس حاصل کر یا شانِ فقر پیدا کر۔ جاں در بدن ہیں یعنی تو اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کرلیگا۔ بشاخاں زاد میدہ یاسمن الخ یعنی تو کائنات کے اسرار سے واقف ہوجائیگا، پوشیدہ حقائق تجھ پر منکشف ہوجائیں گے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اگر تو نگاہ پیدا کرے یعنی اپنی خودی کی معرفت حاصل کرلے تو تجھ پر کائنات کے اسرار و رموز خود بخود منکشف ہوجائیں گے بلکہ آئندہ واقعات (ناد میدہ) بھی تجھ پر عیاں ہوجائیں گے۔ لیکن اگر تو نے ایسا نہ کیا تو دوسروں کا غلام بن جائے گا، تو خود نہیں سمجھ سکیگا جو دوسرے تجھے سمجھا دیں گے، بس اُسی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ اگر مثال درکار ہو تو "تیر" کی زندگی پر غور کر۔ چونکہ تیر خود نگاہ پیدا نہیں کرتا اس لئے ہدف کو خود نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ تیرانداز کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اور وہ جہاں چاہتا ہے وہاں اُسے پھینک دیتا ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ جب تک انسان خود نگاہ پیدا نہ کرے دوسروں کی غلامی سے رہائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یعنی وہ "مردہ بدست زندہ" کا مصداق ہوجاتا ہے۔

دوسری رباعی نمبر ۱۹۶

مطلب:۔ اپنے عقیدتمندوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ عقل (منطق) کی بدولت ایمان حاصل نہیں ہوسکتا۔ یعنی منطق اور فلسفہ پڑھ کر کوئی شخص مومن نہیں

بن سکتا۔ علم و حکمت کا مشغلہ انسان کے حق میں مفید نہیں ہے۔ فلسفہ سے دُنیا مل سکتی ہے خدا نہیں مل سکتا۔ یاد رکھو! دو سَو امام غزالی اور دو سَو امام رازی مل کر بھی اُس ایک نادان اور جاہل مسلمان کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو شانِ فقر رکھتا ہے۔
بنیادی تصوریہ ہے کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ عقل نہیں ہے بلکہ عشق ہے۔

نوٹ:۔ اس موقع پر مجھے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی مرحوم کا یہ قول یاد آگیا کہ ایک مجلس میں جب کہ وہ سلوک کی اہمیت اور فضیلت پر تقریر کر رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ "میرے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رح کی تعلیم ظاہری صرف کافیہ تک تھی اور کافیہ علم نحو میں مشہور درسی کتاب ہے جو تمام عربی مدارس میں داخلِ نصاب ہے۔ اور ہم اگر چاہیں تو کافیہ سے بہتر کتاب تصنیف کر دیں۔ لیکن جب ہمیں خدا سے تعلق پیدا کرنے کی خواہش دامنگیر ہوئی تو ہم نے اپنے سارے علم و فضل کو بالائے طاق رکھ دیا اور حاجی صاحب قبلہ رح کی غلامی اختیار کر لی"

ع وکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف ۱۲

پہلی رباعی ۱۹۷ برصفحہ

حل لغات:۔ قماش کثیر المعانی لفظ ہے۔ یہاں بمعنی ریشمی لباس مستعمل ہے۔ نقرہ و لعل و گہر سے دولت و ثروت مراد ہے۔ خوش گل بمعنی خوبصورت، زریں کمر وہ غلام جس کی کمر میں سونے کا پٹکا بندھا ہُوا ہو۔ سرمایہ بمعنی ساز و سامان یا شوکت و شان۔ اہلِ ہنر سے اللہ والے مراد ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ سے ملنے اور دوسروں کو اللہ سے ملانے کا طریقہ یا فن جانتے ہیں۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصوریہ ہے کہ اللہ والوں کی نگاہ میں ریشمی لباس

سونے چاندی، لعل و گوہر خدم اور حشم اور دیگر زخارف دنیوی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی
جس طرح ایک فاضل الٰہیات کی نظر میں آمد نامہ کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی
اللہ والے بھی اسی طرح دونوں جہاں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور یہ شانِ بے نیازی
ہی دو فقر کا ثمرہ ہے، ان کا سب سے بڑا سرمایہ یا سامان ہوتا ہے، جس
طرح دنیا والے، دولت پر فخر کرتے ہیں، اللہ والے اپنی شان بے نیازی پر نازاں
ہوتے ہیں ۱۲ ؎

دوسری رباعی نمبر ۱۹۷

حل لغات :- خودی را یعنی خودی کے حق میں یا اس کی تربیت کے لئے ؎
نشۂ من یعنی میری تعلیم ؎ عین ہوش است یعنی حصول معرفت کا ذریعہ ہے ؎
ازاں یعنی یہی وجہ ہے کہ ؎ میخانۂ من کم خروش است یعنی میری درسگاہ میں
یا میرے طریقۂ تعلیم میں ہنگامہ بالکل نہیں ہے یعنی میں مسلمانوں کو قوالی،
جلسوں، جلوسوں اور نعروں کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ان کو یہ تلقین کرتا ہوں کہ
خلوت میں بیٹھ کر اپنی خودی کی تربیت کرو ؎ مئے من یعنی میری تعلیم یا تلقین ؎
گرچہ ناصاف است یعنی اگرچہ تمہیں اچھی نہیں معلوم ہوتی یا بظاہر کوئی دل
کشی نہیں ہے ؎ درکش لفظی معنی ہیں غٹ غٹ پی جا مراد ہے میری تعلیم پر
عمل کرو ؎ واضح ہو کہ "ناصاف" کے لفظی معنی ہیں بے چھنی ہوئی شراب بدیں
وجہ اس میں نشہ زیادہ ہوتا ہے، اسی سے اردو زبان میں یہ محاورہ پیدا ہوا کہ
"میں نے اُسے بے چھنی پلائی" یعنی ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ وہ میرا ہم خیال
ہو گیا ؎ تہ جرعہ لغوی معنی تلچھٹ، یہاں مراد ہے اصلی تعلیم ؎ خمہائے
دوش لغوی معنی پرانی شراب کے مٹکے، مراد ہے ؎ میخانۂ یثرب یعنی اسلام کی تعلیم

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اے میرے دوستو! در عقیدت مندوا میں نے اپنی شاعری میں خالص یثربی اسلام پیش کیا ہے۔

نوٹ:۔ اس رباعی میں اقبال نے شراب کا تلازمہ ایسے دلکش انداز میں باندھا ہے کہ محض رباعی کے پڑھنے سے سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ نشہ، ہوش، میخانہ، کم خروش مئے، ناصاف، دردکش، تہ جرعہ، خمہائے دوش، سب الفاظ باہم دگر مربوط ہیں۔

اس تلازمہ ہی سے رباعی میں رمزیہ شاعری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اور میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں کہ اقبال رمزیہ شاعری کا بادشاہ ہے اور جملہ صنایع و بدایع لفظی و معنوی مثلاً تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل اور مجاز عقلی یہ سب رمزیہ شاعری کی کنیزیں ہیں جو ہر وقت اس کی خدمت کے لیے دست بستہ حاضر رہتی ہیں۔

پہلی رباعی نمبر ۱۹۸

حل لغات:۔ تُرا۔ اس لفظ سے عامۃ المسلمین مراد ہیں۔ خرقہ۔ کنایہ ہے دنیا پرست صوفیوں سے۔ عمامہ۔ کنایہ ہے ظاہر پرست علماء سے۔ کالیے یعنی مسلمان عموماً ان لوگوں کے گرویدہ ہیں۔ من از خود یافتم الخ لیکن میں نے اپنی خودی کی وساطت سے خدا کی معرفت حاصل کی۔ اس مصرعہ میں اقبال نے اپنا پورا فلسفہ خودی بند کر دیا ہے، چنانچہ زبدہ نظم میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

ہمیں یک چوب نے الخ یعنی میرا سرمایۂ حیات صرف عشقِ رسولؐ ہے نہ چوبِ منبر الخ یعنی نہ میں عالم ہوں نہ صوفی ہوں بلکہ مرشد رومیؒ کا متبع اور مقلد ہوں۔ مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر خدا سے ملنے کی آرزو ہے تو عشقِ رسولؐ اختیار کرو۔

دوسری رباعی ص۱۹۵

حلِ لغات: چو دیدم جوہرِ آئینۂ خویش یعنی جب مجھے اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کا علم حاصل ہوگیا۔ گرفتم خلوت اندر سینۂ خویش۔ تو میں نے اپنی خودی کی تربیت پر اپنی تمام توجہ مبذول کردی۔ خلوت گرفتن کنایہ ہے مراقبہ اور مجاہدے سے۔ ازیں دانشورانِ کور و بے ذوق۔ اس مصرعہ میں صوفی اور ملّا کی طرف اشارہ ہے۔ صوفی کو "کور" اس لئے کہا کہ آجکل کے اکثر دنیا پرست صوفی شریعت اور طریقت دونوں سے بیگانہ ہوتے ہیں (الا ما شاء اللہ) ملّا کو "بے ذوق" اس لئے کہا ہے کہ ملّا عموماً مسلکِ عشق کی اہمیت سے بے خبر ہوتے ہیں یا عشق کی لذت سے محروم ہوتے ہیں۔ رمیدم با غمِ دیرینۂ الخ یعنی صوفیوں اور ملّاؤں دونوں سے قطع تعلق کرکے مسلکِ عشق اختیار کرلیا۔ غمِ دیرینہ کنایہ ہے عشق سے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور دوسرے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی گرفتم خلوت اندر سینۂ خویش واضح ہو کہ اس مصرعہ میں اقبالؔ نے سلوکِ مُقیّدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی تفصیل تو میں اپنی تالیف اقبالؔ اور تصوف میں درج کروں گا۔ یہاں مختصر طور پر اس قدر کافی ہے کہ تصوف میں خدا رسی کے مشہور اور متداول طریقے دو ہیں۔ ایک کو سلوکِ مقیدہ کہتے ہیں اور دوسرے کو سلوکِ مطلقہ۔ سلوکِ مقیدہ کی صورت یہ ہے کہ اس طریقہ میں سالک اپنے آپ کو اپنے آپ میں قید کرتا ہے۔

اسی قید کرنے کو اقبال نے "اندر سینۂ خویش خلوت گرفتم" سے تعبیر کیا ہے۔ جب تک سلوک مقیدہ کے طریقہ سے آگاہی نہ ہو، اس مصرعہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا، چنانچہ اس مصرعہ کے لفظی ترجمہ پر غور کیجئے "میں نے اپنے سینہ کے اندر خلوت اختیار کی" اس عبارت سے ایک عامی جس کو سلوک مقیدہ سے آگاہی نہ ہو، کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ فی الجملہ سلوک مقیدہ میں سالک، اپنے قلب کو مرکز توجہ بناتا ہے۔ اور اس مرکز کی بدولت کامیابی حاصل کرتا ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ ایک مدتِ معیّنہ تک، جو ہر شخص کے حالاتِ باطنی کے لحاظ سے طویل یا مختصر ہو سکتی ہے، قلتِ طعام، قلتِ کلام، قلتِ منام اور قلتِ صحبتِ بالا نام کے ذریعہ سے اپنے قلب کی مخفی طاقتوں کو بیدار کرتا ہے اور مجاہدہ کی بدولت ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے پھر اس باطنی طاقت کی بدولت، ساری کائنات کو اپنے اندر گم کرنا شروع کرتا ہے، چنانچہ اس شعر میں اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

قصہ مختصر جب وہ اس دوسری منزل کو طے کر لیتا ہے تو اُس پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ ساری کائنات میرے اندر ہے اور میں خدا کے اندر ہوں یہی وہ حالت ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں عرفانِ حقیقی کہتے ہیں۔ اس تیسری منزل کو طے کرنے کے بعد سالک صحرا، خلوت، مراقبہ اور مجاہدہ سب کو ترک کر دیتا ہے اور جلوت یعنی عائلی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور شریعت اسلامیہ کی اشاعت اور حمایت میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں بار بار ہوائے دشت، خلوت، مراقبہ، مجاہدہ اور آہِ سحرگاہی کا تذکرہ کیا ہے، کیونکہ یہ سب اس سلوک کے لوازم ہیں۔

نکتہ:۔ اس جگہ اربابِ ذوق کی تفننِ طبع کیلئے یہ نکتہ بیان کرتا ہوں کہ گو نم بدھ اس

منزل تک تو پہنچ گیا تھا کہ ساری کائنات میرے اندر گم ہے لیکن وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکا کہ میں خود، انائے مطلق (خدا) کے اندر گم ہو جاؤں۔ اس نے اسی منزل کو منتہائے کمال سمجھ لیا اور اعلان کر دیا کہ مجھے "عرفان" حاصل ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی تعلیم میں کہیں خدا کا تذکرہ نہیں کیا :

پہلی رباعی بر ۱۹۹

مطلب :- یہ رباعی اقبال نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر کہی تھی۔ اس کا مطلب تو بالکل واضح ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ وفات سے کچھ دنوں پہلے مرحوم کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ قوم نے مجھے محض ایک شاعر سمجھا، اس لئے میرے پیغام کی طرف متوجہ نہ ہو سکی۔ اس تلخ احساس نے ان کو اس پیشین گوئی پر آمادہ کیا کہ جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا تو جو لوگ زندگی میں میرے پاس آتے جاتے رہے ہیں۔ وہ کہا کریں گے کہ ہم سے اقبال کے بڑے گہرے تعلقات تھے وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس آنے والوں میں سے کسی نے بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے کیا پیغام دیا، اور کس کو اپنا مخاطب بنایا تھا اور میرا حقیقی مقام کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آخری مصرعہ میں اقبال نے اپنی پوری لائف تین لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے وہ ایک مردہ قوم میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر میں اس مصرعہ کی شرح کرنے لگوں تو مرحوم کی پوری داستانِ حیات قلمبند ہو جائے گی۔ اس لئے مجبوراً یہیں قلم روکتا ہوں۔ صرف ایک بات لکھتا ہوں کہ جو قوم خدا کے کلام کو نہیں پڑھتی وہ کسی انسان کے کلام کی طرف کیا متوجہ ہو سکتی ہے؟

دوسری رباعی بر ۱۹۹

مطلب :- اگر مسلمان، عاشقِ رسول صلعم اور پاک باطن ہے تو وہ مفلسی میں بھی

امیر ہے اس کے مقابلہ میں اگر ایک دولتمند، دین اور عشق رسول سے محروم ہے تو اس کے جسم پر ریشم کا لباس بالکل ایسا ہے جیسے کسی گدھے کے اوپر ریشم کا پالان پڑا ہوا ہو۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ جس طرح "پالانِ حریر" سے گدھا، انسان نہیں بن سکتا، اسی طرح "خلعتِ ہفت پارچہ" سے کوئی بیدین و دانش دولتمند انسان نہیں بن سکتا۔ لہٰذا مسلمان کا ذہنی منصبی یہ ہے کہ وہ دین و دانش یعنی اسلام اور عشق رسولؐ ان دو خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرے، لباس سے کسی انسان کا مرتبہ بلند نہیں ہو سکتا۔

پہلی رباعی برت

مطلب: کہتے ہیں کہ اے نادان مسلمان! جب تو دنیاوی عزت یا خطاب حاصل کرنے کے لئے بادشاہوں (انگریزوں) کو سجدہ کرتا ہے تو تجھے اس بات کا مطلق احساس نہیں ہوتا کہ تیرے اس مشرکانہ فعل سے اسلام کی توہین بلکہ رسوائی ہوتی ہے۔ پس میں تجھے اسلام کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو فرنگی کو اپنا حاجت روا مت سمجھ۔ اس کے آگے ہاتھ مت پھیلا۔ خدا کے لئے اپنے دل سے اس ناپاک بت کو نکال کر باہر پھینک دے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ جو مسلمان، غیر اللہ کے پاس اپنی حاجت لیکر جاتا ہے وہ دراصل مشرک اور بت پرست ہے۔

نوٹ: — اس رباعی سے ناظرین کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کو "فرنگی" سے کس قدر نفرت تھی اور مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم کو ابھی تک اس بت سے وہی اُلفت ہے جو پہلے تھی۔ چنانچہ "دیارِ مغرب" سے اگر کوئی لیڈی ڈاکٹر، تشخیص مرض یا تفتیش نسل کے لئے آتی ہے تو ہم اس کی راہ میں

آنکھیں بچھانا، اپنے لئے باعثِ صد افتخار سمجھتے ہیں، اور مطلق محسوس نہیں کرتے کہ وہ تو یہ دیکھنے آئی ہے کہ مریض کو کس قسم کی "دوائی" کی ضرورت ہے ۱۲

دوسری رباعی بر صفحہ ۲

مطلب:- میں نے ایک بڑے عقلمند اور روشن ضمیر صاحب باطن بزرگ سے یہ نکتہ سیکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان مفلسی کے باوجود اپنی خودی کی حفاظت کر سکے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے، کسی سے توقع نہ رکھے تو ایک دن وہ ساری کائنات پر حکمران ہو جائیگا۔ بلکہ دنیا کے علاوہ عقبیٰ کا مالک بھی ہو جائے گا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی مفلسی کیوں نہ ہو، حد یہ ہے کہ نانِ شبینہ بھی میسر نہ ہو، لیکن مسلمان کو چاہیئے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔

نوٹ:- ہمارے تمام بزرگانِ دین کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی لیکن بادشاہوں اور نوابوں کے آگے ہاتھ پھیلانا تو بڑی بات ہے، اگر انہوں نے جاگیر یا دولت خود بخشش کی تو بھی اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مثلاً جب نواب محمد امیر خاں صاحب مرحوم والیٔ ٹونک نے، پانچ گاؤں کی جاگیر کا فرمان سیدی شاہ غلام علی صاحبؒ خلیفہ حضرت مرزا جانِ جاناں مظہرؒ کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے اس کی پشت پر یہ مصرعہ لکھ کر واپس کر دیا تھا۔

ع با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است ۱۲

پہلی رباعی بر صفحہ ۲۰

حل لغات:- اندر دو حرفے یعنی صرف ایک جملہ میں۔ سرِ کار:- یعنی کامیابی کا طریقہ۔ منبر کنایہ ہے واعظانہ زندگی سے۔ دار:- کنایہ ہے مجاہدانہ

زندگی سے ؛ براہیماں کنایہ ہے عاشقانِ خدا سے ؛ نمرو داں کنایہ ہے دشمنانِ خدا سے ؛ عودِ خام بمعنی خالص اور عمدہ قسم کی عود کی لکڑی جس کی شناخت یہ ہے کہ آگ میں ڈالی جائے تو خوشبو دے۔ کنایہ ہے مردِ مومن سے ؛ آتش میں تلمیح ہے آتشِ نمرود کی طرف جس میں امام الانبیاءؑ سیدنا حضرت ابراہیمؑ کو ڈالا گیا تھا۔ لیکن یہاں کنایہ ہے مصائب و آفات و بلیّات سے ؛ عیار بمعنی کسوٹی ؛

مطلب:- یہ میری رائے میں ارمغان کی بہترین رباعیوں میں سے ہے۔ اس کا دوسرا مصرعہ اس رباعی کی جان ہے اور بلاشبہ بلاغت کی کان ہے۔ منبر اور دار کا تقابل، اقبال کا محبوب موضوع ہے۔

اقبال ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر عاشقی کا سودا ہے تو پھر مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مقام عشق یعنی عاشقانہ زندگی میں یہ نہیں ہوگا کہ جمعہ کے دن خط بنوایا، غسل کیا، لباس فاخرہ پہنا، خوشبو لگائی، آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کھینچی، داڑھی میں کنگھی کی، دسترخوان پر بیٹھ کر مکہ مدینہ میں جھاڑ دی، شیروانی پر عبا زیب تن کی، خراماں خراماں مسجد میں آئے، منبرِ رسولؐ پر جلوہ گر ہو کر تقریر کی، اس کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں "بقائے سلطنت" کی دعا مانگی اور نماز پڑھا کر واپس آ گئے۔ اس کے بجائے ہر وقت سر بکف اور کفن بر دوش رہنا ہوگا۔

ع عاشقی شیوۂ رنداں بلاکش باشد

دوسرے شعر میں عاشق کی سائیکالوجی (نفسیاتی کیفیت) بیان کی ہے۔ کہ سچا عاشق کبھی دشمنانِ خدا سے خوفزدہ نہیں ہوتا جس طرح عود خالص کا جوہر آگ میں پڑ کر عیاں ہوتا ہے، اسی طرح مومن کے ایمان کا کمال میدانِ جہاد میں جانے کا مشتاق رہتا ہے جس طرح شاعر مشاعرہ میں شرکت کے لئے بیقرار رہتا ہے۔ بنیادی تصور دوسرے مصرعہ میں مذکور ہے یعنی مقام عشق منبر نیست دار است ۱۲

دوسری رباعی بر ۲۰۱

مطلب:- اے مسلمان! کسی انسان سے استمداد مت کر کسی انسان سے توقعات مت باندھ، بلکہ میری طرح، اپنی خودی کو مستحکم کر، جو کچھ مانگنا ہو اپنی خودی سے مانگ۔ از درونِ خویش یار بخواستن کے دو معنی ہیں:-
(۱) باہر تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا غیر سے طلب کرنا سراسر نادانی ہے (صوفیانہ توجیہہ ہے)
(۲) غیر سے سوال کرنے سے خودی ضعیف ہوجاتی ہے۔ (یہ فلسفیانہ توجیہہ ہے)
اے مسلمان! دنیا میں ہر مصیبت کا مقابلہ کر، لیکن ہر حال میں "داغِ کہن" کی حفاظت کر یعنی مسلکِ محبت پر قائم رہ۔ اس کی یاد سے غافل مت ہو۔
بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں مسلکِ عشق پر قائم رہے ؏

پہلی رباعی بر ۲۰۲

مطلب:- میں نے ایک بزرگ سے یہ دو نصیحتیں سُنی تھیں وہ آج تک یاد ہیں۔ پہلی نصیحت یہ ہے کہ اپنی زندگی دوسروں کے سہارے مت بسر کر یعنی اعتماد علی النفس زندگی کی پہلی شرط ہے، جو شخص دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے وہ کبھی انسانیت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔
دوسری نصیحت یہ ہے کہ اُس ذلیل شخص سے دور رہو، جو اپنے جسم کی آسائش کے لئے اپنی "جان" کو ہندو یا انگریز کے گھر گروی رکھدے۔ یعنی وزارت کیلئے حافظِ قرآن ہو کر محمدؐ اور ابراہیمؑ کے مسلک سے منحرف ہوجائے خطاب کیلئے مسلمان ہو کر ملتِ اسلامیہ سے غداری کرے ؏

بنیادی تصوّر۔ دوسرے اور چوتھے مصرعہ میں مذکور ہے ؛

دوسری رباعی برصفحہ ۲۲

مطلب :۔ ایک مردِ مومن (موجِ بیقرار) نے ایک بے عمل مسلمان (ساحل) سے یہ کہا کہ میں تو ہمیشہ فرعون کا مقابلہ کر کے اپنی طاقت کا امتحان کرتا ہوں اور میری زندگی کبھی ان دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتی :۔

یا تو میں اپنی خودی کی تربیت (مجاہدۂ نفس) میں مصروف رہتا ہوں۔ یا میں دشمنانِ اسلام سے مقابلہ کرنے کا منتظر رہتا ہوں ؛

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ مومن ہر وقت مصروفِ جہاد رہتا ہے یا میدانِ جنگ میں کفار (خارجی دشمن) سے الجھتا ہے یا گھر آکر نفس امارہ (باطنی دشمن) سے لڑتا ہے۔ بہرصورت جب تک زندہ رہتا ہے جہاد ہی میں مصروف رہتا ہے ؛

پہلی رباعی برصفحہ ۲۳

حل لغات :۔ اگر ایں آب و جاہ الخ یعنی اگر تیری یہ جاگیر، یہ دولت، یہ خطابات، یہ مُربعے، یہ عہدے، یہ تمغے، یہ کرّ و فر، یہ شان و شوکت، یہ کوٹھیاں، یہ باغات اور نوکر چاکر جن پر تو ناز کرتا ہے یہ سب "آب و جاہ" انگریز (علیہ ما علیہ) کی عنایات کا صدقہ ہے تو پھر تیرا "اخلاقی" فرض یہی ہے کہ تو اس کو اپنا معبود سمجھے اور ہر وقت اس کے سامنے سربسجود رہے بلکہ اسمبلی میں صاف لفظوں میں اعلان کرے کہ انگریز سے غداری کرنا گویا اللہ اور اس کے رسولؐ سے غداری کرنا ہے ؛

سر ہیں را ہم بچوبش دہ الخ لیکن اے انگریز پرست مسلمان! صرف سجدہ تو کافی نہیں ہے۔ انگریزوں کے جوتے بھی تو برداشت کر، بلکہ چوتڑوں پر ڈنڈے بھی تو کھا۔

آخر جو شخص اپنے گدھے کو "پالان" عطا کرتا ہے۔ اس کا، اُس گدھے پر کچھ حق بھی تو ہوتا ہے یعنی ہر گدھے والا، اپنے گدھے کے چوتڑوں پر ڈنڈے بھی تو رسید کرتا ہے ؛
بنیادی تصوّر کسی "تجربکار" شخص سے دریافت کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

ع شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ؟

نوٹ:۔ اس رباعی کا بنیادی تصور تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن یہ ضرور سمجھ میں آگیا کہ اقبال کو انگریز پرستوں سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اُن کو کالحمار سمجھتے تھے۔ اور قرآن حکیم تو انہیں حمل ھُم اَضَلّ قرار دیتا ہے، یعنی حمار سے بھی بدتر ؛

دوسری رباعی بر ۲۰۳

مطلب:۔ چونکہ اقوام فرنگ (انگلیس، فرنسیس، ولندیزی، اطالوی وغیر ذالک) نہایت ظالم دغاباز، فریبی اور عیّار ہیں اسلئے دُنیا میں کوئی شریف آدمی اُن سے محبّت نہیں کر سکتا۔ اُن کی حکومت لوگوں کے جسموں پر تو بیشک ہے لیکن ایک دل بھی ان کا مطیع نہیں ہے، اور اُن کا سرمایۂ حیات صرف یہ دُنیا ہے جو چند روزہ ہے۔ دین اور آخرت سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ یعنی دین سے غافل ہیں اور دُنیا پرستی میں غرق ہیں۔ ان میں سے ہر قوم خدائی کی مدعی ہے، لیکن اُن کی مثال اُس خدا کی سی ہے جس کی بارگاہ کا طواف کرنے والوں میں، ابلیس تو سینکڑوں ہوں، لیکن جبریل ایک بھی نہ ہو ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ اقوام یورپ، بلا استثنائے احدے، ابلیس کی متبع اور مرید ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات سے کبھی کوئی کارِ خیر ظہور میں نہیں آتا ؛

پہلی رباعی بر ۲۰۴

حلِ لغات:۔ من و تو سے ملت اسلامیہ مراد ہے بحیثیتِ مجموعی ؛ از دل و

دیں الخ یعنی نہ عشق رسولؐ کا رنگ ہے نہ شریعتِ اسلامیہ کا پاس ہے ؛ زاصل خود سے اسلام مراد ہے یعنی ہم اسلام سے اُسی طرح دُور ہو گئے ہیں جس طرح خوشبو پھول سے دُور ہو جاتی ہے ؛ دلِ ما مُرد۔ یعنی ہمارے زوال کا اصلی سبب یہ ہے کہ ملوکیت کی بدولت، عشق رسولؐ کا جذبہ فنا ہو گیا۔

واضح ہو کہ ملوکیت اور عشق رسولؐ آپس میں ضدّیں ہیں۔ مثلاً حضرتِ عالمگیرؒ چونکہ عاشق رسولؐ اور شیدائے اسلام تھے، اسلئے ملوکیت سے کوسوں دُور تھے شہنشاہ ہونے کے باوجود اپنی قوت لایموت ٹوپیاں سی کر فراہم کرتے تھے ؛ دیں از مردنش مرد۔ مردنش میں ش کا مرجع دل ہے۔ فی الجملہ جب دل مر گیا تو قدرتی طور پر کچھ عرصہ کے بعد دین بھی زندگی سے خارج ہو گیا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جو شئے انسان کو اتباعِ دین پر مائل کر سکتی ہے وہ جذبہ عشق رسولؐ ہی تو ہے، اگر یہ جذبہ فنا ہو جائے تو مسلمان اپنی بیوی، دُکان، دفتر یا کلب چھوڑ کر میدانِ جہاد کی طرف کیسے اور کیونکر اور کس طرح جا سکتا ہے ؟ دو تا مرگ یعنی ایک چھوڑ دُو دُو موتیں ؛ بیک سودا یعنی عمل واحد لفظ سودا اس جگہ بہت موزوں ہے، کیونکہ (۱) خریدنے کی رعایت سے "سودا" کا استعمال بہت مناسب ہے۔ (۲) سودا، حماقت کو بھی کہتے ہیں اور دراصل یہی مفہوم مراد ہے ؛ کیونکہ اس سے بڑی اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ مسلمان عشق رسولؐ سے بیگانہ ہو جائے ؟ مسلمان تو پیدا ہی اسلئے ہوا تھا کہ وہ عشق کریگا۔ پس جب اُس نے عاشقی ترک کر دی تو دوسرے لفظوں میں وہ مقصدِ حیات ہی سے بیگانہ ہو گیا ؛

بنیادی تصوّر:۔ جب مسلمان نے عشق رسولؐ ترک کر دیا تو اس کا دل بھی مر گیا اور دین بھی گویا ایک سودے میں دو موتیں خرید لیں ؛

نوٹ:۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کچھ عرصہ سے ایک ٹکٹ میں دو مزے کا عادی ہو گیا ہے ؛

دوسری رباعی بر صفحہ ۲۰۴

مطلب:۔ جو مسلمان، دین اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہے وہ کبھی غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ اور اس حق پرستی کی بدولت اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر آسمان اس کے منشاء کے مطابق گردش نہیں کرتا تو وہ زمین کو اپنی مرضی کے تابع بنا لیتا ہے۔

بنیادی تصور:۔ موحّد، کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔

پہلی رباعی بر صفحہ ۲۰۵

مطلب:۔ اے مسلمان! یہ دل چونکہ غیر مادی ہے اس لئے علائق دنیوی سے بیگانہ رہتا ہے۔ اس کی بیگانگی کا باعث یہ ہے کہ یہ اس دُنیا یا ذراتِ مادی کی پیداوار نہیں ہے۔ دل کی زندگی، مادی قوانین کی پابند نہیں ہے۔ دور آسمان سے قوانین فطرت مراد ہیں۔ فطرت کے قوانین جسم پر عائد ہو سکتے ہیں لیکن دل (روح) تو ایک وراء الماده ہستی ہے۔ دل سے حقیقتِ انسانی مراد ہے۔ اے مسلمان! ظاہری نماز کے لئے تو بے شک اوقات مقرر ہیں اور اسی لئے اوقات مقررہ پر مسلمانوں کو متنبہ یا متوجہ کرنے کے لئے اذان بھی دی جاتی ہے۔ لیکن عشق و مستی کی نماز کیلئے اذان نہیں ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اذان، وقت پر دلالت کرتی ہے اور عشق و مستی کی دُنیا میں زمان و مکان دونوں معدوم ہیں۔ اس لئے اے مسلمان! اگر تو نمازِ عشق پڑھنا چاہتا ہے تو اذان، مؤذن اور اوقات کا تصور دماغ سے نکال دے، کیونکہ عشق کی دُنیا میں ان میں سے کسی کا وجود نہیں ہے۔ یعنی تجھے نمازِ عشق کا وقت خود معلوم

کرنا ہوگا۔

بنیادی تصور:۔ اس رباعی کے دوسرے شعر میں جو معنویت کیفیت اور بلاغت پوشیدہ ہے، اس کی شرح تو میری لیاقت سے باہر ہے۔ ہاں بنیادی تصور لکھ سکتا ہوں کہ اے مسلمان! جہاد فی سبیل اللہ (نمازِ عشق) کے لیے غیر (موذّن) تجھے آمادہ نہیں کر سکتا۔ اگر تو جہاد (قیام) کا آرزومند ہے تو سربکف ہونے کی تیاری خود کرنی ہوگی۔

نوٹ:۔ شاعرانہ انداز بیان اور اس کی دلکشی سے قطع نظر کر کے غور کرو کہ اقبال نے اس شعر میں کتنی بڑی صداقت کو واضح کیا ہے۔ نماز ظاہری کے لئے بیشک اذان ہوتی ہے اور ہم دوسروں کے بلانے یا کہنے سننے سے مسجد کی طرف جا سکتے ہیں، لیکن نمازِ حقیقی (جہاد) کے لئے اذان نہیں ہوتی، کیونکہ اگر دل میں مرنے کی تڑپ نہیں ہے، شہادت کی آرزو نہیں ہے، تو کوئی طاقت ہم کو میدان جہاد کی طرف نہیں لے جا سکتی، اسی صداقتِ عظمیٰ کو اقبال نے اس غیر فانی مصرعہ میں نظم کیا ہے۔

ع نمازِ عشق و مستی را اذاں نیست

دوسری رباعی پر ۲۰۵

مطلب:۔ اے مسلمانو! اگر تم مقام عشق (شوق) حاصل کرنا چاہتے ہو اگر عاشقانہ زندگی بسر کرنی چاہتے ہو، تو اپنے اندر یقین پیدا کرو۔ صدیق اکبرؓ کا سا یقین، کہ سرکار دو عالم بلاشبہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ واضح ہو کہ جب تک دل میں صداقت پسندی کا مادّہ نہ ہو، یقین پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے علامہ اقبال مرحوم نے صدق کو یقین پر مقدم کیا۔ صدق، افضل البشر بعد الانبیاء جناب صدیق اکبرؓ کی نمایاں صفت ہے، اس لئے ہر وہ شخص جو یقین کا طالب ہو اسے

پہلے صدیق اکبرؓ کا سا صدق پیدا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ فیضانِ صدیقیؓ سے محروم ہے تو فیضانِ رسالت سے یقیناً محروم رہے گا۔

اے مسلمان! یقین تو صرف قرآن حکیم کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتا ہے صحبتِ روح الامین، کنایہ ہے "تلاوت وتدبر فی القرآن سے، اور اگر تیرے اندر صدق و یقین کا رنگ پیدا ہو جائے تو پھر بے کھٹکے تسخیر کائنات کے لئے نکل کھڑا ہو کوئی طاقت سدِّ راہ نہیں بن سکتی۔

بنیادی تصور:۔ مقدمات ذیل کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

(ا) مقصدِ حیاتِ مسلم، خلافتِ الٰہیہ ہے۔

(ب) خلافتِ الٰہیہ موقوف ہے تسخیر کائنات پر (سلطنت کے بغیر سلطان کیسا؟)

(ج) تسخیر کائنات موقوف ہے مقامِ عشق پر۔

(د) مقامِ عشق موقوف ہے صدق ویقین پر۔

(ہ) حصولِ یقین موقوف ہے صحبتِ روح الامین پر یعنی تلاوتِ قرآن پر)

نوٹ:۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف ۱۹۳۲ء سے مسلمانوں کو مطالعۂ قرآن کی طرف بلا رہا ہے۔ مطالعہ سے میری مراد وہی تدبر فی القرآن ہے جس نے جاہل عربوں کو ساری دنیا کا سردار اور معلم بنا دیا تھا۔ اور یہ سبق میں نے اقبال ہی سے تو سیکھا ہے، چنانچہ جاوید نامہ میں وہ فرماتے ہیں:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن میری قوم چونکہ صدیوں سے غیر قرآنی زندگی بسر کر رہی ہے، اس لئے بیس سال کی قلیل مدت میں ایک ہزار سال کی عادت کیسے بدل سکتی ہے؟

عادت جو پڑی ہو ہمیشہ کی وہ دور بھلا کب ہوتی ہے — پاکٹ میں چنوٹی رکھی ہی پتلون کے نیچے دھوتی ہے

پہلی رباعی پر ۲۰۶

مطلب: - مسلماں را ہمیں الخ عرفان کے لغوی معنی ہیں شناختن یا پہچاننا۔ اصطلاحی معنی ہیں کسی چیز کی حقیقت سے آگاہ ہوجانا۔ اسی لئے عرفان کا تعلق دل سے ہے۔ کیونکہ "حقیقت" صرف دل پر منکشف ہوسکتی ہے: ادراک کے لغوی معنیٰ ہیں پانا یعنی حصول الشیئ۔ اصطلاحی معنیٰ ہیں کسی شئی کی ماہیت کا بقدر طاقتِ بشری علم حاصل کرنا۔ اس کا تعلق چونکہ عقل سے ہے اسی لئے ادراک کبھی کامل نہیں ہوسکتا اور نہ انسان عقل کی مدد سے کسی شئی کی کُنہ سے واقف ہوسکتا ہے۔ مثلاً عقل انسانی، انسان کی ماہیت کا صرف اس قدر ادراک کرسکتی ہے کہ وہ حیوانِ ناطق ہے لیکن حیوان کیا ہے؟ حیوٰۃ کیا ہے؟ نطق کیا ہے اور نطق کا حیات سے ربط کیا ہے؟ عقل، ادراک، اور منطق تینوں ان سوالات کے جوابات سے عاجز ہیں۔

کہتے ہیں کہ بس مسلمان کے لئے عرفان اور ادراک کی انتہا یہی ہے کہ وہ رمزِ لولاک، خود اپنے اندر، واضح طور پر مشاہدہ کرلے۔ "لولاک" میں تلمیح ہے، اس مشہور حدیث کی طرف لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ ؕ یعنی اے میرے محبوبؐ! اگر میں آپؐ کو پیدا نہ کرتا تو کائنات کو بھی پیدا نہ کرتا۔ واضح ہو کہ یہاں "لَوْلَاکَ" میں واسطہ کا مفہوم پوشیدہ ہے یعنی حضور انورؐ واسطہ ہیں خالق اور مخلوقات کے درمیان، اور کاف میں دراصل حقیقتِ محمدیؐ یا حقیقت الحقائق سے خطاب ہے، جو اول المخلوقات ہے۔

مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے عرفان کی انتہا یہ ہے، کہ وہ فنا فی الرسولؐ ہوکر خود اس حدیث کا مصداق بن جائے یعنی جب وہ اپنے وجود کو حضورؐ کے وجود میں فنا کردیگا تو اُسے اس حدیث کا عرفان حاصل ہوجائے گا، کہ

واقعی اگر حقیقتِ محمدیہ واسطہ نہ ہوتی تو یہ کائنات پیدا نہ ہوتی۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ خدا تو تمام عرفا، عقلاء اور حکما کے نزدیک وراء الوراء ہے اُس کی ذات تک تو کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے ہمارا انتہائے عرفان یہ ہے کہ ہم کم از کم اُس کی معرفت تو حاصل کر لیں جس نے یہ فرمایا۔

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ ۔ یعنی اے خدا! ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم عاجز اور ناقص محدود عقل و خرد والے بندے تجھے اس طرح نہیں پہچان سکتے جس طرح پہچاننے کا حق ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ ذاتِ ایزدی تو بلا شبہ بالاتفاق وراء الفہم ہے اسلئے مومن کے عرفان کی انتہا یہ ہے کہ وہ ذاتِ محمدیؐ کا عرفان حاصل کرے۔ یہاں ذاتِ محمدیؐ سے حقیقتِ محمدیؐ کی طرف اشارہ ہے۔

حقیقتِ محمدیہؐ کی وضاحت تو "اقبال اور تصوف" میں پیش کروں گا۔ یہاں مختصر طور پر یہ لکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تو محض صاحبِ صفاتِ ایجابیہ ہے لیکن اس کائنات میں اُن صفات کے علاوہ صفاتِ سلبیہ بھی پائی جاتی ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے آگئیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو لطیف ہے اور یہ کائنات سراسر کثیف ہے، تو لطیف کو کثیف سے ربط کیسے پیدا ہوا؟ ان سوالات اور اسی قبیل کے دیگر سوالات کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حقیقتِ محمدیہ کو پیدا کیا جیسا کہ خود حضورؐ فرماتے ہیں۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ۔ یعنی سب سے پہلی شئی جو اللہ نے پیدا کی وہ میرا نور تھا۔ اس میں دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) چونکہ نورِ محمدی یا حقیقتِ محمدی پرتو تھا، نورِ مطلق کا اسلئے اسمیں صفاتِ ایجابیہ پائی جاتی تھیں۔ (۲) چونکہ یہ نور، مخلوق تھا، اسلئے اس میں صفاتِ سلبیہ بھی موجود ہوگئیں۔ پس یہ حقیقتِ محمدیہؐ، برزخِ کبریٰ ہے یعنی خالق اور مخلوقات کے مابین واسطہ ہے۔

اسی کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو اپنے نور سے پیدا کیا۔ یہ اصلی مفہوم ہے۔ لَوْلَاکَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ کا۔

یہ حقیقت الحقائق جب کائنات میں جلوہ گر ہوئی تو مصلحتاً ایک فرد کامل میں جلوہ گر ہوئی، کیونکہ یہ حقیقت الحقائق چونکہ نور ایزدی کا عکس ہے، اگر براہِ راست، بلا واسطۂ جسدِ عنصری ظاہر ہو جائے تو ساری کائنات فنا ہو جائے۔ جب حضرتِ موسیٰ تاب نہ لا سکے تو دوسروں کی کیا ہستی ہے؟

نوٹ:۔ اس جگہ اہلِ علم کی لطف اندوزی کے لئے ایک نکتہ بیان کرتا ہوں کہ تجسیم یا اوتار کے عقیدہ پر عقلی اعتراض یہی تو ہے کہ اگر خدا، خود بشکلِ انسان، جلوہ گر ہو جائے تو کائنات کا وجود کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ جب تک سورج اور آنکھ کے درمیان کوئی "واسطہ" نہ ہو آنکھ سورج کی چمک کی تاب نہیں لا سکتی، تو مخلوقات اُس نورِ مجرد (خدا) کی کس طرح "تاب لا سکتی ہے؟ انسان کی کیا طاقت ہے کہ خدا کو اس مادّی آنکھ سے دیکھ سکے؟

علاوہ بریں جب خدا محدود ہو گیا تو وہ بیچارہ خدا ہی کہاں رہا، اُس پر خدائی کا اطلاق کرنا خود اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے۔

اب میں حقیقتِ محمدؐیہ کی حیثیت کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھاتا ہوں۔

(الف) اللہ کے علمِ ازلی کو فلم فرض کیجئے۔

(ب) اُس کی صفتِ تخلیق کو مشین فرض کیجئے۔

(ج) فوکس اور فلم کے درمیانی فاصلہ کو حقیقتِ محمدؐیہ فرض کیجئے۔

واضح ہو کہ از روئے سائنس، فوکس اور فلم کے درمیان فاصلہ لازمی ہے، ورنہ تصویر واضح نہیں ہوگی۔

اللہ کے علمِ ازلی کی روشنی اسی فاصلہ کے واسطہ سے فلم میں نفوذ کرتی ہے

اور وہاں سے پردہ (اسکرین) پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔

(۵) اور عالمِ شہادت کو اسکرین فرض کیجئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ جو واحدِ حقیقی ہے، حقیقتِ محمدیہ کے واسطہ سے اپنے علمِ ازلی کے مطابق، عالمِ شہادت میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے، یعنی:۔

(۱) فلم، اللہ کا علمِ ازلی ہے۔

(۲) مشین، اللہ کی صفتِ تخلیق ہے۔

(۳) فاصلہ (حقیقتِ محمدیہ) اللہ کا معلومِ اوّل ہے۔

(۴) اسکرین (پردۂ فلم) اللہ کا ظہور ہے۔

یعنی اوّل سے آخر تک اللہ ہی اللہ ہے۔ اسی لئے قرآن مجید فرماتا ہے:۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷ : ۳)

وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے (وہی ہر شئے کا) ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر شئے کی حقیقت کو جاننے والا ہے۔

ع اشیاء ہیں سب مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

دوسری رباعی بر طبق ۲۰۶

مطلب:۔ اے مسلمان! تو نے اپنی حماقت کی بدولت فرنگی بتوں کی پرستش شروع کر دی یعنی انگریزوں کی غلامی قبول کر کے اپنے اوپر روحانی موت وارد کر لی۔ افسوس ہے تجھ پر کہ مسلمان ہو کر تو نے بزدلوں کی موت گوارا کر لی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تیری عقل عشقِ رسولؐ کی قیمت اور اہمیت سے بالکل بے خبر ہے اور تیرا دل عشقِ رسولؐ کے جذبہ سے بالکل خالی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے انگوروں کی اُس بیل سے کشید کردہ شراب نہیں پی، جو تیرے بزرگوں نے لگائی تھی۔ اس کے بجائے

تو وہائٹ ہارس اور جانی واکر کا رسیا بن گیا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر مسلمان، اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتا رہتا تو جان دے دیتا۔ مگر انگریزوں کی غلامی قبول نہ کرتا:

پہلی رباعی بر ص۲۰

حل لغات:۔ خودگر بمعنی اپنی خودی کی تربیت کرنے والا: خودگداز۔ یہ خودگری کا ایک طریقہ ہے۔ یعنی عشق رسولؐ میں اپنے کو فنا کرنے والا:

مستِ ناز اندر نیاز۔ یہ بہت بلیغ ترکیب ہے، یعنی وہ عاشق جو اپنی نیازمندی یا شانِ نیاز پر نازاں ہو سکے با لفاظِ دگر ساری دُنیا سے مُستغنی ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایسی شان نیاز دکھائے کہ معشوق خود اس پر نازاں ہو۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ کمال نیاز کی بدولت درجہ محبوبی حاصل کرلے یعنی معشوق خود اس پر عاشق ہو جائے جس طرح سیدی حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے عاشق امیر خسروؒ پر ناز کرتے تھے: قبائے لاالہ کنایہ ہے مسلک عاشقی سے: خونیں قبا کنایہ ہے سرفروشی اور جاں سپاری سے: نامرداں۔ کنایہ ہے دُنیا پرستوں سے: کہ بر بالائے نامرداں دراز است:۔ یعنی طالبِ دُنیا، طالب مولیٰ نہیں بن سکتا:

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ جب تک سرفروشی کا جذبہ پیدا نہ ہو، مسلمان حقیقی معنی میں موحد یا عاشق نہیں بن سکتا۔ یعنی لاالہ الا اللہ کے اقتضاء پر عمل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ توحید الٰہی کا مدعی وہ شخص ہو سکتا ہے جو ہر وقت خدا کی راہ میں سر کٹانے کے لئے تیار رہے:

دوسری رباعی بر ص۲۰

حل لغات:۔ از سوز وجودش۔ وجودش میں "ش" کا مرجع ذاتِ مومن

ہے۔ یعنی مومن وہ ہے جو ہر وقت اپنے عشق کی آگ میں جلتا رہے۔ کشود ہر چہ نیست تمنّد الخ یعنی دُنیا میں ہر مشکل کا حل، مومن کی جد وجہد پر موقوف ہے یا کائنات کا عروج اس کے عمل سے وابستہ ہے۔ جلال کبریائی در قیامش الخ یہ بہت بلیغ شعر ہے اور اس کی بلاغت قیام اور سجود، ان دو لفظوں میں پوشیدہ ہے

(۱) اگر قیام اور سجود سے ارکانِ نماز مراد لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ جب وُہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اُس کے قیام سے جلال کبریائی کا رنگ ٹپکتا ہے۔ اور جب وُہ سجدہ میں جاتا ہے تو اس کے سجدہ سے جمال بندگی عیاں ہوتا ہے۔ اگر قیام سے جہاد اور سجدہ سے مومنانہ طرزِ حیات مراد لی جائے (جو در اصل شاعر کی مراد ہے) تو مطلب یہ ہوگا کہ جب مومن، میدانِ جہاد میں سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے، تو اس کی شمشیرزنی سے جلالِ خداوندی ظاہر ہوتا ہے یعنی وہ باطل کو فنا کر دیتا ہے، اور جب وُہ اللہ کے بندوں سے برتاؤ کرتا ہے تو اُس کے طرزِ عمل سے جمال بندگی عیاں ہوتا ہے۔ یعنی وہ بنی آدم کے لئے رحمت ثابت ہوتا ہے۔

مطلب واضح ہے اور بنیادی تصور یہ ہے کہ مومن کی زندگی جلال اور جمال کی مظہر ہوتی ہے۔

پہلی رباعی بر ۲۰۸

مطلب:۔ اے مخاطب! تو مومن کی نماز کا بھلا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ نہ تو اندازہ کر سکتا ہے اور نہ میں اس کی کیفیت لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں۔ بس یہ سمجھ لے کہ اس کے ارکانِ نماز (رکوع وسجود) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وُہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اقبالؔ نے لفظِ "محرمانہ" استعمال کر کے دریا کو ایک کوزہ

میں بند کر دیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی طرف کہ نماز ایسی پڑھو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ حالت میسّر نہ ہو سکے تو کم از کم ایسی پڑھو گویا خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اقبالؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے اس حدیث کے پورے مفہوم کو ایک لفظِ محرمانہ سے ادا کر دیا ہے۔ یہاں اس لفظ کے بجائے دوسرے الفاظ بھی رکھے جا سکتے ہیں لیکن جو بات اس لفظ کی بدولت پیدا ہو گئی ہے وہ دوسرے کسی لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ "محرم" اُسے کہتے ہیں جو دوسرے کے رازِ دلی سے واقف ہو۔ اور اربابِ بینش جانتے ہیں کہ نماز کہتے ہی ہیں خدا سے ربطِ قلبی پیدا کرنے کو۔ اگر بحالتِ نماز، نمازی کے اندر یہ رنگ پیدا نہ ہو تو وہ جسمِ بے روح ہے۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے دوسرے شعر میں واضح کیا ہے کہ نمازِ عاشقانہ کی شان یہ ہے کہ جب مومن زبان سے ایک دفعہ "اللہ اکبر" کہتا ہے تو اس کی شان و شوکت ہماری ساری عمر کی نمازوں سے برتر اور افضل ہوتی ہے۔ یہی نکتہ اس رُباعی کا بنیادی تصور ہے ؛

دوسری رباعی برص ۲۰۸

مطلب :۔ مومن کی نمازِ عاشقانہ کی شان یہ ہے کہ جب وہ قرأت کرتا ہے تو گویا ساری دُنیا کو اسلام کی دعوت دیتا ہے یعنی اس کی قرأت اُسے اشاعتِ اسلام پر آمادہ کر دیتی ہے اور اس کے اندر تبلیغِ حق کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے، حق تو یہ ہے کہ اگر مسلمان، نمازِ عاشقانہ ادا کرے تو زندۂ جاوید ہو سکتا ہے، اس زمانہ کے مسلمان اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتے کہ جب مومن نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ایوانِ کفر میں زلزلہ برپا ہو جاتا

ہے۔ یعنی مومن جب نماز میں اللہ تعالیٰ سے یہ کہتا ہے کہ میں صرف تیری عبادت کرتا ہوں تو جب وہ نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس قول کے اقتضاء پر عمل بھی کرتا ہے۔ وہ ہماری طرح منافقانہ زندگی بسر نہیں کرتا کہ ہم خدا سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے سوا کسی کی اطاعت (عبادت) نہیں کرتے لیکن جب نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سب کی اطاعت کرتے ہیں اور اکثر اوقات خدا کی اطاعت سے بھی بڑھ کر۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ اس "عصرِ بے سوز" میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان، مومن کی نماز کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ نماز کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے سوا کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

پہلی رباعی بر ص ۲۰۹

مطلب:۔۔۔ واضح ہو کہ اس رباعی میں از اول تا آخر شدید قسم کا طنز پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ انگریز بھی رزاقی کے قانون سے بخوبی آگاہ ہے۔ چنانچہ دیکھ لو! ایک شخص کی جاگیر ضبط کر کے اُسے نانِ شبینہ سے محتاج کر دیتا ہے اور دوسرے شخص کو جاگیر عطا کر کے "نواب" بنا دیتا ہے۔ نیز، شیطان صفت انسانوں کو اس انداز سے روزی پہنچاتا ہے (ہزاروں ایکڑ زمین مفت دیدیتا ہے) کہ یزداں پرست حیران رہ جاتے ہیں؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ انگریز، اللہ کے بندوں پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ اور شیطان کے بندوں پر انعام و اکرام کی بارش کرتا ہے؛

دوسری رباعی نمبر ۲۰۹

واضح ہو کہ اس رباعی میں بھی طنز کا رنگ پایا جاتا ہے۔

حل لغات: — چہ حاجت طول دادن الخ یعنی اس داستان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس مصرعہ میں لفظ "داستان" بہت بلیغ ہے۔ داستان سے مراد ہے، اقوام مغرب کی گذشتہ ۳۰۰ سالہ داستان۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ اقوام یورپ نے سترہویں صدی کے آغاز سے ایشیائی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کئے۔ بالفاظ دگر، تاجروں کا بھیس بدل کر مشرقی ممالک میں آمد و رفت شروع کی۔ چنانچہ ہندوستان جنت نشان میں ان اقوام نے جہانگیر کے عہد میں "سوداگری" کا سلسلہ شروع کیا تھا اور ۱۶۱۴ء میں تجارتی کاروبار کے لئے سورت میں لب دریائے تاپتی ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کی تھی؛ یہ ہندوستان میں انگریزوں کی پہلی "فیکٹری" تھی؛ بحرفے گویم اسرار نہاں الخ یعنی میں تمام پوشیدہ حقائق ایک جملہ میں بیان کرسکتا ہوں؛ جہان خویش با سوداگراں داد یعنی خدا نے اپنا جہان حکمرانوں کے بجائے "سوداگروں" کو بخشدیا۔ سوداگراں سے خصوصاً انگریز، ڈچ اور پرتگالی قومیں مراد ہیں، اور اگر ہندوستان کو مدِ نظر رکھیں تو صرف انگریز مراد ہیں۔ کیونکہ کارکنانِ قضا و قدر نے یہ ملک بلاشبہ انگریزوں کو بلا قیمت، بالکل مفت، عطا کردیا۔ چنانچہ تاریخ ہند کے مطالعہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوسکتی ہے؛ چہ داند لامکان قدر مکاں را۔ یہ چوتھا مصرعہ اس رباعی کی جان ہے۔ اور اس میں سارا لطف، مکان اور لامکان کے تقابل میں مضمر ہے۔ چونکہ لامکان میں ایہام واقع ہوگیا ہے اس لئے مصرعہ میں غضب کی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

(۱) لامکاں چونکہ مکاں کی نقیض ہے، اس لئے یہ مصرعہ منطق کی کسوٹی پر بھی پورا اُتر سکتا ہے، یعنی اقبالؔ نے اپنا دعویٰ منطقی طور سے ثابت کر دیا۔ اسی میں شک بھی کیا ہے کہ لامکان، یعنی وہ جو مکاں نہ ہو، مکان کی قدر کیا پہچان سکتا ہے؟

(۲) اگر لامکاں کو مجازِ مرسل قرار دیا جائے تو اس سے خدا مراد ہوگی یعنی خدا نے دُنیا کی کوئی قدر نہ پہچانی کہ اُسے حکمرانوں کے بجائے، سوداگروں کے حوالہ کر دیا۔

(یہ محض شاعرانہ انداز بیان ہے) ؛

بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا کے کاموں میں کون دم مار سکتا ہے؟ وہی بہتر جانتا ہے کہ اُس نے مشرقی ممالک کو ان مغربی اقوام کے زیر نگیں کیوں کر دیا۔ جو محض تاجروں کی حیثیت سے ان ممالک میں آئی تھیں۔

مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ نیرنگیٔ روزگار پر تعجب کرتے ہیں کہ خدا کے کام بھی عجیب و غریب ہیں! جو قوم سترہویں صدی میں تجارت کے لئے آئی تھی، انیسویں صدی میں سارے ملک پر حکمران ہو گئی ۱۲۔

پہلی رباعی نمبر ۲۱

مطلب:۔ اس رباعی میں بھی طنز کا رنگ پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ بہشت کی تین قسمیں ہیں :۔

ایک بہشت تو اُن لوگوں کے لئے ہے جو دن رات نماز اور یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، یعنی پاکانِ حرم۔

دوسری بہشت اُن لوگوں کے لئے ہے جو دن رات جہاد میں مصروف رہتے ہیں، یعنی ارباب ہمم۔

چونکہ ہندی مسلمان نہ پہلی جماعت میں داخل ہو سکتے ہیں نہ دوسری میں،

اس لئے اقبالؔ نے ان کی تسلی کے لئے بہشت کی تیسری قسم ایجاد کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے ہندی مسلمانو! تم مایوس مت ہو۔ ایک بہشت "فی سبیل اللہ" بھی تو ملتی ہے۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ تمہارے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔
"فی سبیل اللہ" میں صنعتِ ایہام ہے۔ جس کی وجہ سے مصرعہ میں بلا کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے، اس کے لغوی معنیٰ ہیں وہ بہشت جو اللہ کی راہ میں مل سکے، یعنی اللہ کی راہ میں جد و جہد کرنے سے۔ لیکن عرفِ عام میں "فی سبیل اللہ" اُس شئی کو کہتے ہیں جو مفت مل جائے، بغیر کوشش کے۔
بنیادی تصوّر:۔ چونکہ ہندی مسلمان جد و جہد سے نفور اور جہاد سے کوسوں دُور ہیں، اس لئے اقبالؔ نے اُنہیں تسلّی دی ہے کہ رنجیدہ کیوں ہوتے ہو، قیامت کے دن اللہ کی خدمت میں ایک "سپاس نامہ" پیش کر کے، اس میں حمد و ثنا کے بعد بہشت کی درخواست کر دینا۔ انشاء اللہ "فی سبیل اللہ" مل جائے گی۔

دوسری رباعی بر ص ۲۱

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ قلندر ہمیشہ مختصر گفتگو کرتا ہے، چونکہ مجھ میں بھی یہی رنگ پایا جاتا ہے، اس لئے میں بھی اپنے تمام فلسفیانہ افکار کا خلاصہ ایک شعر میں بیان کئے دیتا ہوں اور وہ خلاصہ میری رائے میں قوم کے حق میں بمنزلہ اکسیر ہے۔
اے مسلمانو! اُس کھیتی سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔
جس کو تم حضرت شبّیر رضی اللہ عنہ کے خون سے سیراب نہ کرو۔
بنیادی تصوّر:۔ اے مسلمانو! جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر تم کسی قسم

کی ترقی نہیں کر سکتے ؛

نوٹ:۔ اس آخری رباعی میں اقبال نے دراصل قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ جہاں تک میں اللہ تعالیٰ کے اس مقدس اور مکرم کلام کو سمجھ سکا ہوں، وہ یہی ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرتی ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج یہ سب جہاد ہی کی ابتدائی منزلیں ہیں۔ قرآن کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہر مسلمان مجاہد بن جائے، جسے شک ہو وہ حاملِ قرآن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی کا مطالعہ کر لے ۱۲ ؛

ختم شد

محمد یعقوب پرنٹر و پبلشر نے لاہور آرٹ پریس انار کلی لاہور میں چھپوا کر
عشرت پبلشنگ ہاؤس سے شائع کیا